جدید اردو ادب کے لیے

سطور

سال میں چار جلدیں

جلد: ۷

ستمبر۔نومبر ۱۹۷۸ء

قیمت:

فی جلد: ۳ روپے

سالانہ: ۱۲ روپے

دور ثانی

مدیر: رزاق ارشد

مدیر انتظامیہ

تابش دہلوی

قمر الحسن زیدی

ترتیب:

کمار پاشی

سطور پرکاشن، ۱/۷، ۳۳، دہلی گیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ سطور پرکاشن ۱/۷، ۳۳، دہلی گیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اگلے صفحات میں

پرنٹر، پبلشر: سطور پرکاشن کاتب: محمد طاہر طباعت: نعمانی پریس، دہلی ۶

وارث علوی

شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد

تعلیم اور کلچر دو ایسے موضوعات ہیں جن پر ہر وہ شخص خیال آرائی کر سکتا ہے جس کے پاس آرائش کے لیے کوئی خیال نہ ہو، کیونکہ یہ موضوعات لالے کی طرح اپنی حنا بندی خود کرتے ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ تعلیمی اداروں کے سالانہ جلسوں اور کلچرل پروگراموں میں عموماً صدر الصدور سیاسی لیڈر، وزیر، پولیس کمشنر، بیرسٹر، ریٹائرڈ جج، اور بیمہ کمپنی کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔ یہ اکابر ہستیاں اپنی تقریر کا آغاز ان خوشگوار یادوں سے کرتی ہیں جب کہ وہ بھی طالب علم تھے۔ تقریر کا اختتام قوم کے نونہالوں کو ان جیسے ہی تناور پیڑ بنانے پر ہوتا ہے۔ وہ مفلوک الحال مدرس جو پھٹے کوٹ پر مستعار ٹائی باندھے ہال کے دروازوں پر رضوان کے فرائض انجام دے رہے ہوتے ہیں ان تقریروں کو سنتے ہیں اور تہیہ کرتے ہیں کہ جواب مضمون کی وہ تمام کاپیاں کل شام تک جانچ ڈالیں گے جو سٹاف روم کے لاکر میں مہینوں سے دھول پھانک رہی ہیں، اور کپڑے کے وہ بیوپاری جنھوں نے مدرسہ کو چندہ دینے میں بخل سے کام لیا تھا فیصلہ کرتے ہیں کہ آئندہ بقرعید کو بکرے کی کھال بھی بیت المال کی بجائے مدرسہ ہی کو عنایت کریں گے۔ معزز مقررین کو چونکہ تقریروں کے علاوہ اور بھی بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں اس لیے وہ تقریر کے لیے ایسے موضوعات پسند کرتے ہیں جن پر کچھ نہ کہتے ہوئے سب کچھ کہنے کے آرٹ کے جوہر دکھائے جا سکیں۔ تقریر کی تیغ جوہر دار کے لیے تعلیم اور کلچر کا موضوع اس خربوزے کی مثال ہے جسے ہر صورت کٹنا ہے چاہے تیغ خربوزے پہ گرے یا خربوزہ تیغ پہ۔ جہاں تک طالب علموں کا تعلق ہے وہ ان اکابر کی شخصیتوں کو دیکھ کر ہی فیصلہ کر لیتے ہیں کہ انھیں مستقبل میں کیا بننا ہے۔ تاریخ اور گرامر کا استاد بننے کا کام وہ مسجد کے پیش امام اور حافظ

بی اے کے لونڈوں کے سپرد کر کے خود اس چکلہ اور مولے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں جن میں
مہمان خصوصی تشریف لائے تھے اور جس کا دروازہ کھولنے ہیڈ ماسٹر کچھ اس طرح
جھپٹے تھے جس طرح دولہا سے شریعت عورتی کے کلیادن روپے وصول کرنے کے لیے
دلہن کے بھائی گھوڑے کی لگام تھامنے دوڑ آتے ہیں۔

ایک نظر ہماری اکیڈمک لینڈ سکیپ پر ڈالیے۔ رحم کھانے کے لیے ہمارے
پاس اب وہ بچے تو رہے نہیں جو مثلاً سرمایہ داری کے آغاز کے زمانہ میں یورپ کی
معدنیات کی کانوں میں کام کرتے تھے۔ لہذا ہم جیسے کریم النفس لوگ جو اپنی انسان
دوستی کا احسن و توصل رحمدلی کی معنوی تغذیہ سے پروان چڑھانے کے عادی ہیں، ان
سکولوں کی سیر کیا کرتے ہیں جو پُر رونق مندروں اور مسجدوں اور بنگلوں اور سینما
گھروں کے پہلو میں سرد تاریک ویران اندھیرے گھروں کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ گندے
مرکھنے بچوں سے لبالب بھری ہوئی کلاس کی نمناک دیواریں اس استاد کو چشم عبرت
سے دیکھتی ہیں جو دستخط تو تین سو روپے کی رسید پر کرتا ہے لیکن جسے تنخواہ صرف پچھتر
روپے ملتی ہے۔ اس بے ایمانی پر غصہ اس وجہ سے نہیں آتا کہ ہم نے ہر چیز کو برداشت
کرنے، کسی بات پر غصہ نہ ہونے، مفاہمت، رضا بہ قضا، چلتی کا نام گاڑی، دنیا ہے
اسی کا نام میاں قسم کے اخلاق حسنہ سے اپنی مرنج و مرنجاں ذات کو کچھ ایسا نکھارا
اور سنوار لیا ہے کہ ہمیں ان لوگوں تک پر غصہ نہیں آتا جو مثلاً قحط زدہ علاقوں کا وہ
اناج جو دوسرے ممالک بھوکوں کے لیے بھیجتے ہیں اسے کالے بازار میں بیچ دیتے ہیں
یا جو مثلاً ان کمبلوں کو جو فساد زدہ لوگوں کے لیے باہر سے آتے ہیں دیسی کمبلوں سے
بدل دیتے ہیں کہ فساد میں لوگ تو غارت ہوئے سو ہوئے اب خواہ مخواہ فورین
کا مال کیوں غارت کیا جائے۔ اگر آپ نے بنارس کے گھاٹ پر مردوں کو جلتے دیکھا
ہو گا تو ان لوگوں کو بھی دیکھا ہو گا جو پانی میں کھڑے چتا کی راکھ میں سونے چاندی
اور سکوں کو ڈھونڈا کرتے ہیں۔ چتا پر روٹی سینکنا ہمارے قومی کردار کی ایک
صفت ہے۔ ہم اس گراف والے رنگ کو برداشت کر لیتے ہیں جو شیر خوار بچوں کے
دودھ کو [illegible] اور جو صاحب ہے تو [illegible] سے جیب اور
جعل سازوں کی خرید و فروخت کے گول مال کو کیوں بیٹھا دیکھیں گے

سب کاروبار ہے اور دنیا یونہی چلتی ہے یہاں۔

تو سکول بھی یونہی چلتے ہیں اور کالج بھی، اور یونیورسٹیاں بھی سب دھندا ہی دھندا ہے۔ ہر چیز کا بیوپار کاروباری۔ اب تماشہ یہ دیکھیے کہ آزادی ملتے ہی جہاں دوسروں نے یہ فیصلہ کیا وہیں ہم نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ اب اردو یہاں نہیں چلے گی اور تھے جنھوں نے فیصلہ کیا کہ اب انگریزی بھی یہاں نہیں چلے۔ ایک پوری نسل تباہ ہو گئی تو دوبارہ فیصلہ ہوا کہ انگریزی کو چلنا چاہیے۔ انگریزی ابھی چل بھی نہیں پائی تھی کہ کالجوں ہی نے چلنے سے انکار کر دیا۔ طالب علموں کی ہڑتالیں، پروفیسروں کے دھرنے، سکول ٹیچروں کے فاقے، کورٹ میں ریٹ، اسمبلی میں بل، اسٹیج پر دنگے، امتحانوں میں چوریاں، سپروائزروں پر حملے، ممتحنوں کی رشوت ستانیاں، پرچوں کا آؤٹ ہونا، گائیڈوں اور کوچنگ کلاسوں کی گرم بازاری ——— ہم کر بھی کیا سکتے تھے سوائے کمیشن بٹھانے کے، سو بٹھائے۔ کمیشن کی رپورٹوں کا یہ عالم ہے کہ وہ جو انھیں پڑھنے پر کمربستہ ہوتا ہے دنیا سے سنیاس لیتا نظر آتا ہے۔ لہٰذا کوئی نہیں پڑھتا۔ جسے دیکھو وہ ردی کا وہی مصرع پڑھتا نظر آتا ہے کہ تعمیر کے لیے تخریب ضروری ہے۔ چنانچہ تخریب کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے اور تعمیر کا کام پلاننگ کمیشن کو سونپا جاتا ہے جو اپنی رپورٹ تیار کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔

چونکہ طبعاً ہم ذہنی عیاشی کی طرف مائل رہے ہیں اس لیے ایک چیز جس سے ہم پہلوتہی کرتے رہے ہیں وہ ہے رپورٹوں کا پڑھنا۔ چاہے یہ رپورٹ ان سیمیناروں ہی کی کیوں نہ ہو جن میں ہم نے شرکت کی ہے اور ہمارا نام رپورٹ میں ادھر ادھر دمکتا نظر آ جائے۔ بہرحال کمیشن بٹھائے جاتے ہیں، رپورٹیں تیار ہوتی ہیں، وائس چانسلر اور رجسٹرار بڑا بھاری خرچ کر کے دنیا جہان کے وائس چانسلروں اور رجسٹراروں سے تبادلۂ خیالات کر آتے ہیں، لیکن مسئلہ جہاں تھا وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ وہی ہڑتالیں وہی دھرنے، وہی بے چینی۔ لوگوں کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ بگاڑ کہاں ہے۔ جب مسئلہ بہت الجھ جائے اور ماہرین تک بغلیں جھانکنے لگیں تو سالانہ جلسوں میں کرسیٔ صدارت سے ہار پھول فروشوں اور بیرہ کھانوں کے ہنگاموں کی ان تقریروں پر جو چراغ پا ہونے سے کیا فائدہ جن میں تعلیم کیا ہے، تعلیم کا مقصد کیا ہے، تعلیم کے لیے قوم کو کیا کرنا چاہیے

سوالات کے دو ٹوک جوابات ڈنکے کی چوٹ پر دیے جاتے ہیں۔

بہرحال جب سوال بہت الجھا ہوا ہوتا ہے تو ہمارا تو ایک ہی طریقہ ہے ہمارے پیر و مرشد ایلیٹ صاحب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سو تعلیم کے سلسلہ میں بھی ہم ان کی طرف رجوع ہوئے۔ لیکن تعلیم کا مسئلہ ہی کچھ ایسا ہے کہ اچھے اچھوں کی مٹی پلید کرتا ہے۔ پیر و مرشد کا یہ عالم دیکھا کہ اس سوال کا جواب کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے وہ دوسرے ہی سوال میں تلاش کر رہے ہیں کہ اس کائنات میں انسان کا مقصد کیا ہے۔ گویا ہمارا یہ مسئلہ کہ سکول صاف ستھرے کشادہ اور خوبصورت ہوں، لیبارٹری، چارٹ، نقشے، اور کتب سے مالا مال ہوں، طلبا کی کتابیں سستی ملا کریں اور اساتذہ کی تنخواہ درست ہو اور وہ مالی تنگی میں نہ ہوں، مختصر یہ کہ ہماری تعلیم کے فوری مسائل جو بنیادی طور پر اقتصادی ہیں ان کا کوئی جواب ہمیں کیا ملتا۔ ایلیٹ صاحب ہمیں مابعد الطبیعیات میں الجھانے لگے۔ مزید غور کیا تو معلوم ہوا کہ ایلیٹ صاحب کے سامنے مغرب کا تعلیمی نظام تھا جہاں تعلیم کے اقتصادی مسائل بڑی حد تک حل ہو گئے ہیں لیکن نئے معاشرے میں تعلیمی مسائل ابھر آئے ہیں۔ کچھ اور لوگوں کو پڑھا تو پتہ چلا کہ مغرب میں تعلیمی ادارے فی الحقیقت ایک ایسی پیچیدہ تنظیم میں بدل گئے ہیں کہ اساتذہ اور طلبا کا زیادہ وقت تنظیم کو برقرار رکھنے اور انجام کار اسے پیچیدہ تر بنانے میں صرف ہوتا ہے اور اس فتنے نے سب کو ایسا گھیرا ہے کہ طالب علم اور استاد کا وہ براہ راست رشتہ جس کے بغیر علم کی لین دین کا کام مجھ جیسے دقیانوس لوگوں کو آج بھی محال نظر آتا ہے ختم ہو گیا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن نے اپنے تعلیمی پروگراموں کے ذریعہ تعلیم کو غیر شخصی بنانے میں اپنا عطیہ بھی پیش کیا۔ مغرب کی تعلیمی بے چینی کا بڑا سبب تعلیمی اداروں کی سخت تنظیم کا نتیجہ یہی غیر شخصی پن ہے۔ اساتذہ اور طلبا دونوں تنظیم کی بھول بھلیوں میں ایسے کھو گئے ہیں کہ مڈبھیڑ ہی نہیں ہو پاتی۔ ہر چیز اپنی جگہ درست ہے لیکن علم کا رومانس ختم ہو گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ امریکہ جس طرح دنیا کی دولت کو اپنے ملک میں کھینچ لینا چاہتا ہے، دنیا بھر کے علوم کو بھی اپنے یونیورسٹی کیمپس میں سمیٹنے پر تلا ہوا ہے۔ دنیا کی وہ کونسی زبان ہے جو وہاں پڑھائی نہیں جاتی اور کونسا سنگیت ہے جسے وہاں سکھایا نہیں جاتا۔ طالب علم کو دنیا جہان کے علوم

کی نعمتوں سے مالا مال کرنا، وہاں کے تعلیمی اداروں کا نصب العین رہا ہے۔ علم کا پھیلاؤ امریکہ میں کچھ ایسے دھماکے سے ہوا ہے کہ آدمی کوشش کے باوجود جاہل نہیں رہ سکتا چھپے ہوئے لفظ کی یلغار کا یہ عالم ہے کہ آدمی دریائے علم میں بے دست و پا بہتا نظر آتا ہے؟ اگر یاجوج ماجوج کی کوئی حقیقت ہے تو وہ امریکی ہیں۔ امریکی دنیا کی فراخ ترین قوم ہے دنیا بھر کے پیٹرول اور تیل کا ایک تہائی حصہ صرف امریکی خرچ کرتے ہیں۔ یہی عالم اخباروں رسالوں اور کتابوں کا ہے۔ دنیا بھر کے کلاسیک تو بچے ہائی اسکول میں ہی ریڈیو، ٹیلی ویژن، کامک، اور ڈائجسٹ کی شکل میں ختم کر دیتے ہیں۔ ان کمالات کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اور آکسفورڈ کے ایک پریسیڈنٹ صاحب نے ایک امریکی یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے موقع پر بہت تعریف بھی کی۔ لیکن جیسی کہ انگریزوں کی عادت ہے کہ وہ دوڑ میں شامل تو ہو جاتے ہیں لیکن تھوڑی دور دوڑنے کے بعد رک کر یہ سوال ضرور کرتے ہیں کہ وہ کیوں دوڑ رہے ہیں۔ آنجناب نے بھی اپنی تقریر میں یہ سوال کیا کہ اتنا علم کس لیے۔ کیا علم کا بھی یوفوریا ہو سکتا ہے؟ کیا ضرورت سے زیادہ تعلیم بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ کیا زندگی صرف علم سمیٹنے کے لیے ہی ہے جب ذہن بے کراں علم کے بار تلے دبا ہوا ہو تو کیا وہ دنیا میں دوسرے بہت سے کاموں کا اہل رہتا ہے۔ کیا علم کا سیلاب آدمی کے ذوق تجسس، اور اس کے جذبۂ حیرت کے لیے مضر ثابت نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے لیے تیاری کا عمل جب بہت ہی پیچیدہ اور طویل عرصہ پر پھیلا ہوا ہو تو آدمی کی پوری زندگی تیاری میں ہی صرف ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کے رومانس سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ امریکہ میں نوجوان سکول، کالج اور یونیورسٹی سے نکل کر ہپی سادھو اور جہاں گرد کیوں بنے دوسری بھی بہت سی وجوہات تھیں لیکن بڑی وجہ تو یہ کہ وہ جینا چاہتے تھے۔ دانشوری اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن حواس کی بھی ایک اپنی کائنات ہے۔ روح کے بھی کچھ مطالبے ہیں، جسم کی بھی کچھ مانگیں ہیں۔ امریکنوں کی دھما چوکڑی پر ہم چیں بہ جبیں تو بہت ہوتے ہیں لیکن ہمیں سوچنا چاہیے کہ وہ ان تمام مرحلوں کے صبر آزما تجربات سے گزر گئے ہیں جن سے ہمارے مادہ پرست تمدن کو گزرنا ہے۔ ہم پس ماندہ ہیں لیکن اپنی اسی راہ پر جس پر یہ لوگ بہت آگے نکلے ہوئے یا حدود تجاوز کیے ہوئے نظر آتے

ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے یہ سمجھنا محض خود فریبی ہے کہ چلو بہت سخت اقدار تعلیمی ہاں اور
سے بھی کوئی تعلیمی مسائل حل نہیں ہوتے۔ خوش حالی کے اپنے مسائل ہوتے ہیں لیکن
مفلوک الحال لوگوں کو ان مسائل پر نظر رکھ کر اپنی مفلوک الحالی پر قانع نہیں ہو جانا
چاہیے بلکہ ان کی نظر ان مسائل پر ہونی چاہیے جو مفلوک الحالی کے پیدا کردہ ہیں۔ آپ
مغرب کی جنسی آزادی کو ناپسند کر سکتے ہیں لیکن اسے پردہ سسٹم کی خرابیوں کی
پردہ پوشی کے لیے بطور جواز کے استعمال نہیں کر سکتے۔ بہت کھانا صحت کے لیے
مضر ہے لیکن کم خوراکی کی تلقین قحط زدہ علاقہ میں محض تمسخر ہے۔ جس ملک میں
پروفیسروں کے پاس کتابیں خریدنے کی اتنی استعداد بھی نہیں ہوتی جتنی کہ امریکہ
کے بچے خرید لیتے ہیں۔ وہاں علم کے پھاڑ کے بھلا کیا معنی ہو سکتے ہیں۔

اب آپ نے دیکھا کہ پارچہ فروشوں اور بیمہ کمپنی کے ایجنٹوں کی بات دہلی اور
آکسفورڈ کے پریسیڈنٹ اور ایلیٹ صاحب کی طرف رجوع ہوئے تو ہاتھ کیا آیا۔
مجھے اس کا تو پتہ نہیں کہ ایلیٹ کو اپنے سوال کا جواب ملا یا نہیں البتہ اتنا ضرور جانتا
ہوں کہ ایلیٹ نے اپنی تلاش کے دوران اس تضاد اور ثنویت کو ضرور بے نقاب
کیا ہے جس کا شکار عموماً وہ لوگ رہے ہیں جو تعلیم کے مسئلہ کو انسان کے مسئلہ سے
الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ ایک ماہرِ تعلیم تو اتنے بگڑے کہ انھوں نے اعلان کر دیا کہ
ایلیٹ کو جدید زمانہ کے تقاضوں سے واقفیت ہی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ
ایلیٹ کو جدید زمانہ کے تقاضوں سے واقفیت تو اتنی ہی نہیں جو مثلاً ہیڈ ماسٹرس
ایسوسی ایشن کے صدر کو ہوتی ہے۔ لیکن ایلیٹ کو جدید زمانہ کی اتنی شد بد ضرور
تھی کہ تعلیم اور کلچر کے مسئلہ پر غور کرتے وقت وہ چند ایسی قدروں پر اصرار کرے جنھیں
اگر ملحوظ خاطر رکھا گیا (اور ظاہر ہے نہیں رکھا گیا) تو تعلیم اور کلچر کی دنیا میں سوائے
فراغ کے کچھ ہاتھ نہیں لگے گا (اور جیسا کہ ظاہر ہے سوائے فراغ کے کچھ ہاتھ نہیں آیا)
ایلیٹ کے یہاں عیسائیت اور طبقاتی معاشرہ کا جو تصور رہا ہے اس کی اب وہ
اہمیت نہیں رہی۔ جو چند سال ادھر تھی اور بدلے ہوئے حالات میں ایلیٹ کے
یہ تصورات اپنی RELEVANCY کھو چکے ہیں لیکن ان تصورات کی روشنی میں
اس نے تعلیم اور کلچر کے مسئلہ کا جو تجزیہ کیا ہے اسے نظر انداز کر کے ان مسائل پر

معنی خیز گفتگو کی توقع عبث ہے۔

اب انسان کا مسئلہ لیجیے۔ ہمارے یہاں انسان کا مسئلہ بڑھتی ہوئی آبادی
یعنی غیر ضروری انسانوں کا مسئلہ ہے۔ بچے اتنی تعداد میں پیدا ہو رہے ہیں کہ ان کے
لیے مناسب تعلیم کا انتظام دشوار ہی نہیں نا ممکن بن گیا ہے۔ آبادی جب کثیر ہو تو
جہد البقا کا قانون اپنا کام کرنے لگتا ہے۔ نفسیاتی طور پر آدمی اپنی ذات میں سمٹ
جاتا ہے۔ عام معاشرے کا نہیں بلکہ معاشرے میں اپنی ذات کی بقا کا خیال کرتا ہے۔
ہمدردی خود غرضی کی ضد ہے کیونکہ وہ آدمی کو اپنی ذات سے باہر نکال کر دوسروں کے
درد میں شریک کرتی ہے۔ لیکن اناج کم ہو اور کھانے والے زیادہ ہوں تو بقائے حیات
کی جبلت ہمدردی کے جذبہ پر غالب آتی ہے۔ غربت و افلاس کی سب سے بڑی
لعنت یہی ہے کہ وہ اخلاقی آدمی کو مار کر صرف حیاتیاتی آدمی کو جینے پر مجبور کرتی ہے
اور حیاتیاتی سطح پر آدمی کو تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں۔ لہٰذا پس ماندہ ملکوں کے طبقاتی
سماج میں صرف خوش حال طبقہ کے بچوں کو اچھی تعلیم مل سکتی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ طبقہ
سرمایہ کے ساتھ ساتھ بیوروکریسی کی صورت میں عام ان پڑھ لوگوں کے طبقہ کا استحصال
کرتا ہے۔ اگر تعلیم یافتہ طبقہ خوش حال طبقہ سے نہ بھی آئے اور سماج کے مختلف طبقوں
کے تعلیم یافتہ افراد سے ترکیب پائے تب بھی آج کے صنعتی سماج میں ٹکنولوجی سے
واقفیت رکھنے والا یہ طبقہ اقلیت ہی میں ہوگا کیونکہ ٹکنولوجی کم سے کم آدمیوں کے ذریعہ
زیادہ سے زیادہ مشینوں کو کنٹرول کرتی ہے۔ گویا ناخواندہ مفلوک الحال اکثریت کے
بے پناہ جنگل میں تعلیم یافتہ اقلیت ہمیشہ خود کو غیر محفوظ محسوس کرے گی۔ آج کا صنعتی
سماج اس تعلیم یافتہ اقلیت کے بغیر چل نہیں سکتا اور اگر مفلوک الحال طبقہ اس اقلیت
کو ختم کر دے تو اس کے ہاتھ بھی سوائے نراج اور تباہی کے کچھ نہ آئے کیونکہ ٹکنولوجی
کے بغیر آج کے آدمی کی حیاتیاتی بقا تک ممکن نہیں۔ اگر بجلی فیل ہو، پانی نہ ملے، اناج
کی آمد و رفت رک جائے، اسپتال اور آپریشن تھیٹر بند ہو، دوائیں عنقا، اور گندگی اور
کوڑا کرکٹ عام ہو جائے تو آدمی بچ تک نہیں سکتا۔ ان تمام چیزوں کے بغیر آدمی دورِ
وحشت میں جی سکتا تھا لیکن اب دورِ وحشت میں رجعت ممکن نہیں اور بڑے
متمدن شہروں میں وہ ایک متمدن آدمی کے طور پر ہی جی سکتا ہے۔ اعلیٰ ترین تعلیم

منتخب لوگوں کے لیے بھی ہوتی ہے لیکن یہ منتخب لوگ اپنی تعلیم کا فائدہ عام لوگوں
تک نہیں پہنچا سکتے تو پھر جونک کی طرح چپٹے ہیں اور اپنے طبقہ اور پورے سماج کے
بیچ ایک ایسا تضاد قائم رکھتے ہیں کہ جو دونوں کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ تعلیم کا مسئلہ اس وقت تک طے نہیں ہو سکتا جب تک ہم یہ فیصلہ نہ کریں کہ ہم
کیسا سماج چاہتے ہیں اور اس سماج کے لیے ہمیں کس قسم کے لوگوں کو تیار کرنا ہے۔
ہمارے سماج کے سامنے ایسا کوئی نصب العین نہیں ہے اور یہی سبب ہے تمام تر
اصلاحوں کے باوجود ہمارا تعلیمی نظام انہی بنیادوں پر قائم ہے جو انگلستان میں پادری
اور تعلیم یافتہ اشرافیہ طبقہ پیدا کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ ہم اپنا سماجی نصب
العین طے نہیں کر پائے۔ کبھی زرعی تمدن کی بات کرتے ہیں کبھی صنعتی تمدن کی۔ اور
اشتراکیت کے ساتھ تو ہماری سیاست نے ایسا کھیل کھیلا ہے کہ یہ لفظ اب سیاست کے
کام کا بھی نہیں رہا۔ توہمات اور مذہبی عقائد کی اندھی پیروی کا دور دورہ ہے۔ ریڈیکلزم
اب تو سیاست میں بھی نظر نہیں آتا، سماج کا تو ذکر ہی کیا۔ اسی غلط کی نشانیاں مکمل
ہیں۔ اسی لیے لوگ انقلاب کی نہیں اصلاح کی باتیں کرتے ہیں۔ صالح اور صحت
مند کے الفاظ زبان زد عام ہیں۔ برہم زن کی زمین میں کوئی شعر نہیں کہتا۔ نتیجہ میں پھر
نہی اصلاحی سہارے ملتے ہیں جو کوئی اصلاح نہیں کر پاتے۔ آج سے چند سال قبل تو ہم
نہایت تمرد کے ساتھ کہتے تھے کہ سرے سے سماج اور اداروں کی اصلاح کوئی معنی نہیں
رکھتی۔ برہم زن۔ لیکن کیا خاک برہم زن۔ ادھر ماؤزے تنگ نے زبردست انقلابی
اقدامات لیے۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے چار سال کے لیے بند کر دیے، لیکن ہاتھ کچھ بھی نہ
آیا۔ تالابندی اٹھانی پڑی۔ ڈاکٹروں کو زبردستی دور دراز کے دیہاتوں میں بھیجا تو ڈاکٹر
لوگ اتنے گھبرائے کہ بھاگ کھڑے ہوئے اور شہروں میں روپوش ہو کر نہایت اسفل
پیشے اختیار کیے۔ ہکسلے نے تو کہا تھا کہ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ سب سے زیادہ
خود غرض اور ناکارہ طبقہ ہے۔ گاندھی جی کی بھی لگ بھگ یہی رائے تھی۔ لیکن اس طبقہ
کو ایثار نفس بنانے کے لیے نہ تو ماؤزے تنگ کا ڈنڈا کارگر ثابت ہوا نہ گاندھی جی کا چرخا
دولت مندوں کے بعد سماج میں پڑھے لکھوں اور ٹکنوکریٹ کی اجارہ داری قائم
نہ ہو یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔ خصوصاً ہندوستان کا تو بہت ہی شدید مسئلہ کیوں کہ

ذاتوں جاتیوں اور چھوت چھات والے دیس میں جہاں بھی آدمی کو دوسرے آدمی پر ذرا سا بھی تفوق حاصل ہوا تو وہ خود کو سلطان ابن سلطان سمجھنے لگتا ہے۔ ہمارے یہاں عزت نفس کا تو اتنا زبردست فقدان ہے کہ اجلی دھوتی والا آدمی پیوند لگی دھوتی والے آدمی کو بھگوان کہہ کر پکارتا ہے۔ دیہاتی زندگی پر ہماری ملکی زبانوں کے افسانے دیکھیے۔ غریب کسانوں کا خون زمیندار اور بنیا چوستا ہے اور ہڈیاں نوکر شاہی چھوڑتی ہے۔ زمیندار کی بیگار کرنا، بنیے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بات کرنا، ہوالدار کے پیر دابنا، پٹواری کی گھرکیاں سننا، ڈپٹی کلکٹر کے سامنے تھرتھر کانپنا، ہیڈ کلرک کی جوتیاں سیدھی کرنا، کلرک کی ہتھیلی گرم کرنا، چپراسی کے قدموں میں بچھے جانا ہمارے ادب اور ہماری زندگی کے STOCK-BEHAVIOUR ہیں۔ وہ آدمی جو غریب ہے، وہ جو پڑھا لکھا نہیں ہے، جو معمولی اور ادنیٰ کام کرتا ہے اس سے ہم عزت نفس اور انسانی برابری کی سطح پر سلوک کر ہی نہیں پاتے۔ ہماری تعلیم نے تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی ایک استحصالی طبقہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ سماج اتنا پیچیدہ ہو گیا ہے کہ تعلیم یافتہ اور ہنرمند طبقہ کے بغیر اسے چلانا ممکن نہیں۔ ٹکنوکریٹ کا طبقہ اپنی اس طاقت سے واقف ہے۔ چنانچہ پرولتاریہ تو کبھار ہڑتالیں کرتے۔ اب تو سفید کالر والے افسران اپنی فربہ تنخواہوں کو فربہ تر بنانے کے لیے مظاہروں، گھیراؤں اور ہڑتالوں پر اتر آئے ہیں۔ طبقاتی سماج میں تعلیم بھی آدمی کو شستہ، شائستہ اور دردمند بنانے کی بجائے اسے تندخو، خود غرض اور استحصالی بنا کر رکھ دیتی ہے۔ وہ مالک جو اپنے نوکروں کو گالیاں نہیں دیتا، وہ ڈاکٹر جو ہمدرد ہے، وہ افسر جو خدمت گزار ہے' قابلِ صد احترام ہے کہ وہ اچھا انسان ہے۔

اچھا انسان اگر کالج کی تعلیم ہی سے پیدا ہوتا تو کالو بھنگی، بابو گوپی ناتھ اور عصمت کی "ساس" سب گریجویٹ ہوتے۔ صاف بات ہے انسانیت کی تلاش میں فنکار کے سرو کار کچھ دوسرے ہی ہوتے ہیں۔ اس کی اخلاقیات پرنسپل کے کیریکٹر سرٹیفکٹ سے مختلف نوع کی ہی ہوتی ہے۔

ہم جمہوری اور صنعتی معاشرے میں رہ رہے ہیں۔ صاف بات ہے کہ تعلیم کسی ایک طبقہ یا فطانت اور ذہانت میں برگزیدہ لوگوں کے ایک حلقہ تک محدود

نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ تعلیم کے وہ تصورات جو صرف اشرافیہ طبقہ کی تہذیب کی دین تھے ہمارے بہت کام نہیں آ سکتے۔ اسی لیے لاک اور روسو کے تعلیمی تصورات جو عہد وسطیٰ کی تعلیمی روایت کے خلاف بغاوت تھے۔ وہ بھی ہمارے زمانہ کے پیچیدہ مسائل کا حل پیش نہیں کرتے کیونکہ ان کا پیش کردہ تعلیمی نظام بھی اشرافیہ طبقہ کے اردگرد ہی گھومتا ہے۔ یہ تو ایک حقیقت ہے کہ پیچیدہ معاشرے میں تعلیم کا ایک مقصد نہیں ہوتا بلکہ اس سے بیک وقت مختلف مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور چاہے یہ بات ہمیں ناپسند ہو لیکن اس سے نجات بھی ممکن نہیں۔ چنانچہ لبرل تعلیم، سائنسی تعلیم، اور ٹکنولوجیکل تعلیم تینوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنے کا نتیجہ سماج کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے یہی نہیں بلکہ تینوں کو جس طرح ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا گیا ہے اس کے نتائج سے بھی ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ ٹکنولوجیکل آدمی کو ادب اور آرٹ کی نعمتوں سے بے نیاز رکھنے کا مطلب ہے اسے ذہنی، جذباتی اور روحانی طور پر معطل اور کند بنانا وہ ایک اچھے مشین کے طور پر کام کر سکتا ہے لیکن بھرے پرے انسان کے طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہی حال اس شخص کا ہے جو ذہن تو استعمال کرتا ہے لیکن ہاتھوں کا استعمال نہیں کر سکتا۔ وہ شخص جو کتاب کا کیڑا بن جائے لیکن عملی طور پر ناکارہ رہ جائے تو پھر اس کا کتابی علم بھی اپنی تازگی اور توانائی کھو دیتا ہے، وہائٹ ہیڈ نے علم اور عمل، دماغ اور ہاتھ دونوں کے آہنگ پر زور دیا ہے۔ گاندھی جی کے تو پورے تعلیمی فلسفہ کی اساس ہی علم اور عمل کا توازن ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہم یہ توازن قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس بات سے تو شاید ہی کوئی ماہرِ تعلیم انکار کرے کہ تعلیم کا ایک مقصد فرد کو اپنے پیشہ کے لیے تیار کرنا ہے تاکہ وہ سماج میں معاشی طور پر خود کو مفلوج اور ناکارہ نہ پائے۔ سائنس اور ٹکنالوجیکل تعلیم کا یہی مقصد ہے۔ تعلیم کا مقصد فرد کو ادب، آرٹ، فلسفہ، تاریخ اور دوسرے سماجی علوم کی نعمتوں سے فیض یاب کرنا ہے۔ صاف بات ہے کہ ان علوم کی تحصیل کرنے والوں کا ذریعہ معاش سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ان علوم کی تعلیم دوسروں کو دیں۔ ہمارے یہاں سب سے خستہ حالت لبرل تعلیم ہی کی ہے۔ سماج کے

سب سے ذہین لڑکے درسِ نظامیہ کی طرح ہارورڈ کی فیکلٹی کا ایندھن بنتے ہیں معقولات کی تعلیم
سے کچھ بھی حاصل کیے بغیر جب سماج میں واپس آتے ہیں تو ہر کام کے لیے خود کو ناکارہ پاتے
ہیں۔ اسی لیے لبرل تعلیم آج سب سے زیادہ حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اور
ہماری رومانی کہانیوں اور فلموں کے ہیرو بھی ڈاکٹری اور انجینیرنگ کے طالب علم ہوتے
ہیں، ایم۔ اے کے نہیں۔ تعلیم کا ایک مقصد افراد و معاشرہ میں معاشرے کے کلچر کو عام
کرنا بھی بتایا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ لوگ جو لبرل تعلیم کے امین ہیں
کلچر بھی پیدا کرتے ہیں اور پھر کلچر کو سماج کے دوسرے افراد کے پاس اس طرح لے جاتے
ہیں جس طرح کوئی ان داتا بھوکے کو روٹی کھلائے۔ کلچر کی تخلیق اکاڈمی میں نہیں ہوتی
حالانکہ اکاڈمی معاشرے کی تہذیبی روایات کی بہترین محافظ ہوتی ہے۔ کلچر کی تخلیق میں
پورا سماج حصے دار ہوتا ہے اور جب سماجی زندگی میکانکی اور مشینی بن جاتی ہے، اور
جب سماج مادی قدروں کے پرے کسی اور تہذیبی اور روحانی نظامِ اقدار کو دیکھ نہیں
سکتا تو کلچر کی تخلیق کا عمل بھی بند ہو جاتا ہے اور پھر تو اکاڈمی میوزیم میں بدل جاتی ہے
اور پروفیسر قبروں کے مجاور۔ اسی لیے تو لیویٹ نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ
انگلستان کی یونیورسٹیوں میں انگریزی ادب بھی پڑھایا جاتا ہے۔ وہ گویا یہ بتانا
چاہتا تھا کہ ہر شخص کو چاہیے اس کا پیشہ کچھ ہو اور وہ زندگی کے کسی بھی شعبہ میں کام
کرتا ہو اپنی مادری زبان کے ادب سے تو واقف ہونا ہی چاہیے۔ آدمی اپنی زبان
اور اپنی زبان کی تہذیبی روایت سے واقف ہی نہیں ہوگا تو وہ آدمی کتنا رہ جائے گا
مغرب میں جو آج لبرل تعلیم پر اصرار ملتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انسانی علوم کے علم
کے بغیر آدمی نہ دوسرے انسانوں کو سمجھ سکتا ہے نہ اپنی زندگی کو جامع بنا سکتا ہے۔ چنانچہ
اسی سبب اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ سماج کو تعلیم کی افادی قدر پر ہی زور دینا نہیں
چاہیے۔ بہت سے علوم ایسے ہیں کہ سائنس اور ٹکنولوجی کی مانند نہ تو فوری ثمرات دیتے
ہیں نہ ان کے اثرات کا فوری طور پر ٹھوس تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔ سماج کو ایسے امکانات
پیدا کرنے چاہئیں کہ لوگ ان علوم کو محض تحصیلِ علم کی خاطر پڑھتے رہیں اور ان
کی افادیت کا پیمانہ وہ نہ ہو جو سائنس اور ٹکنولوجی کا ہوتا ہے۔ سائنس اور ٹکنولوجی
ہماری پیداوار اور قومی دولت بڑھا سکتے ہیں، آرام اور آسائش کی چیزیں دے سکتے

میں۔ اشیاء اور اوزار ایجاد کر سکتے ہیں، لیکن زندگی کی قدروں کی تخلیق کا کام فلسفی اور مفکر، ادیب اور فن کار ہی کرتا ہے۔ قدروں کے احساس کے بغیر آپ یا تو چیزوں کے پیچھے بھاگیں گے یا چیزوں میں گھرے ہوئے ہوں گے، یا خود بھی ایک چیز بن جائیں گے اشتہارات، اخبارات، ٹیلی ویژن، فلم، ریڈیو، کامک میگزین الٹی مجسمے اور کامرشیل آرٹ نے آخر آج آدمی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، اتنی سب آسائشوں کے باوجود اگر اس کا اندرونی کھوکھلاپن اور ذہنی بے چینی دور نہیں ہو سکتی تو مرض کا علاج مادی آسائشیں نہیں بلکہ کچھ اور ہے، یہ اور کیا ہے اس کی تلاش اور تعیین کا کام انسانی علوم کا ہے۔ لبرل تعلیم ذہن کو ایسے ہی چند کاموں کے لیے تیار کرتی ہے لبرل تعلیم نہ ہو تو سماج کے پاس فلسفی اور مفکر کہاں سے آئیں گے۔ نظریے اور قدریں کیسے تخلیق ہوں گی۔ ماضی کی وہ روایت جس میں ہمارے پرکھوں کی دانش مندی خون بن کر دوڑ رہی ہے اسے محفوظ کون کرے گا۔ ماضی کے بوسیدہ ادب العالیہ کو ہمارے لیے معنی خیز کون بنائے گا۔ اگر یہ کام نہ کیا گیا تو وہ زمین کیسے تیار ہو گی جس میں نئے کلچر کا بیج پھوٹتا ہے، جس طرح قدیم کلچر کو زندہ کرنا ممکن نہیں اسی طرح بالکل نئے کلچر کی تخلیق بھی ممکن نہیں بلکہ جیسا کہ ایلیٹ نے بتایا ہے کہ جو بھی نیا کلچر ہو گا وہ پرانے کلچر کی کوکھ ہی سے جنم لے گا۔ انھیں ضرورتوں کی وجہ سے آج بھی یونیورسٹیاں لبرل تعلیم کا گڑھ ہیں، اور سائنس اور ٹکنولوجی کے نصاب میں لبرل تعلیم کا معتد بہ عنصر شامل ہوتا ہے۔

ایک عیسائی تعلیمی رسالہ میں مجھے ایک لاطینی کہاوت نظر آئی: "تعلیم سب آدمیوں کے لیے اور پورے آدمی کے لیے ہونی چاہیے۔" ہمارے یہاں کی سیکولر تعلیم جس میں مذہبی تعلیم کا نام و نشان نہیں وہ بھی ادھورے آدمی کی تعلیم ہے، اور ہمارے دینی مدرسوں کی جس میں سوائے دینیات کے کچھ اور پڑھایا ہی نہیں جاتا وہ بھی ادھورے آدمی کی تعلیم ہے۔ تعلیم تمام آدمیوں کے لیے ہونی چاہیے لیکن یہ بات صرف ہائر سکنڈری سکول کے لیے درست ہے یعنی ۱۶ یا ۱۷ سال کے بچوں کے لیے۔ یونیورسٹی جو اعلیٰ تعلیم کا گھر ہے اپنے دروازے سب کے لیے کھلے نہیں رکھتی۔ ماہرینِ تعلیم نے بتایا ہے کہ ۱۷ سال کی عمر تک بچے کو ایسی تعلیم دینی چاہیے کہ وہ زندگی

کا چیلنج قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ یونیورسٹی کی تعلیم جو سب کے لیے ہوتی ہے وہی سب کو اس کی طرف لپکنا چاہیے۔ جمہوری سماج سب کو مواقع یکساں دیتا ہے لیکن جہاں تک صلاحیتوں کا تعلق ہے تو اس کی تقسیم کا کاروبار ابھی تک اللہ میاں نے سنبھالا ہوا ہے۔ ہمارے تعلیمی انتشار کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ یہاں ہر شخص خود کو اعلیٰ تعلیم کا اہل سمجھتا ہے وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کی یونیورسٹیوں نے ترغیبات کا ایسا جال پھیلایا ہے کہ کوئی اس ترغیب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بس جسے دیکھو وہ کالج جانا چاہتا ہے۔ کسی رسالہ میں میری نظر سے ایک امریکی نامہ نگار اور ایک روسی طالب علم کی بات چیت کی رپورٹ گزری تھی اس کا ایک جملہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ روسی طالب علم نے کہا تھا کہ ہمارے یہاں یونیورسٹی میں داخل ہونا بہت آسان ہے۔ لیکن داخل ہونے کے بعد جاری رہنا بہت مشکل ہے۔ مطلب یہ کہ پڑھائی اتنی سخت ہے کہ داخل ہونے کے بعد ہی نہ داخل ہونے کے فائدوں کا احساس ہوتا ہے

بہرحال کہنے کا مطلب یہ کہ یونیورسٹی کی تعلیم کم تو لوگوں کی ہوتی ہے اور ہونی چاہیے لیکن ہماری یونیورسٹیوں اور دربارِ حرام پور میں اب بہت زیادہ فرق نہیں رہا۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہر جگہ منتخب طلبا کے لیے ہوتی ہے۔ انتخاب کا معیار کیا ہونا چاہیے یہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا ایسی راز کی باتیں صرف یو جی سی کے سامنے ہی بیان کی جاتی ہیں وہ بھی اس وقت جب کہ فرسٹ کلاس کا کرایہ دے کر دہلی بلوایا جائے لیکن آپ اطمینان رکھیے مجھے یہ شرف کبھی حاصل نہیں ہوا۔ اس وجہ سے نہیں کہ یو جی سی مجھے نااہل سمجھتی ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ مجھے خود پتہ نہیں کہ انتخاب کا معیار کیا ہے۔ رسل نے تعلیم پر اپنی کتاب میں اس مسئلہ پر بحث کی ہے لیکن اس کی باتیں بھی از کار رفتہ ہو گئیں۔ دراصل تعلیم کا موضوع ہی ایسا ہے۔ اس موضوع پر آپ جو کچھ کہیں گے، وہ ہونٹوں سے ادا ہوتے ہی از کار رفتہ ہو جائے گا۔ تعلیم کے موضوع پر وہی شخص بات کر سکتا ہے جسے پیش پا افتادگی اور فرسودگی کا بالکل احساس نہ ہو سکے۔ ایسے برگزیدہ بندوں کی کچھ قسمیں میں اوپر گنوا چکا ہوں۔ یہ لوگ مثال کے طور پر اگر علم کے لیے تمہیں چین جانا پڑے تو چین جاؤ والی حدیث کا ذکر اس طرح کریں گے

گویا وہ اس حدیث کو براہ راست بچوں سے لے کر ابھی نازل ہوئے تھے۔
وہائٹ ہیڈ نے تعلیم کے لیے آزادی اور رومانس اور ڈسپلن کی قدر بتلا دیا ہے۔ یہ تینوں تعلیمی سفر کی مختلف منزلیں ہیں۔ مادام مونٹیسری نے بچوں کی تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں آزادی کی اہمیت پر جو تحقیقات کی ہیں ان کی وجہ سے ان کا نام غیر فانی ہو چکا ہے۔ گاندھی جی نے مادام مونٹیسری سے کہا تھا کہ میں آپ کی تحقیقات کو سر آنکھوں پر چڑھاتا ہوں۔ لیکن آپ کا طریقۂ تعلیم میرے دیس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ گاندھی جی دراصل بہت ہی PRAGMATIC قسم کے آدمی تھے اور وہ یہ بات جانتے تھے جو ہم نہیں جانتے کہ تعلیم کا ملک کی اقتصادی حالت سے کیا تعلق ہوتا ہے۔ رسل تو انگریز بچوں کو فرنچ اور جرمن بھاشائیں سکھانے کے لیے فرنچ اور جرمن خواتین کو ملازم رکھنے کی باتیں کرتا ہے اور یاد رکھیے کہ رسل اشرافیہ تعلیم کا نہیں بلکہ جمہوری تعلیم کا علمبردار ہے۔ ہم مغرب کی یونیورسٹیوں کے مطابق ہمارا نصاب اور طریقہ تعلیم بناتے ہیں لیکن ہمارے پاس وہ سہولتیں نہیں جو مغرب کے پاس ہیں۔ کثرت السنہ کی وجہ سے شاید وہ سہولتیں ہم کبھی بھی پیدا نہ کر سکیں۔ مثلاً اساتذہ اور طالب علموں کے لیے معیاری لیکن ارزاں کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ شاید ہم کبھی نہ سلجھا سکیں۔ وہ کالج جو سالانہ جلسوں میں پانچ پانچ اور دس دس ہزار روپے خرچ کر ڈالتے ہیں انھیں لائبریری کے لیے پیسے نکالتے وقت پیٹ میں ایسی چونک اٹھتی ہے کہ پروفیسر کی ہمت نہیں ہوتی کہ اپنے مضمون کی کتابوں کے لیے پچاس، سو روپے طلب کرے۔ کالج ناچ گانوں کے پیچھے پیسہ خرچ کر سکتی ہے کتابوں کے پیچھے نہیں۔ اگر آپ اس بات کی تحقیق کریں کہ ہمارے طالب علموں کے پاس ذاتی کتابوں کا ذخیرہ کتنا ہوتا ہے یا وہ لائبریری سے کتنی کتابیں ایشو کراتے ہیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ہم کونسی بربریت کی سطح پر جی رہے ہیں۔
اب رہا پروفیسروں کے مطالعہ کا مسئلہ تو پروفیسروں کی اپنی ایم۔ اے کی نوٹس وہ ورثہ ہیں جو وہ آنے والی تین پیڑھیوں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کا زیادہ وقت پرنسپل اور کالج کا وہ کام کرنے میں صرف ہوتا ہے جو کسی وجہ سے کلرک نہیں کر سکتے۔ علم و ادب اور تحقیق و تنقید کے وہ اہل نہیں رہے۔ اس لیے کلرکی کر کے خوش

رہتے ہیں کہ بہرحال کالج کے لیے کسی نہ کسی طرح سود مند تو ہیں۔ کالج کے ڈیو ہیکل ایڈمنسٹریشن نے پروفیسروں کو کچا نگل لیا ہے اور ڈکار تک نہیں لی۔ اسی لیے پروفیسر آپ کو ہمیشہ آفس میں نظر آئے گا، لائبریری میں صرف اس وقت ملے گا جب آفس ہی کے کسی کام سے لائبریرین کے پاس گیا ہو۔ سینیٹ یا اکاڈمک کاؤنسل یا بورڈ آف سٹوڈینٹس کی رکنیت، ممتحن بننے کے لیے مختلف یونیورسٹیوں میں بھاگ دوڑ، ٹیوشن اور گائڈیں، ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ، پرنسپل اور آفس کے کام اور اسی قسم کی دوسری لاعلم سرگرمیوں میں اس کی پوری زندگی تلف ہو جاتی ہے۔ پروفیسر کی زندگی میں نہ آزادی ہے نہ رومانس نہ ڈسپلن۔ رسل نے بتایا ہے کہ استاد کا کام علم کو محبت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ ابتدائی منزل میں یہ محبت خود علم کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر آپ نے شاعر کو جھوم جھوم کر پڑھایا ہی نہیں تو پھر آپ نے شاعر کو پڑھایا ہی کیا۔ اب یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ محبت فی الحقیقت فرصت کا کام ہے۔ لیکن پروفیسر کی قسمت میں وہ فرصت کہاں کہ رات دن تصورِ جاناں کیے ہوئے بیٹھا رہے۔ اعلیٰ تعلیم کی ہر بحث میں آپ کو فرصت پر اصرار ملے گا، لیکن شرط یہ ہے کہ پروفیسر فرصت کا مناسب استعمال کرے۔ فرصت اسے اس لیے نہیں دی جاتی کہ وہ حجاموں کے ساتھ بیٹھا بیت بازی کرے، ٹیوشن کرے، گائڈیں لکھے، مذہبی پمفلٹ پڑھے یا یونیورسٹی کی سیاست پر اخباروں میں کالم نویسی کرتا رہے۔ اگر پروفیسر سے پڑھانے کا کام کم لیا جاتا ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ پڑھنے میں زیادہ وقت صرف کرے تاکہ وہ جو کچھ بھی پڑھائے وہ اس کے وسیع مطالعہ کا نچوڑ ہو۔ جو لوگ فرصت کے صحیح استعمال کے فن سے واقف نہیں ہوتے ان کے لیے فرصت بے مصرفی کا دوسرا نام بن جاتی ہے اور وقت ایک پہاڑ بن جاتا ہے جو کاٹے نہیں کٹتا۔ اگر پروفیسر میں رومانس کا جذبہ نہیں، علم کی بے لوث تڑپ نہیں، فکر و نظر کے نئے آفاق سر کرنے کا ولولہ نہیں، تو اس کے لیے فرصت کاہلی کا بہانہ بنتی ہے۔ اس کا ذہن زنگ آلود ہو جاتا ہے، شخصیت سکڑ جاتی ہے اور وہ اپنے مشغلہ، اپنے پیشہ اور اپنی ذات سے بے زار، اکتایا ہوا پھرتا ہے۔ اس اکتاہٹ سے نجات پانے کے لیے وہ بدترین قسم کی سرگرمیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اساتذہ میں آرائیں پائیں

اور جماعت اسلامی کے ممبر داروں کی تعداد دوسرے طبقوں سے کہیں زیادہ ہے
پروفیسر حبیب نقوی، ڈائرکٹر ادارہ فرقہ پرستی کا مطلب ہے لوگوں کو سماجی زندگی کا پانی
اپنے سرچشمہ ہی سے گندہ ہونا شروع ہوتا ہے۔ فرقہ پرستی فناٹسزم ہے اور تعلیم
فناٹسزم کا توڑ ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے کا مطلب ہے ان شعبوں سے مالا مال ہونا
جو آدمی کو مہذب اور شائستہ بناتی ہیں، اس کے ذہنی آفاق کو وسیع کرتی ہیں اسے کشادہ
دل بناتی ہیں اور صحیح معنوں میں مہذب بناتی ہیں۔ تعلیم یافتہ ہونے کا مطلب ہے مسائل پر
ٹھنڈے دل سے غور کرنا، حقائق کی معروضی طور پر چھان بین کرنا، صحیح نتائج اخذ کرنا،
سچائی کی تلاش کرنا، قدروں کا احساس اور شعور رکھنا اور فکر و نظر سے کام لینا۔ یہ
سب عناصر مل کر آدمی کو وہ ذہنی کلچر عطا کرتے ہیں جو ایک ہوشمند سماج کا سرچشمہ ہے
فرقہ پرست کا ذہن اس سرچشمے سے محروم ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا ریگزار ہوتا ہے جس
میں نفرت و حقارت کے بگولے اٹھتے ہیں اور غیظ و غضب کی آندھیاں چلتی ہیں
میں ایک نہیں بیسیوں فرقہ پرست پروفیسروں سے واقف ہوں جو کلاس میں،
سٹاف روم میں، چوراہوں پر، ذاتی جماعتوں کی مجلسوں اور کانفرنسوں میں اپنی
زہریلی زبان سے پھنکارتے رہتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر میں سوچتا ہوں کیا یہی
ہیں ہماری تہذیبی روایتوں کے وارث، علمی خزانوں کے پاسبان، ادب آرٹ
اور کلچر کے نگہبان۔ سکولوں اور کالجوں کے وہ بچے جو ان کی زہر افشانیوں پر پل کر
جوان ہوتے ہیں وہ سماجی زندگی میں نفرتوں کی کیسی آگ بھڑکا سکتے ہیں، اس کے
تصور سے ہی جی لرز اٹھتا ہے۔

تعلیم خلا میں نہیں دی جاتی۔ تعلیم خالی الذہن لوگوں کو بھی نہیں دی جاتی۔
تعلیم طالب علم کے ذہن کو بھکاری کا خالی کشکول سمجھ کر بھی نہیں دی جاتی۔ انسانی
ذہن ایک زندہ کارگزار ہے، زمین کی پہیلی نہیں کہ اس میں معلومات کی گٹھڑی سرسری
چند صیاں ٹھونس ٹھونس کر بھری جائیں۔ وہائٹ ہیڈ نے کہا ہے کہ تعلیم کا کام
ذہن کو بھرنے کا نہیں بلکہ اسے آگ لگانے کا ہے۔ آہستہ آہستہ ذہن کا شعلہ بھڑکتا
ہے اور جہل کا اندھیرا دور ہونے لگتا ہے۔ اندھیری رات میں دیے کو جلا کر نکلنا،
ان جانی چیزوں کو جاننا، ان دیکھی دنیاؤں کی سیر کرنا، نئے جزیروں کی تلاش کرنا

سمتوں کی طرف رواں نئے آفاق کا انکشاف ۔ یہ ہے وہ رومانی جذبہ جس پر تعلیم کی پوری عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ تحیر، تجسس، تحقیق اور انکشاف کے جذبات کا معلم مکمل طور پر فائدہ اٹھاتا ہے اور طالب علم کو ایک ایسی راہ پر گامزن کر دیتا ہے جس پر اس کے علم کی تشنگی ہر لحظہ بڑھتی جاتی ہے اور گو وہ ایک خاص منزل پر پہنچ کر اپنی باقاعدہ تعلیم کو مکمل کر لیتا ہے اور کام دھندے پر لگ جاتا ہے، لیکن اس کا ذوق تجسس اور تحیر کم ہونے نہیں پاتا اور کسی نہ کسی طرح اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں سے وقت نکال کر وہ اپنی پیاس بجھاتا رہتا ہے ۔ یہی چیز اسے تر و تازہ رکھتی ہے اور اس کے ذہن کو زنگ آلود اور معطل بننے نہیں دیتی ۔ ہمارا طریقۂ تعلیم پھر اس قسم کا رہا ہے کہ پہلے تو وہ طالب علم کی دلچسپی کا گلا گھونٹتا ہے ۔ پھر اس کے ذوقِ تجسس اور تحیر کی گردن مارتا ہے اور بالآخر اس کے ذہن کو بساند مارتی معلومات کا ڈھیر بنا کر چھوڑ دیتا ہے ۔ ہمارے یہاں تعلیم کا رومانس محض ایک انحطاط میں بدل گیا ہے ۔ اس میں نظامِ تعلیم سے کہیں زیادہ قصور ان اساتذہ کا ہے جن کے چہرے کی مردنی، ذہن کی سکونی، مزاج کا اضمحلال، اور سکڑی سمٹی جھاڑ جھنکار روح کی بسورتی گھن آلود شخصیت کی بیچارگی اور بے کسی، طالب علموں کا ابال، ہم جولی، جوش و خروش اور ولولوں کے لیے ٹھنڈے پانی کا کام کرتی ہے ۔ جب اساتذہ میں ہی ذوقِ علم ماند پڑ گیا ہو تو وہ طالب علموں کے ایوانِ فکر کو کیا دہکائیں گے ۔ وہ سماج جو اپنے کمزور ترین دماغوں کو معلمی کے پیشہ کے لیے وقف کرتا ہے اور ان کے ساتھ اقتصادی ناانصافی کا سلوک روا رکھتا ہے بالآخر اس کا خمیازہ ان گروہ غیر تربیت یافتہ اور نیم تعلیم یافتہ نسلوں کی صورت میں بھگتتا ہے ۔ یہ نسلیں سماج پر بار بن جاتی ہیں ۔ سانپ کے منہ کی چھچھوندر کی طرح وہ انھیں نگل سکتا ہے نہ اگل سکتا ہے ۔ یہی لوگ پھر اساتذہ بنتے ہیں اور ایسی ہی دوسری ان گروہ نسلیں پیدا کرتے ہیں ۔ بیوروکریسی کو خراب کرتے ہیں، کلچر کو بازاری بناتے ہیں، سیاست کو طاقت کی کشمکش، اور سماج کو خود غرضی، ترقی کو ٹھگی، اور مادہ پرستی کے جوہڑ میں بدل دیتے ہیں ۔ ہمارے اساتذہ کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جسے فی الحقیقت مسجد میں پیش امام، مندر میں مہنت یا مالی کا کارندہ ہونا چاہیے نہ کہ اسکولوں ۔

اور کالجوں میں بھی۔ نتیجہ سامنے ہے، مدارس کی مالی کاڑیوں سے جو کند ذہن تعلیم یافتہ نکلتے ہیں وہ مسجدوں، مندروں کو آگ لگاتے ہیں، خود اساتذہ پر پتھراؤ کرتے ہیں اور کیمپس کو کمپ فائر میں بدل کر وحشی قبائل کی طرح شعلوں کے اردگرد بھاگتے ہیں، اور ناچتے ہیں۔

مدرسوں میں تربیت کی اہمیت ختم ہو گئی ہے۔ تعلیم کا محض نام ہے صرف تدریس کا سلسلہ رہ گیا ہے اور وہ بھی برائے نام کیونکہ ایک طرف کوچنگ کلاسیز دوسری طرف گائڈ اور تیسری طرف ٹیوشن کی گرم بازاری بتاتی ہے کہ مدرس کلاس میں صرف ہوم ورک دینے کا کام کرتا ہے۔ تربیت طلباء میں ذاتی دلچسپی کے بغیر ممکن نہیں لیکن مدرس کے پاس اب طالب علموں کی اتنی کثیر تعداد ہوتی ہے کہ طلبا بھی بے چہرہ بھیڑ بن گئے ہیں۔ انتظامی اور دفتری کام بھی اتنا زیادہ ہوتا ہے اور نصاب اور امتحان بھی سرخ فیتہ میں اتنا جکڑا ہوتا ہے کہ مدرس اگر تدریسی کورس ہی وقت متعینہ پر ختم کر سکے تو غنیمت سمجھو گنگا نہایا۔ پھر طالب علم کی تربیت میں گھر کا ماحول اور مدرسہ کا ماحول ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اور گھر مفلوک الحال معاشروں میں یا تو بن ہی نہیں پاتے یا بنتے ہیں تو گھر کی فضا پیدا نہیں کر پاتے، اور خوش حال معاشروں میں گھر ٹوٹتے زیادہ ہیں بنتے کم ہیں۔ تربیت کا تعلق چند اخلاقی قدروں سے ہے اور اخلاقی قدریں آج کے معاشرے میں ہوا ہو گئی ہیں۔ آداب و اطوار، ضبط نفس، جفاکشی اور ایثار نفسی، سعادت مندی اور بے لوثی، تندرست جسم میں تندرست دماغ، یہ وہ قدریں تھیں جن پر افلاطون سے لے کر مہاتما گاندھی تک زور دیا کرتے تھے اور علم اور تدریس سے زیادہ کردار کی تعمیر کو اہم گردانتے تھے۔ جیسے جیسے سماج کا طبقاتی شعور بیدار ہوتا گیا تو اخلاقیات کی نوعیت بھی سماجی کم اور طبقاتی زیادہ بنی۔ کچلے ہوئے طبقہ کے سامنے ضبط نفس، جفاکشی، سعادت مندی اور بے لوثی کی باتیں کرنا گویا انھیں خود غلامی میں زیادہ پختہ تر کرنا تھا۔ لبرل تعلیم لبرل سماج کا عطیہ تھی لیکن لبرلزم نے جب اپنا منطقی انجام کھلی سوسائٹی میں دیکھا تو گوشہ نشین ہو گیا۔ ادھر جمہوری انفرادیت پسندی کھلے سماج میں نراج کو پہنچی، ادھر ریڈیکلزم نے نراج سے بچنے کے لیے جمہوریت اور انفرادیت کی قدریں آمریت پر بھینٹ چڑھا دیں۔

ایک طرف جمہوری آزاد روی کی کھلی سوسائٹی تھی تو دوسری طرف یسا رنگی پیوریٹنزم کا بند سماج "اور نیا انسان دونوں سے بیزار تھا۔ پھر بچے "لعنت" جگر نہیں رہ دوسرے عورت مرد کی غلامی سے آزاد ہوئی تو گھر کے ساتھ ساتھ کاروبار کا بار بھی اس کے کندھے پر آن پڑا۔ اب ہندوستان کے برعکس روس اور امریکہ دونوں کو فکر لاحق ہے کہ بچے کم پیدا ہو رہے ہیں اور شرح آبادی تشویشناک حد تک گھٹ رہی ہے مخلوط خاندان کے ٹوٹنے اور عورت کی ملازمت نے بچوں کو نرسری اور کنڈرگارٹن میں دھکیل دیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اس طرح بچے "خاندانی استبداد سے بچ گئے"، دوسروں کا کہنا ہے وہ خاندانی محبت سے محروم ہو گئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں خاندان تعلیم و تربیت کا موزوں ادارہ نہیں، یہ کام ریاست ہی کر سکتی ہے۔ کچھ لوگ ریاستی تعلیم سے بھی خوش نہیں کہ ریاست بچوں کو اپنے نصب العین کے مطابق ہی ڈھالے گی جو غلط بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ فاشی اور آمر ریاستوں کے تجربات سے ظاہر ہے پھر نفسیات نے وہ دھاندلی مچائی کہ اخلاقی قدریں تو دو گیارہ ہو گئیں، شخصیت اور کردار کے تصورات ہی ہوا ہو گئے۔ مادہ پرست کاروباری دنیا میں لفظوں نے اپنے معنی ہی کھو دیے۔ جھوٹ چوری، بے ایمانی، بے وفائی، کے الفاظ کا استعمال سیاست، ٹیکس اور بیوپار کے دائرہ میں رکھ کر دیکھیے اور دیکھیے کہ یہ الفاظ وہ معنی نہیں دیں جو مثلاً مسدس حالی میں دیتے ہیں۔ ٹیکس چرانے والا، کالا بازار کرنے والا، سیاسی قلابازیاں کھانے والا، ہتھیار اور بارود بنانے والا صاحب عزت ہے کیونکہ اسی کے پیسہ اور اثر و رسوخ سے قوم کے مدرسے چلتے ہیں۔ ایسے تمام پہلوؤں کا اثر استاد اور طالب علم کے کردار پر پڑنا ناگزیر ہے۔ استاد اب محض کسٹوڈین رہ گیا ہے جس کی کسٹڈی میں سنبھالے نہ جا سکیں اتنے بچے جمع ہوتے ہیں اور استاد کا زیادہ وقت فائلوں اور دفتری کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ رہا تعلیم کا مسئلہ تو اب تو دوسری اور تیسری جماعت سے لے کر ایم اے تک کی گائڈیں مارکٹ میں ملتی ہیں پوری تعلیم سوال و جواب یا CATECHISM کا روپ اختیار کر گئی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر صحیح طریقہ اختیار کیا جائے تو آج کی چار سال کی تعلیم ایک سال میں دی جا سکتی ہے۔ یہ جدید تعلیم کا ایک عجیب پیراڈوکس ہے کہ ایک طرف وہ اتنی کارآمد ہے کہ گھر پر ٹیوشن اور ماں باپ کے

گھٹنے کے باوجود بچہ کے ذہن میں سماجی خوبیاں تو نہیں تو دوسری طرف آتی چلی ہے کہ خواہ مخواہ کے لیے
طویل عرصہ پر پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ہی نہیں دنیا بھر میں غالباً بھی
ان بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو سکول کی تعلیم ختم نہیں کر پاتے۔ اس کی وجہ
بھی بے شمار ہیں جو بے شمار رپورٹوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ نتیجہ ہوا ہے کہ آج کل ایک
اور پریشانی کا تصور عام ہو رہا ہے کہ کیا سکول ضروری ہیں۔ کیا سکول کی تعلیم بچوں
کے لیے مفید ہے۔ کیا تعلیم کا بڑھتا ہوا خرچ ماں باپ اور ریاست برداشت کر سکیں
گے۔ کیا ہم تمام بچوں کو مناسب تعلیم دے سکیں گے آخر تعلیم کے بغیر لاکھوں انسانوں
نے صدیوں تک اس دنیا میں زیست کی ہے اور آج بھی کر رہے ہیں تو تعلیم کو ناگزیر
کیوں سمجھا جائے۔ تعلیم میں جدید زمانہ کا FAD تو نہیں۔ اب دیکھیے یہ تو ایسے سوال
ہیں جو آدمی کی نیند حرام کر سکتے ہیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ پہلے کوٹ پر مستعار ٹائی لگا کر
بادہ فروشوں کی وہ تقریریں سنی جائیں جس میں وہ کپڑا لینے جاپان اور تعلیم لینے
چین جاتے ہیں۔

آج کل سکول اور سکولوں کی تعلیم کے خلاف تو بہت کچھ لکھا جا رہا ہے، سکول
مر گیا ہے، یا سکول فوج، اسپتالوں، پاگل خانوں یا جیل کی طرح ایک بہت بڑا اور ان
سے بھی کہیں زیادہ پھیلا ہوا اور طاقتور ادارہ بن گیا ہے، یا بچوں کا SUBCULTURE
بھی بیسویں صدی ہی کا ایک فینومینا ہے جس کی طرف ہم ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو
گئے ہیں یا سکول اور کالج بچپن کے زمانہ کو غیر ضروری طور پر طول دیتے اور بچوں کو نوجوان
ہونے کے بعد بھی بچہ رکھنے ہی کا ایک ذریعہ ہے وغیرہ وغیرہ قسم کی باتیں چاروں
طرف سنائی دیتی ہیں۔ ان باتوں کو آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو
حقیقت ہے کہ تعلیم کے بعد آدمی سفید کالر ملازمت ہی کو پسند کرتا ہے اور اس طرح
ذہنی کام اور ہاتھ کے کام میں تفریق پیدا ہوتی ہے جو بیکاری کا بحران پیدا کرتی ہے
یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تعلیم چاہے جتنی عام ہو صرف باصلاحیت بچے ہی تعلیم میں
آگے بڑھتے ہیں جیسا کہ دنیا بھر میں DROP-OUTS کی تعداد سے ظاہر ہے۔ اس کا
مطلب یہ بھی ہوا کہ تعلیم یافتہ طبقہ PRIVILEGED طبقہ ہوتا ہے جو حاصل
شدہ مراعات سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا اور اس طرح سماجی مراعات کے

نظام کو برقرار رکھتا ہے۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی سماجی مراعات سے
محروم اور اسفل زندگی گزارے اور صاف بات ہے کہ بیسویں صدی سے قبل یہ صورت
حال دنیا کے کسی سماج کی نہیں تھی۔ سکول انسانی زندگی پر کتنا حاوی ہے یہ اس بات سے
بھی ظاہر ہے کہ امریکہ میں حجامت کرنے کے لیے بھی ڈپلوما کی ضرورت پڑتی ہے اور ہمارے
یہاں چپراسیوں کے لیے بھی میٹرک کا سرٹیفکیٹ مانگا جاتا ہے۔ صاف بات ہے کہ آدمی
بے شمار کام ایسے کرتا آیا ہے اور اگر سکول زندگی پر اتنے حاوی نہ ہوتے تو آج بھی وہ یہ کام
کر سکتا تھا جن کے کرنے کے لیے مروجہ سکول کی تعلیم ناگزیر نہیں۔ آج کل محسوس یہ کیا
جا رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آدمی جلد سے جلد پختہ زندگی کی ذمہ داریوں کو سنبھال لیں یہی
ان کے اور سماج کے حق میں بہتر ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم ان نوجوانوں کو بھی بچہ بنا رکھتی ہے
جنھیں خود بچوں کا باپ ہونا چاہیے تھا لیکن یونیورسٹی کے طالب علم بچے نہیں ہوتے
بلکہ نوجوان ہی ہوتے ہیں گو وہ نوجوانوں کے فرائض ادا نہیں کرتے اور بچوں کی مراعات
سے بہرہ ور ہوتے رہتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے، اور ہمارے سامنے ہے ہماری یونیورسٹیاں
غیر ذمہ دار نوجوانوں کا ایسا گروہ بنی ہوئی ہیں جو نہ تو ذمہ دار زندگی کی تیاری
کرتے ہیں نہ زندگی سماج پیشہ اور تعلیم کی طرف کوئی ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔
یہی نہیں بلکہ یہ طالب علم سیاسی جماعتوں کے ہاتھ کا ایسا کھلونا بنے ہوئے ہیں کہ سماج میں
ایک پرائیویٹ سینا کا روپ اختیار کر گئے ہیں۔ آج کوئی بھی سیاسی جماعت طالب علموں
کی طاقت کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ یونیورسٹی کیمپس علم و ادب کے گہوارے نہیں رہے بلکہ
سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں کے اڈے بن گئے ہیں۔ اخلاقیات اور تربیت کی اہمیت ختم
ہونے کے بعد، تعلیم مقررہ جانے کے بعد، تدریس ناقص اور سطحی بن جانے کے بعد یونیورسٹی
طلبا کو سیاست کے ایندھن کے طور پر استعمال کرنا مشکل نہیں رہا۔ [illegible] فاشسٹ،
نسلی اور فرقہ پرست تصورات ان نیم خواندہ طلبا میں پھیلائے جا سکتے ہیں۔ اور پھیلائے
جاتے رہے ہیں۔ تعلیمی ادارے ادارے ہونے کے ناتے ہی سماج کا عکس ہوتے ہیں
اور سماجی تضادات اور تعصبات کو پالتے پوستے رہتے ہیں۔ سماج میں اگر ایک زبان،
ایک تہذیب، ایک فرقہ، ایک مذہب، ایک ملک، ایک تصور اور ایک نظریہ کے خلاف
تعصب ہے تو ان تعلیمی اداروں میں اس کے نصاب اور اس کی کتابوں میں، اس

کی تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں میں اس تعصب کا عکس پڑنا ناگزیر ہے۔ بے شمار ایسے پرائیویٹ
سکول ہیں جن میں چند مضامین اور چند زبانیں نہیں پڑھائی جاتیں۔ یہی نہیں بلکہ بسا اوقات
اچھوت یا دوسری ناپسندیدہ جاتیوں کے بچوں کو داخلہ تک نہیں ملتا۔ یہی نہیں بلکہ ایسا
نصاب پڑھایا جاتا ہے جو نسلی، لسانی، اور متعصبانہ ہوتا ہے۔ تعلیم کو قومیا لینے اور اسے
ریاستی بنانے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ تعلیمی ادارے ریاستی آئیڈیولوجی کے
INDOCTRINATION کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ خیالات اور تصورات کے
آزادانہ تلمس کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ فاشی اور اشتراکی ریاستوں کی تعلیمی
تاریخ بتا دے گی کہ عمرانی علوم کا تو سوال ہی کیا، اگر سائنسی تحقیقات بھی ریاستی آئیڈیولوجی
سے ہم آہنگ نہیں تھیں تو ان پر قدغن عائد کیے گئے۔ یہ تحقیق کہ سفید اور
سیاہ، یہودی اور آریائی کا خون ایک ہوتا ہے سزاوار تعزیر گردانی گئی لیکن ایٹم بم سے
ہائیڈروجن بم زیادہ ہلاکت آفریں ثابت ہوتا ہے قسم کی تحقیق کو انعامات سے نوازا گیا۔
صاف بات ہے کہ تعلیمی صورت حال جب اس قدر الجھی ہوئی ہو تو ادب اور تعلیم
کے رشتہ پر غور کرنا کافی مشکل ہو جاتا ہے۔ آدمی کوئی بات بھی خود اعتمادی سے نہیں کہہ
سکتا۔ ادب کے نقاد تو اس موضوع کو ادب کا موضوع سمجھتے ہی نہیں، لیکن مجھ جیسے
لوگ جو تعلیم کی روٹی کھاتے ہیں اور ادب کا چارہ چرتے ہیں کب چین سے بیٹھنے والے
ہیں۔ وہ تو ادب کا رشتہ سوائے ادب کے ہر چیز سے ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔
چنانچہ ادب برائے ادب کے علاوہ ادب برائے ہر چیز پر گوہر افشانی کو ہم مدرس لوگ
فریضۂ منصبی سمجھتے ہیں۔ سماج، زندگی، اخلاق، عوام، انقلاب، تعلیم وغیرہ تو پھر بھی
بفضلِ رب خاصے شریفانہ موضوعات ہیں۔ لیکن مدرس نقادوں کے لیے لکھنا اور
چھپنا چونکہ میٹھی خارش کی صورت اختیار کر گیا ہے اس لیے اگر ناخن قلم ان
موضوعات کی کھال ادھیڑ کر رکھ دے تو مجھ جیسے لوگوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر چند
دوسرے موضوعات ابھی سے محفوظ کر لیے ہیں۔ مثلاً پیغمبری وقت پڑے تو فدوی
ادب برائے قوت باہ پر بھی طبع آزمائی کرنے کے لیے تیاری کر چکا ہے اور اس مقصد
کے لیے فحش ادب، ایروٹیکا اور قرابادین کا وافر ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے
کہ حالات اتنے ناگفتہ بہ نہیں۔ ادب کا رشتہ بے شمار ایسے موضوعات سے ثابت کیا

جا سکتا ہے جو شرعاً جائز ہیں۔ لہٰذا البوب کبیر کی بجائے صرف مسکین سے کام چل سکتا ہے۔

تو میں کہہ رہا تھا ادبی نقاد تعلیم سے کم ہی سروکار رکھتے ہیں جن لوگوں نے اس موضوع پر لکھا مثلاً ایف آر لیوس صاحب وہ بھی یونیورسٹی میں لبرل تعلیم ہی کا بلیو پرنٹ پیش کر سکے۔ گویا یہ موضوع ہی ایسا ہے کہ اس میں معلموں کو دلچسپی ہو سکتی ہے ادیبوں کو نہیں، اور لطف کی بات یہ ہے کہ معلموں کو بھی بہت زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔ اساتذہ کی کانفرنسوں میں بھی اساتذہ تعلیم کے مسائل پر کم اور ادب کے مسائل پر زیادہ بحث کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی ادیب خود کو معلم کہلانا پسند نہیں کرتا لیکن ہر معلم خود کو ادیب کہلانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ صورتِ حال کچھ اس قدر مضحکہ خیز ہو گئی ہے کہ ایسا لگتا ہے گویا ادیب صرف معلموں کے لیے ادب لکھتا ہے اور معلم اس لیے ادب پڑھتے ہیں کہ ادب پر کچھ لکھ کر وہ بھی ادیب بنیں۔ اور طالب علم اس لیے ادب پڑھتے ہیں کہ اگر وہ ادیب نہ بن سکے تو کم از کم معلم ضرور بنیں گے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادیب ادب لکھتا ہے، معلم اس کی تعریف و تفسیر لکھتا ہے، طالب علم پہلے تفسیر اور بعد میں ادب پڑھتا ہے اور افسر بنا تو ادب پڑھنا چھوڑ دیتا ہے، اور نہ بنا تو خود مفسر بنتا ہے اور ادب پڑھے بغیر ادب کی تفسیر لکھنے کا غیر معمولی ملکہ پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ادب کا زندگی سے، عوام سے، مختلف پیشوں اور طبقوں میں بٹے ہوئے عام آدمی سے جو گہرا ربط ہونا چاہیے وہ ختم ہو گیا ہے۔ ادب کا دائرہ ادیب، معلم اور طالب علم کے مثلث میں بدل گیا ہے جو اقلیدس کا ایسا معمہ ہے کہ نہ تو ادیبوں کے سیمناروں میں حل ہوتا ہے نہ اساتذہ کی کانفرنسوں میں۔ اب تو ادیبوں کے سیمینار بھی جامعات ہی میں ہوتے ہیں، اور جامعات میں اساتذہ عروض و اسلوبیات و لسانیات پر اتنی زبردست علامانہ لن ترانیاں کرتے ہیں کہ ادیب سہما ہوا سوچتا ہے کہ مشاقوں افسانہ یا غزل جو قبض و کشاد کے اس مرحلہ میں تیار ہوئی تھی جب لکھنے کی میز اور بیت الخلاء کے درمیان اس کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا اس افسانے یا غزل کو اگر ادب کے یہ ٹکنوکریٹ تخلیق کرنے بیٹھیں تو کم از کم پانچ یا چھ ریکارڈ رجسٹروں پر پچاس کروڑ کے کمپیوٹروں کا کارخانہ لگانا پڑے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ تعلیم کے مسائل، نصاب، طریقۂ تعلیم، تعلیم کی وجہ جن کی

وغیرہ کے مسائل پر بحث ہو۔ ادب یا ادبی نقاد اس وقت کچھ کہنے کا اہل ہوتا ہے جب وہ ماہر تعلیم
ہو اور اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ جب نصابی کتابیں موجود نہیں تھیں تو ادبی کتابوں سے نصاب کا
کام لیا جاتا تھا، مثلاً فارسی کی تعلیم گلستاں سے شروع ہوتی تھی۔ لیکن اب تو خصوصی طور
سے نصابی کتابیں تیار کی جاتی ہیں، گویا ادب کو اب یہ فکر لاحق نہیں ہوتی کہ وہ نصوح
کے پیدا ہونے کے بعد باب ہفتم لکھے یا نہ لکھے۔ بچوں کا ادب بھی الگ سے لکھا جاتا ہے گویا
اسے یہ فکر بھی نہیں کہ اس کا ادب مخرب اخلاق ثابت ہوگا۔ اس طرح ایک معنی میں دیکھیے
تو ادب تعلیم و تربیت اور اخلاقیات سے ماورا ہو گیا ہے۔ وہ زندگی کے تجربے کا بیان ہے
اور ہر اس شخص کے لیے ہے جو اس تجربہ سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہو اور ساتھ ہی اس
تجربے کا انھیں بیدار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ چنانچہ وہ ادارے جو ایک مخصوص قسم کے تعلیمی
تربیتی اور اخلاقی منصوبہ کے تحت وجود میں آتے ہیں جیسے مثلاً دینی اور مذہبی مدارس ان
میں بھی ادب اپنے فقدان سے نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مدرسوں سے جو لوگ پڑھ کر
نکلتے ہیں وہ یک طرفہ اور کھلی شخصیتوں کے مالک ہوتے ہیں اور انسان زندگی اور سماج
کا ان کا تصور صرف مذہبی تعلیمات تک محدود ہوتا ہے۔ وہ انسان کی تہذیبی سرگرمیوں
کو مذہب کے ساتھ منسلک نہیں کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادب اور آرٹ مذہب
سے رشتہ رکھنے کے باوجود مذہبی اداروں کی رہنمائی اور سرپرستی سے محروم رہے ہیں۔ اور
ایک سیکولر سرگرمی کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ہمارے علمائے دین کی کتابوں میں ادب
اور آرٹ کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے اور جب ذکر ملتا بھی ہے تو نقطۂ نظر اس قدر اخلاقی
اور کٹر رجحان والا ہوتا ہے کہ ان کی باتیں خیر اندیش فکر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ مغرب
میں بھی وہ کتابیں جو مثلاً کیتھولک یونیورسٹی کے اساتذہ نے لکھی ہیں یا ادب پر ان
کے سیمیناروں کے مضامین پر مشتمل ہیں تنقید کا کوئی اطمینان بخش نمونہ پیش نہیں کرتیں
حالانکہ مغرب میں ادب اور فنون لطیفہ کلیسا کے اتنے باغی نہیں رہے جتنا کہ ہمارے دینی
مدرسوں سے۔ اس سے تو ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے کہ ادب کا مذہب سے گہرا رشتہ
ہونے کے باوجود ادب مذہبی سرگرمی نہیں اور ادب کے معاملات کو مذہب کی روشنی
میں تو کہا جا سکتا ہے لیکن مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب
کی طرف DOCTRINAL رویہ بہت کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ ادب

زندگی کے تجربات کا بیان ہے اور تجربات نظام اعتقادات میں مشکل ہی سے سماتے ہیں۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو ادب پر کمیونسٹ نقادوں کی باتیں مذہبی علماء کی باتوں سے مختلف نظر نہیں آتیں۔ دونوں ایک خاص قسم کا ادب ہی قبول کر سکتے ہیں جو ان کے اخلاقی اور سماجی تصورات کا آئینہ ہے۔ یہ تصورات چاہے کتنے اچھے ہوں لیکن نہ تو وہ پوری انسانی زندگی کا احاطہ کر سکتے ہیں نہ، نگار رنگ انسانی زندگی محض ان تصورات سے عبارت ہوتی ہے وہ ادب جو ان تصورات کا حامل نہیں ہوتا ان کی نظر میں گمراہ ہوتا ہے۔ گمراہ کا لفظ دونوں کو بہت عزیز ہے۔

کیا تعلیم کی طرف فنکار کی کوئی ذمہ داری ہے؟ یہ بالکل ایسا ہی سوال ہے جیسا کہ سماج یا زندگی کی طرف اس کی کوئی ذمہ داری ہے؟۔ فنکاری تو آئینہ ہے جس میں زندگی اور سماج کا عکس نظر آتا ہے۔ اسی لیے زندگی انسان اور سماج فنکار کے لیے تخلیق کا خام مواد ہے تعلیم پر تقریر کی جا سکتی ہے لیکن ادب پیدا کرنے کے لیے تو فنکار کو اس آدمی پر توجہ مرکوز کرنی پڑتی ہے جو تعلیم لے رہا ہو، یا دے رہا ہو یا تعلیمی ادارے کا کرتا دھرتا ہو یا اس سے منسلک ہو۔ چنانچہ سکول، کالج، اور یونیورسٹی کی زندگی پر طنزیہ، مزاحیہ اور حقیقت پسندانہ افسانے، ناول، اور ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ سکول ٹیچر اور پروفیسر افسانوی ادب کے دلچسپ کردار رہے ہیں۔ جارج ایلیٹ، ڈکنس، چاسر، کنگسلے ایمس، سی پی سنو، پامیلا ہنسفورڈ جانسن، لارنس ڈریلنگ، نیباکوف، وغیرہ چند ایسے نام ہیں جو اس ضمن میں فوری طور پر یاد آ رہے ہیں۔ ان ناموں میں اور بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ان فنکاروں کی تحریروں میں سکول، کالج اور یونیورسٹی کیمپس کی دلآویز تصویریں ملتی ہیں۔ دورِ جدید میں تو یونیورسٹی کیمپس، اور اس کی سیاست اور پروفیسروں اور سکالروں کی باہمی چشمک رقابت، کینہ پروری، اکاڈمک اور گھریلو زندگی پر کافی لکھا گیا ہے اور جس طرح انیسویں صدی کے افسانوی ادب میں سکول ٹیچر کے اچھے خاکے ملتے ہیں اسی طرح بیسویں صدی کے ادب میں کالج پروفیسر ایک دلچسپ افسانوی کردار کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اردو میں کالج کے زمانہ کی رومانی زندگی کی تصویریں ملتی ہیں لیکن سکول ٹیچر، پروفیسر، اور یونیورسٹی کیمپس پر ابھی تک کوئی بھرپور تخلیق سامنے نہیں آئی۔ عصمت کی ٹیڑھی لکیر میں سکول اور کالج کی زندگی کی عکاسی البتہ قابلِ تعریف ہے۔ گو بھرپور نہیں،

اردو ہی میں نہیں بلکہ گجراتی میں بھی جدیدیت کے ساتھ یہ مسئلہ پیدا ہوا تھا اور
آج بھی ہے کہ جدیدیت کو یونیورسٹی کے نصاب میں کیوں شامل نہیں کیا جاتا۔ شاعر
تو ہمیشہ شعر کو مدرسہ میں لے جانے کا مخالف رہا ہے۔ یہ ہمارے زمانہ کی ستم ظریفی نہیں
تو اور کیا ہے کہ وہ یونیورسٹی سے اس لیے ناخوش ہے کہ اسے نصاب میں شامل نہیں کیا
جاتا۔ یہ ادب کو اکاڈمک بنانے کی طرف پہلا قدم ہے۔ ادب تو اکاڈمی کے باہر لوگوں کے
دلوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ ادب تو کبھی بھی ادب کے طالب علموں کی میراث نہیں رہا۔ مذہب
ہی کی طرح وہ سب کی میراث ہے اور جو سب کی چیز ہے۔ مدرسہ کا نصاب کیسا ہونا چاہیے
یہ ایک اکاڈمک مسئلہ ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مسئلہ کا فنکار کی تخلیقی سرگرمیوں
اور ادب کے مسائل سے کیا سروکار ہے۔ آج اردو ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر کے لکھنے والے
ادیب اور شاعر، کالجوں میں ملازم ہیں۔ اس سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ یہ
صورت حال اتنی نئی ہے کہ ابھی اس کے تمام پہلو سامنے نہیں آئے لیکن ادھر ادھر مختلف
مضامین میں ان پر اشارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میں A POETIN RESLDENCE یا
CHAIROFPOETRY کی بات نہیں کر رہا بلکہ جیسے سپنڈر نے CAMPUS
ANDMUSE کا عنوان دیا ہے اس کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ ادیب کو روزی روزگار
تو کمانا ہی ہے اور ایک نظر سے آپ دیکھیں تو یونیورسٹی کی ملازمت دوسرے پیشوں کے
مقابلہ میں اس کی ذہنی سرگرمیوں میں کم ہی حائل ہوتی ہے۔ لیکن یونیورسٹی بھی ایک ادارہ ہے
اور ہر ادارہ کی طرح وہ ادیب کے لیے ADJUSTNENT کے بہت سے مسائل پیدا کرتا
ہے۔ ہر ادارہ میں ادیب کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اپنے ذہنی اور تخلیقی ارتباط کے تحفظ کا
مسئلہ ہے۔ یونیورسٹی عموماً سماج کے NORMS کا آئینہ ہوتی ہے اور سماج کے ساتھ فنکار کا
رشتہ عموماً جھگڑے کا رشتہ ہوتا ہے۔ تعلیم میں OBJECTIVITY کس حد تک ممکن
ہے یہ کہنا مشکل ہے اور تمام دنیا میں کیمپس پر طالب علموں کی بے چینی کی ایک وجہ یہ بھی ہے
کہ یونیورسٹی عموماً ان سماجی اقدار کی ترویج کا ذریعہ بنتی ہے جو نوجوانوں کو پسند نہیں۔ سماجیات
کا شعبہ خصوصاً اس افراتفری کا بری طرح شکار ہے۔ اشتراکی سماج اشتراکی اقدار سے اور
بورژوا سماج بورژوا اقدار سے کٹ کر جیسے بھٹکتا ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں پاکستانی
ڈکٹیٹروں کا عتاب سماجیات کے پروفیسروں پر ہی نازل ہوا تھا کیوں کہ سماجیات اور

قوم کے اسلامی تصورات کو قبول نہیں کرتے تھے۔ ریاست اپنی آئیڈیولوجی کی تنقید کو مشکل ہی سے
برداشت کرتی ہے۔ لہٰذا آزادی کا وہ تصور جو فنکار کو عزیز ہے۔ لبرل اور جمہوری سماج میں
ہی پنپ سکتا ہے۔ آمرانہ ریاست کی احتسابی کارروائیاں اس کلچر کے لیے سمِ قاتل ثابت
ہوتی ہیں جو آزاد ذہنی فضا کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ نازی ہی تو کلچر کا نام سنتے ہی آمروں کے بدن
میں پھریریاں آنے لگتی ہیں۔ فاشی ریاستیں تو کلچر کا گلا ہی گھونٹ دیتی ہیں۔ زیادہ روشن
خیال ریاستوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کلچر ان کے سایۂ عاطفت میں پنپتا رہے۔ یعنی کلچر
کی پوری رہبری وہ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہیں اور کلچر گلی کوچوں، چوراہوں اور میدانوں کی
بجائے بیوروکریسی کی میز پر پیدا ہونے لگتا ہے۔ ناولوں اور ڈراموں کے منصوبے بنائے
جاتے ہیں۔ بیوروکریسی کی تجربہ گاہوں میں رجحانات کے صحت مند یا غیر صحت مند ہونے
کے، حقیقت نگاری کی ایک خاص قسم کے مفید یا غیر مفید ہونے کے، ہیئت پرستی کے
سماج دوست یا سماج دشمن ہونے کے مسائل کی چیر پھاڑ کی جاتی ہے اور پھر وہ نسخے تجویز
کیے جاتے ہیں جس سے ایسا کلچر پیدا ہو جو بیوروکریسی کو اور اس کی وساطت سے ریاست کو
پسند ہو۔ گویا بیوروکریسی کی کوشش ہی یہ ہوتی ہے کہ فنکار کو ٹھوک ٹھوک کر کسی نہ کسی
طرح کنفورمسٹ بنایا جائے۔ لبرل اور جمہوری ریاستیں بھی ان رویوں سے بالکل پاک
نہیں رہی ہیں۔ لیکن ان ریاستوں میں چونکہ فنکار کو گفتار اور کردار کی آزادی زیادہ حاصل
رہی ہے اس لیے فنکار ان رویوں کے خلاف بھرپور احتجاج بھی کرتا رہا ہے جس کی تازہ ترین
مثال یونسکو کا وہ مضمون ہے جو دسمبر [illegible] کے انکاؤنٹر میں یونسکو کی ان کوششوں کے
خلاف احتجاج ہے جو فنکار کی علیحدگی کو دور کرنے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ فنکار سماج کا وہ
آدمی ہے جو حقیقت جیسی کہ وہ ہے اسے پیش کرتا ہے۔ چونکہ یہ پیشکش کسی جالبِ منفعت
کی خاطر نہیں ہوتی اسی لیے سچی، بے باک اور جھنجھوڑنے والی ہوتی ہے۔ ویسے بھی سماج
کا دانشور طبقہ بڑی حد تک عصری صورتِ حال سے غیر مطمئن ہوتا ہے، اور یہ اس کی
بے اطمینانی ہی ہے جو سماج کو اپنی حالت، اپنے نصب العین اور اپنی کارکردگی کا لمحہ بہ لمحہ
جائزہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک بے باک، روشن ضمیر دانشور طبقہ کی تنقید، انحراف اور
بغاوت سماجی صحت کے لیے ضروری ہے۔ ادب اور آرٹ کی تاریخ آپ کو بتا دے گی کہ
فنکار عموماً مروج اور رسمی سماجی رویوں کے خلاف ہی رہا ہے اور اس کی یہ کشمکش اور

برہمی کا نتیجہ ہمیشہ سماج کے لیے سودمند ہی نکلا ہے۔ فنکار کو کٹھ پتلی بنانے کا مطلب ہے اسے سماجی تنقید کی قوت سے محروم کر دیا جائے۔ پھر تو لوگ یہی محسوس کرنے لگیں گے کہ جو کچھ ہے وہ ٹھیک ہے اور کہیں تبدیلی، بہتری اور اصلاح کی ضرورت نہیں۔ اکثر و بیشتر تو سماجی صورت حال سے غیر اطمینانی کا جذبہ اتنا موہوم، پیچیدہ اور مبہم ہوتا ہے کہ اسے خالص منطق کی زبان میں پیش تک نہیں کیا جا سکتا۔ ادب اور آرٹ ایسے ہی جذبات کو قوت گویائی عطا کرتا ہے۔ اسی لیے ریاست جس قدر سرکش شاعروں اور فنکاروں سے گھبراتی ہے اتنی صحافیوں اور سیاسی نکتہ چینوں سے نہیں گھبراتی۔ وجہ یہ ہے کہ شاعر احساس کو زبان عطا کرتا ہے اور احساس کو نہ تو جھٹلایا جا سکتا ہے نہ اس کے خلاف جنگ کی جا سکتی ہے۔ ایک صحافی اور سیاسی آدمی کو تو منطقی دلائل اور حقائق سے قائل بھی کیا جا سکتا ہے لیکن فنکار کے احساس کی صداقت کے سامنے بیوروکریٹ کی پوری منطق دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ شاعر کا کلام پڑھ کر لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے بے زبان جذبات کو اس نے زبان عطا کی ہے۔ اور وہ احساسات جن کی نوعیت اور ماہیت کو وہ سمجھ نہیں پاتے تھے اب ان کے سامنے نہایت صاف اور تکیلی شکل میں آ گئے ہیں۔ وہ شاعر کے جذبہ کی صداقت کو محسوس کرتے ہیں اور یہ احساس ہی ان کا حاصل ہے اور اسی لیے وہ منطق اور فلسفہ کی سطح پر بیوروکریٹ سے الجھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ محسوس کر رہے ہیں وہ سچ ہے اور کوئی منطق ان کے احساس کو جھٹلا نہیں سکتی۔ سٹیفن سپینڈر نے اپنی کتاب "نوجوان باغیوں کا سال" میں زیکوسلاوکیہ کے ان پروفیسروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے کافکا کا دن منایا۔ یہ جشن حکومت کے خلاف گویا بغاوت کا آغاز تھا۔ اشتراکی آمروں نے کافکا کے مطالعہ پر پابندی لگا دی تھی۔ وجہ فرسودہ غیر صحت مند عناصر والی بیان کی جاتی تھی۔ زیکوسلاوکیہ کے دانشوروں کے لیے کافکا کی مشکل اور پیچیدہ علامتیں روزمرہ کی حقیقت میں بدل گئی تھیں اور اس کی تحریریں ایسی بھرپور حقیقت بیانی کی حامل معلوم ہوتی تھیں جن کی ایک ایک پیشین گوئی لفظ بہ لفظ صحیح پڑ رہی تھی۔ THE PENAL SETTLEMENT جیسی کہانیاں اس پولس سٹیٹ کی پیشین گوئی تھیں جسے آمر ریاست دنیا کے نقشہ پر جگہ جگہ قائم کرنے والی تھی۔ کافکا کی تحریروں میں دانشوروں کو اپنی صورت حال کا عکس نظر آیا اور صاف بات ہے

کہ حکومت دانشوروں کے اس رویّے سے خوش نہیں تھی۔ حکومت تو یہی چاہتی تھی کہ لوگ ایسی
تحریریں لکھیں اور پڑھیں جو موجودہ صورتِ حال سے عدم اطمینانی کا اظہار کرتی ہوں۔ یعنی
جو نہ پیچھے کی طرف دیکھتی ہوں نہ آگے کی طرف بلکہ ماضی اور مستقبل سے بے نیاز حال کو جاری
و ساری رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ماضی اور مستقبل سے آدمی اسی وقت بے نیاز ہو
سکتا ہے جب اس سے اس کا یقین اور عقیدہ چھین لیا جائے۔ کسی یقین اور عقیدہ کی عدم
موجودگی میں آدمی حال کے دھارے پر بہتا جاتا ہے وہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں سے چلا ہے
اور کہاں جا رہا ہے۔ یہ سوال کہ وہ کہاں جا رہا ہے اس کی جد و جہد کی منزل کونسی ہے اس کا
مقامِ آرزو کیا ہے، بیوروکریٹ کو ہمیشہ پریشان کرتا ہے کیونکہ منصب کے اعتبار سے اس کا
کام محض حال کو جاری رکھنا ہے۔ کلچر ایسی فضا میں پیدا نہیں ہوتا۔ تہذیب کی تخلیق
کے لیے ضروری ہے کہ آدمی زمان و مکان میں حرکت کرتا ہو اور اپنے ماحول اور اپنے گرد و
پیش میں ڈوبا ہوا ہو۔ ایسا آدمی یہ سوال ضرور کرےگا کہ وہ کہاں سے چلا ہے اور کہاں
جا رہا ہے۔

فنکار جو کلچر کا خالق ہے آج ریاست، بیوروکریسی اور اکاڈمی کے بیچ گھرا ہوا ہے
جو بزعم خود کلچر کے سرپرست، محافظ اور مفسر بنے بیٹھے ہیں۔ اگر فنکار سماج کے
NORMS کے مطابق کام کرتا ہے تو بیوروکریٹ کو اس سے کوئی شکایت نہیں۔
خالص سماجی، وطنی اور قومی شاعری اس کے لیے کوئی مسائل پیدا نہیں کرتی لیکن فنکار نے
اگر ایسی باتوں کا ذکر کیا جو سماج کے مروجہ عقائد یا نصب العین کے خلاف ہے تو بیوروکریٹ
اس سے پوچھ سکتا ہے: "میاں تم کون سے غم میں دبلے ہوتے جا رہے ہو" اس سوال کا
خیام سے لے کر غالب تک کسی کے پاس جواب نہیں رہا۔

تعلیم اور ادب پر غور کرتے ہوئے جو مسئلہ اہلِ فکر کے لیے آج کل زیادہ توجہ طلب
بنا ہوا ہے وہ پروفیسروں کے تدریسی، تحقیقی اور تنقیدی کاموں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس
مسئلہ کا کوئی خوشگوار حل ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ آر۔ ڈی۔ نائمبی نے بتایا ہے کہ اکثر اعلیٰ
تحقیقی اور علمی کام کرنے والوں کے لیے تدریسی ذمہ داریاں قدر عن خاطر ہوتی ہیں۔ نصاب،
روزانہ لکچروں کی تیاری، کاپیوں کی جانچ، امتحان کے پرچے اور یونیورسٹی کے دوسرے
معمولات میں گھرا ہوا شخص تحقیقی اور تخلیقی کام نہیں کرسکتا۔ چنانچہ بہت سے لوگ

جلد ہار کر یونیورسٹی سے الگ ہو کر اصل کام دور رفتہ رفتہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ بزرگوار ان کے تحقیقی کام میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یونیورسٹی اور طلبا اعلیٰ دماغوں کے فیض سے محروم ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف ضروری نہیں کہ ایک اچھا محقق عالم اور ناقد اچھا مدرس بھی ہو۔ ہو سکتا ہے لیکن ایسا امتزاج بہت عام نہیں۔ اگر ہو بھی تب بھی اس کا علمی اور تحقیقی کام کچھ اس نوعیت کا ہو سکتا ہے کہ متعلقہ نصاب سے اس کا تعلق بہت دور کا رہ جائے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پروفیسر کا ذہن کسی اور ہی مسئلہ کی چھان بین میں الجھا ہوتا ہے اور اسے کلاس میں جو کچھ پڑھانا ہوتا ہے اس کے لیے وہ ضروری ذہنی تیاری نہیں کر پاتا۔ اگر کر بھی پائے تو وہ اتنی پر شوق نہیں ہوتی کہ طلبا میں جوش و ولولہ پیدا کر سکے۔ ایسی صورت میں لکچر میکانکی اور فرض منصبی سے سبکدوشی کا بہانہ بنتا ہے۔ یہ صورت حال آج کل بہت عام ہے چنانچہ آئے دن ہم یہ سنتے رہتے ہیں کہ جن پروفیسروں کے علم کا ڈنکا چاروں اور بجتا ہے ان سے طالب علم بہت خوش نہیں ہوتے۔ ہمیں اس تضاد پر حیرت ہوتی ہے لیکن ہم پروفیسروں کی تحریروں سے مرعوب ہوتے ہیں جب کہ طالب علموں کو اس غیر دلچسپ میکانکی تقریروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اس مسئلہ کا ایک حل یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ایسے تحقیقی ادارے قائم کیے جائیں جہاں محقق اپنا کام زیادہ سکون سے کر سکیں۔ لیکن اس صورت میں یونیورسٹی جو علوم متداولہ کا گہوارہ ہوتی ہے علمی اور تحقیقی کاموں سے محروم ہو کر محض تدریسی ادارہ بن جائے گی۔ یونیورسٹی کا کام محض رسمیہ تدریسی ہی نہیں بلکہ علمی تحقیق بھی ہے۔ ہمارے یہاں کی اکثر یونیورسٹیاں محض نصاب مرتب کرنے اور امتحان لینے کا کام کرتی ہیں۔ ان میں ایک بھی ایسی عالمانہ تحقیق یا مفکرانہ کارنامہ سرانجام نہیں پاتا جس پر دنیائے علم و ادب فخر کر سکے۔ پروفیسر کا صرف مدرس بن کر رہ جانا بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے اسے دنیائے علم کا پیرا کی اور دشت خیالات کا سیاح ہونا چاہیے، تاکہ طلبا میں حصولِ علم کا جذبہ ماند نہ پڑے۔ محض تدریس تدریسی طریقہ کار کی پابند ہو کر بالآخر میکانکی بن جاتی ہے۔ مدرس کے ذہن کو بہت جلد زنگ لگ جاتا ہے کیونکہ علم و ادب نوعیت کے اعتبار سے ہی ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر مدرس یہ چیلنج قبول نہیں کرتا اور ہو اور شوق کو ہر لحظہ مہمیز نہیں کرتا اور زبان و ادب اور فکر و نظر کی نئی نئی جولانگاہوں کی تلاش نہیں کرتا تو زندگی بھر کے لیے فرسٹ

ولیم کالج میں قید ہو جاتا ہے کہ اسے پچیس سال تک یہ بہر پھر پڑھانا ہے اور نوٹ تیار ہیں۔ ہمارے یہاں زبان و ادب کے اساتذہ کی ذہنی پس ماندگی کا یہ عالم ہے کہ کسی دوسری زبان یا اس کے ادب سے واقفیت تو درکنار خود اپنی زبان کے ادب اس کے رجحانات و میلانات، نئی کتابوں اور نئے رسالوں تک سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے یہ بات یاد رہے کہ ہمارے ملک کی زبانیں گوناگوں وجوہات کی بنا پر علم و ادب کا ایسا معیاری خزانہ نہیں رکھتیں کہ وہ کسی فرد کو زندگی بھر کام لگا رہے۔ پہلے بھی علما اپنی زبان کے علاوہ عربی اور فارسی زبانیں جانتے تھے اور دینیات اور تاریخ سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ اب لے دے کر اساتذہ صرف اردو تک محدود ہو گئے ہیں۔ ملک کی دوسری زبانوں کے اساتذہ کا بھی یہی عالم ہے۔ اپنی کارکردگی کے اولین زمانہ میں وہ تحقیق سے شغف پیدا کرتے ہیں، لیکن یہ شغف ڈاکٹریٹ کا مقالہ پورا ہوتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی دوسرا مقالہ یا تحقیقی کارنامہ معرضِ وجود میں نہیں آتا۔ ایسے مقالے اکثر محض ڈگری کی ضرورت کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ ان کے موضوعات بھی ایسے ہوتے ہیں جو محقق کو آسانی سے دستیاب مواد کی فراہمی سے آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ زیادہ تر حصہ تنقید و تبصرہ کا ہوتا ہے اور ایم۔ اے پاس نوجوان اساتذہ کا ذہن اس کام کے لیے ابھی تیار نہیں ہوتا، لہٰذا ایسے مقالوں کا تنقیدی حصہ حد درجہ ناکارہ، رسمی اور سطحی ہوتا ہے۔ محض مواد کی فراہمی، ترتیب اور درجہ بندی تحقیق نہیں ہے۔ مقالوں میں اگر کوئی THESIS نہیں ابھرتا تو ان پر THESIS کے نام کا اطلاق بھی مناسب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے بے شمار تحقیقی مقالے ہمارے ادب کی تحقیقی اور تنقیدی روایت کا حصہ نہیں بن سکے۔ رطب و یابس کی بھرمار، تحقیقی طریقۂ کار سے عدم واقفیت، THESIS کی عدم موجودگی، اور تنقیدی نظر کی کم مائیگی نے ان بے شمار مقالوں کو اعلیٰ علمی کارنامے بننے نہیں دیا۔

اساتذہ تحقیق سے تھک جاتے ہیں تو تنقید پر چھپٹتے ہیں لیکن تنقید مکتب کی چیز نہیں۔ سیاادب سے براہ راست دانشورانہ لین دین کا نتیجہ ہوتی ہے۔ تنقید کوئی دھندا نہیں کام نہیں، فرض منصبی نہیں، ہر آدمی کے لیے ضروری نہیں کہ وہ محقق ہو، عالم ہو، پروفیسر یا استاد ہو، لیکن ہر آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ نقاد بننے کی کوشش کرے تاکہ خراب کو اچھے سے اور اسفل کو اعلیٰ سے الگ کر سکے۔ لہٰذا آدمی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی ہو جہاں اسے اپنی زبان یا ادب اور تہذیب سے واقفیت ضروری ہے اور یہاں اس کے لیے ایک ایسے ناقدانہ شعور کی تربیت

بھی ضروری بن جاتی ہے جو اس کی واقفیت کو قابل قدر بنائے۔ اعلیٰ تعلیم کی سطح پر ناقدانہ شعور کی تربیت تو ایک نہایت ہی ضروری عنصر ہے۔ صاف بات ہے کہ اس کام کے لیے صرف اپنے ادب سے واقفیت کافی نہیں کیونکہ تنقیدی بصیرت کے لیے جہاں دوسری زبانوں کے ادب سے تقابلی مطالعہ ضروری ہے وہیں دوسرے علوم سے واقفیت بھی ناگزیر ہے۔ مخصوص شعبۂ علم میں تخصیص مہارت کے بغیر اب کام نہیں چلتا۔ تخصیص ہمارے زمانہ کی امتیازی خصوصیت ہے، لیکن تخصیص سے اس علمی آفاقیت کو بڑا نقصان پہنچا ہے جو ذہنی کلچر کی اہم صفت تھی۔ اور یونیورسٹی تعلیم جس پر زندہ رہتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے زمانہ میں علوم کی اتنی افراط ہے کہ تمام علوم میں یکساں ملکہ پیدا کرنا ممکن نہیں رہا اور کسی ایک علم میں خصوصی ملکہ نہ ہو تو آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔ لیکن دوسرے علوم سے عدم واقفیت نے بھی پڑھے لکھے طبقہ میں ایک عجیب قسم کی جہالت کا احساس پیدا کر دیا ہے اور آدمی محسوس کرتا ہے کہ ایک شعبۂ علم میں سب کچھ جاننے کے باوصف وہ دوسرے علوم سے اتنا ناواقف ہے کہ خود کو جاہل محسوس کرتا ہے۔ اس صورت حال کا تدارک ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔ سائنس دانوں کو ادب اور ادیبوں کو سائنس پڑھانے کی باتیں ابھی بھی بہت عام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ یونیورسٹی میں اساتذہ کی صف میں محض محققوں کو دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک محقق طبعاً اور مزاجاً ایک اچھا استاد نہیں ہوتا۔ اس کا تنقیدی شعور صفر ہوتا ہے اور ادبی مذاق غیر معتبر۔ وہ مخطوطات کا کیڑا ہوتا ہے اور تعلیم کے رومانس کو ایک تھکا دینے والے ORDEAL میں بدل دیتا ہے۔ وہ طالب علموں کے تنقیدی شعور کو تیز اور ان کے تخیل کو مہمیز نہیں کرتا۔ یہ باتیں بڑی حد تک درست ہیں۔ لیکن اسے ہم ایک کلیہ کا روپ نہیں دے سکتے۔ ہمیں اس مفروضہ پر ہی کام کرنا ہوگا کہ ایک محقق بھی اتنا ہی اچھا استاد ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک نقاد یا شاعر یا افسانہ نگار۔ شرط یہ ہے کہ کلاس روم میں آدمی ایک اچھے استاد کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ تدریس کے اپنے تقاضے ہیں۔ تدریسی لکچر توسیعی لکچر سے مختلف ہوتے ہیں۔ تدریس ایک خوشگوار امتزاج ہے۔ تحقیق، اسکالرشپ، تنقید اور تقریر کا یہ امتزاج جتنا گراں مایہ ہے اتنا ہی کمیاب ہے۔ غیر دلچسپ لیکن پُر مغز لکچر، دلچسپ لیکن بے مغز لکچر سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔ لکچر اگر دلچسپ اور پُر مغز ہو تو نہایت پر وقار۔ اگر ایسا نہیں تو وہ بڑا محقق اور نقاد ہوا بھی تو اپنے طالب علموں کے لیے بیکار ہے۔ ایک محقق ہی کی مانند نقاد کی تخلیقی سرگرمیاں بھی اسے منصب

غیر متعلق اور کلاس روم سے بے پروا بنا سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے ایک استاد کو پہلے ایک اچھا استاد ہونا چاہیے پھر کچھ اور۔ لیکن یہ خیال بھی کچھ بہت اچھا خیال نہیں ہے کیونکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اچھا استاد ہونے کے لیے آدمی کے لیے محض استاد ہونا بھی کافی نہیں تاوقتیکہ وہ اچھا اسکالر نہیں بنتا اچھا استاد بھی نہیں بن پاتا۔ مسئلہ کا حل انفرادی ہے۔ تدریس و تحقیق و تنقید میں توازن قائم کرنا چاہیے اور کسی ایک کی قیمت پر دوسرے کو حاصل کرنا خسارے کا سودا ہے۔

ادب کے اساتذہ کا ادب کی سرپرستی، نگہداشت اور رہبری کرنا بہت سوں کو پسند نہیں آتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کام کے لیے اساتذہ دوسروں سے زیادہ اہل ہوتے ہیں کیونکہ دوسروں کے مقابلہ میں انھیں ادب پڑھنے اور پڑھانے کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن مدرسہ سے نکلی ہوئی تنقید پھر مدرسانہ ہوتی ہے اور یہی چیز لوگوں کو برگشتہ خاطر کرتی ہے۔ یہاں سوال انفرادی صلاحیت کا نہیں بلکہ پورے طریقۂ کار کا ہے۔ ایک اچھے استاد کی صفات تنقیدی مضامین میں عیوب بن جاتی ہیں۔ کلاس روم نوٹ بڑی قابل قدر چیز ہے لیکن اس کی اہمیت کلاس روم میں ہی ہوتی ہے۔ اس لیے کلاس روم نوٹ کی بنیاد پر اچھا تنقیدی مضمون تیار نہیں کیا جا سکتا۔ طالب علم بہت سی وہ باتیں نہیں جانتے جو ادب کا ایک ذہین قاری جانتا ہے۔ جو چیز طالب علم کے لیے مفید اور ضروری تھی وہ ادب کے قاری کے لیے کوفت انگیز بن جاتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ نقاد اپنے مضمون میں خواہ مخواہ اسے غیر دلچسپ لکچر پلا رہا ہے۔ تنقید میں جب تک کوئی نئی اور فکر انگیز بات نہ کہی جائے تنقید اچھی نہیں بنتی۔ تدریس کے لیے یہ ضروری نہیں۔ مدرس کے لیے بھی نئی باتوں سے واقفیت ضروری ہے لیکن چونکہ اس کے پاس ہر سال طالب علموں کی ایک نئی کھیپ آتی ہے اس لیے پرانی لیکن اہم باتوں کو دہرانا، تاریخی حقائق کا ورد کرنا اور ضروری لیکن سکہ بند اور بندھی ٹکی معلومات فراہم کرنا اس کے لیے عیب نہیں۔ تنقید میں یہ باتیں عیب شمار کی جائیں گی۔ پھر کلاس روم ہم جیسی کی جولانگاہ نہیں۔ کلاس روم حد درجہ منفرد اور ایک معنی میں بظاہر اٹکل اور چونکا دینے والے خیالات بیان کرنے کا مناسب مقام نہیں۔ آپ کلاس روم میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں غالب کو ایک تملق پسند آدمی سمجھتا ہوں، یا اقبال چونکہ علامت پسند نہیں تھے اس لیے بڑے شاعر نہیں تھے۔ یا کرشن چندر محض پروپیگنڈسٹ تھا یا منٹو محض نکلا اور جنس زدہ تھا یا بیمار اور اختلاط پسند تھا۔ یہ باتیں آپ تنقید میں کہہ سکتے ہیں کیونکہ تنقید میں آپ کو صرف

اپنے نظریوں کو ثابت کرنا پڑے گا بلکہ آپ کو ان لوگوں کا سامنا بھی کرنا پڑے گا جو آپ کے دعووں کی سخت اور مدلل توڑ تردید کے لیے کمربستہ ہیں۔ میدانِ تنقید میں آپ کی تردید کرتے وقت کوئی آپ کی پروفیسرانہ شان کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھے گا۔ لیکن کلاس روم میں مدرس کو عموماً ایسی تردید کا کوئی خدشہ نہیں ہوتا۔ مدرس کی شخصیت وکیل، جج اور پولیس انسپکٹر تینوں کی شخصیت کا امتزاج ہوتی ہے۔ وہی دعویٰ پیش کرتا ہے وہی فیصلہ کرتا ہے اور وہی سزا دیتا ہے۔ کلاس روم میں مدرس ہمہ داں، ہمہ بیں اور ہمہ گیر بن جاتا ہے۔ وہ ہر بات خود اعتمادی سے اور مرعوب کن طریقہ پر کہتا ہے۔ طلبا اس کی تقریر کے نوٹ لیتے ہیں۔ اس کی تمام باتیں کارآمد اور مفید ہوتی ہیں۔ یہ ایک اچھے استاد کی صفات ہیں۔ خراب استاد جو مراعات اسے بطور استاد کے حاصل ہیں ان کا غلط استعمال کرتا ہے۔ وہ طلبا کے سامنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ اگر اسے ترقی پسند یا جدید ادب پسند نہیں، کوئی شاعر یا نقاد پسند نہیں تو ان کے خلاف وہ ایسی الٹی باتیں کرتا ہے کہ ہمارے طلبا کا ذہن جو ویسے بھی پختہ نہیں ہوتا آسانی سے متعصب بن جاتا ہے۔ تعصبات کے حصار مشکل سے ٹوٹتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبا ایک مخصوص ادبی میلان یا ادیب اور فنکار سے اتنے برگشتہ خاطر ہو جاتے ہیں کہ اسے کھلے ذہن سے پڑھ ہی نہیں سکتے۔ کالج اور یونیورسٹی میں سیمینار کی اہمیت اسی وجہ سے ہے کہ استاد اور طالب علم باہم مل کر ایک ایسے موضوع پر تبادلۂ خیالات کریں جس سے وہ دونوں واقف ہوں۔ سیمینار میں ذہین طالب علم باقاعدہ استاد سے ٹکر لے سکتے ہیں اور اس کو اس کے حدود میں رکھ سکتے ہیں۔ خود استاد کے کردار کی تربیت کے لیے سیمینار ضروری ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں سیمینار کا رواج عام نہیں ہے۔ ہمہ داں استاد کا ہیچ مداں طلبا کے سامنے گوہر فشانی کرنا ہماری تعلیم کا مقبول عام طریقہ ہے۔ چنانچہ اساتذہ کا کلاس میں یک طرفہ، متعصبانہ اور معاندانہ احمقانہ باتیں کرنا بھی ہماری درسگاہوں کا عام معمول ہے۔ ایسی باتیں ادب کے سلسلہ میں بھی بے ضرر نہیں تو پھر معاملہ سیاست، مذہب، تاریخ، زبان اور کلچر کا ہو تو اساتذہ کا تعصب کیا فتنے پیدا نہیں کر سکتا۔ ہم ہماری نصابی کتابوں تک کو تعصب اور غلط بیانیوں تک سے پاک نہیں رکھ سکے تو کلاس روم کی بند فضا کی تو بات ہی الگ ہے۔ مختلف فرقوں، ذاتیوں، جاتیوں اور طبقوں سے آئے ہوئے طلبا کی ملی جلی تعداد ممکن ہے اساتذہ کی زبان کو لگام دے۔ لیکن ہمارے اکثر مدرسے ایک ہی فرقے کے طلبا پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بند کلاس

کلاس روم اور بھی بند ہو جاتا ہے۔ ہم آئے دن اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ خصوصاً دیہاتوں کے کالجوں
میں ایک ناتی اور جاتی کے طلبا نے دوسرے ناتی اور جاتی کے طلبا کے ساتھ کیسا بہیمانہ سلوک
کیا ہے۔ کالجوں کو دیہاتی اور صوبائی سیاست کے اکھاڑے بننے دیر نہیں لگتی۔ آپ یہ کہہ سکتے
ہیں کہ ایک ادیب بھی متعصب، فناٹک اور فاشسٹ ہو سکتا ہے لیکن ادب فناٹسزم اور
فاشزم کو آسانی سے برداشت نہیں کرتا۔ ادب کی فضا بے باک تنقید کی فضا ہوتی ہے اور
نقاد اپنے عزیز ترین فنکاروں اور قریب ترین دوستوں کی کوتاہیوں اور لغزشوں تک کو
معاف نہیں کرتا۔ کلاس روم اور سکول کی بند فضا تنقیدی چیرہ دستیوں سے محفوظ ہوتی
ہے اور اس لیے اگر صحت مند نہ ہو تو خطرناک بن سکتی ہے۔ ایک لائق اور سلجھا ہوا استاد
سماج کی بڑی نعمت ہوتا ہے، یہ بات سماج جانتا ہے اور کہتا بھی ہے لیکن اس پر عمل نہیں
کرتا ـــــ وہ حالات پیدا نہیں کرتا جس میں ذہین اور قابل لوگ معلمی کا پیشہ اپنائیں
اور باعزت زندگی گزاریں۔

بہرحال میں ذکر کر رہا تھا اساتذہ کی تنقید کا۔ جس طرح ایک اچھے مدرس کا سبق اچھا
اور دلچسپ ہو سکتا ہے اسی طرح ایک اچھے پروفیسر نقاد کی تنقید مدرسانہ ہونے کے
باوصف اچھی اور دلچسپ ہو سکتی ہے۔ اس کی بہترین مثال ہمارے یہاں خلیل الرحمٰن
اعظمی کی تنقیدیں ہیں۔ اعظمی کی تنقیدیں غیر مکتبی نہیں ہیں لیکن مکتبی تنقید کا اعلیٰ ترین
نمونہ ہیں وہ مکتبی تنقید کی حدود میں رہ کر بہت اہم اور بنیادی باتیں کہہ جاتے ہیں جب کہ
دوسرے نقاد ان حدود میں یا تو گھٹ کر رہ جاتے ہیں یا ان حدود سے باہر تو نکل جاتے ہیں
لیکن مدرسانہ ذہن کو ساتھ ہی لے کر، جس سے اور بھی زیادہ مضحکہ خیز صورت حال سامنے
آتی ہے۔ تنقید کا عام طریقہ وہی متنی، حوالہ جاتی، تشریحی اور توصیفی رہتا ہے لیکن خیالات
اور میلانات سے بھی چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی ہے۔ نتیجہ ایک ایسا مضمون ہوتا ہے جو فرسودہ
معلومات اور سطحی خیالات کا بھدا نمونہ ہوتا ہے۔ تنقید میں نظر اور بصیرت کی بڑی اہمیت
ہے۔ اگر تنقیدی مضمون فنکار اور فن پارے کے بارے میں کوئی نئی اور اہم بات نہیں بتاتا
تو دو کوڑی کا ہے۔ کلاس روم تقریر کے لیے یہ شرط ضروری نہیں۔ استاد اگر موصولہ اور متداولہ
معلومات طلبا تک پہنچا دیتا ہے تو اپنا فرض پورا کرتا ہے لیکن خاطر نشان رہے کہ کلاس
میں ترسیلِ علم کا طریقہ میکانکی نہیں بلکہ بصیرت افروز، تازہ کار اور تخلیقی ہوتا ہے عالمانہ

مہارت لکچرر کی اہم صفت ہوتی ہے۔ تنقید سکالرشپ اور مخصوص علوم کا حسب ضرورت استعمال کرتی ہے جب کہ کلاس روم لکچر میں تنقید کا حسب ضرورت استعمال ہوتا ہے۔ سکالرشپ اور تنقید کا خوشگوار امتزاج اساتذہ میں کم ہی ملتا ہے لیکن طلباء ناقدانہ نظر کی کمی کلاس روم لکچر کے وزن کو کم نہیں کرتی، کیونکہ عالمانہ لکچر کے ذریعہ طلباء بہت ہی کم وقت میں موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں اور موضوع کی زیادہ طالبعلمانہ اور ناقدانہ چھان بین کے لیے وہ ان نقادوں سے فیض یاب ہو سکتے ہیں جن کے کارناموں پر استاد نے مبصرانہ نظر ڈالی ہوتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ ہر استاد کا نقاد ہونا ضروری نہیں لیکن عالم اور فاضل ہونا ضروری ہے، لیکن تنقید کے لیے محض علم و فضل کافی نہیں، بلکہ وہ ناقدانہ بصیرت ضروری ہے جو ادیب اور ادب کے متعلق کسی نئی اور معنی خیز بات کا انکشاف کرتی ہو۔ یہ انکشاف دو صفحوں میں بھی ہو سکتا ہے اور دو سو صفحات میں بھی۔ نقاد کسی موضوع پر سب کچھ کہنے کے بجائے اپنے مضمون کو اپنے مطالعہ کا آئینہ نہیں بناتا بلکہ اسے چند باتیں کہنی ہوتی ہیں، جن کی پیشکش میں اس مطالعہ سے حسب ضرورت فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی لیے اچھا تنقیدی مضمون عالمانہ تفصیلات کا حامل نہیں ہوتا۔ اچھا تنقیدی مضمون عالمانہ مقالہ نہیں ہوتا جس میں ایک شاعر کے متعلق تمام ضروری معلومات جمع کر دی جائیں۔ کسی ادیب یا شاعر کے متعلق آپ کا ذخیرۂ علم اس پر تنقید لکھنے کی مناسب وجہ جواز نہیں ہے گو اس ذخیرۂ علم کے بغیر کوئی نقاد کسی ادیب یا شاعر پر اچھی تنقید نہیں لکھ سکتا۔ اگر یہ ذخیرۂ علم ایسا ہے جو مدرس نے اپنی ذاتی تحقیق سے جمع کیا ہے تو اسے تحقیقی مقالہ کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے لیکن یہ تحقیق اگر محض ثانوی ماخذات پر مبنی ہے تو اسے کلاس روم لکچر کی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ یہی نکتہ وہ مدرس نہیں سمجھتے جنھیں نقاد بننے کا شوق چرایا ہے۔ ثانوی ماخذات سے حاصل شدہ معلومات کو تنقیدی پیرایوں میں پیش کرنے سے آدمی نقاد نہیں بنتا۔ پھر کسی شاعر یا ادیب کی زندگی اور کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ان کے ایسے مقالوں کی قدر و قیمت ان کی تحقیقی چھان بین اور عالمانہ مواد کی فراہمی، ترتیب و تدوین میں ہوتی ہے۔ یہ کام فی نفسہ بہت اہم ہے اور اپنی بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ ایک اچھے محقق کو اپنے اس کام پر مطمئن ہونا چاہیے اور اگر اس میں تنقیدی صلاحیت نہیں، یا اگر وہ فنکار کے کارناموں پر کوئی اہم اور معنی خیز

تنقیدی بات نہیں کہہ سکتا تو اسے مختصر تبصرے پر اکتفا کرنا چاہیے۔ اس نکتہ کا خیال رکھا جائے تو
تحقیقی مقالوں کی وقعت میں اضافہ ہی ہوگا کیونکہ وہ اس غیر ضروری طوالت سے بوجھل نہیں
بنیں جو عموماً فنکار کے کارناموں پر فرسودہ، پیش پا فتادہ اور غبی تنقید کرنے کا نتیجہ ہوتی
ہے۔ سمجھا جاتا ہے ہم نے کیوں فرض کر لیا ہے کہ تحقیقی مقالے کو طویل اور دبیز ہی ہونا چاہیے
حالانکہ اگر تحقیق اہم اور نئی ہو اور صرف پچاس صفحات پر مشتمل ہو تب بھی ڈاکٹریٹ کی مستحق ہے
کتنے موضوعات تو ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی دس سال تک ان پر عرق ریزی کرے تب کہیں جا کر
وہ ان پر دو سو صفحات لکھ سکتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں عموماً تحقیق کے لیے ایسے موضوعات
پسند کیے جاتے ہیں جو فی الحقیقت تنقید کے موضوع ہوتے ہیں۔ بطور تنقید کے بھی
وہ ایسے لمبے تخمیم موضوعات نہیں ہوتے کہ ان پر دبیز مقالے لکھے جائیں۔ ذہین آدمی چند
صفحات میں ان سے نپٹ سکتا ہے۔ ایسے موضوعات پر تحقیقی انداز میں طول طویل تنقیدیں لکھنے
کا مطلب رائی کا پہاڑ بنانا ہے۔ مدرس نقاد یہی کام کرتے ہیں۔ پھر اس قسم کی تحقیق و تنقید
کا ایک ڈھرّا بن گیا ہے۔ امتحان کے پرچوں کی مانند ان کا پیٹرن ایک سا ہوتا ہے۔ آپ پچاس
آدمیوں کو اردو افسانہ پر تحقیق کرنے بٹھائیے اور دیکھیے کہ پچاسوں پچاس ان گپھاؤں میں
چکر لگاتے نظر آئیں گے جہاں وحشی آدمی نے سب سے پہلے کوئی کہانی بیان کی تھی۔ کسی
مزاح نگار پر لکھنا ہوا تو مزاح کی تاریخ یونان اور ایران سے ہوتی ہوئی جنس کی نفسیات
اور جنس کے عضلات کا احاطہ کرتی ہوئی مزاح نگار تک پہنچے گی۔ یہ طریقہ کار عام مقالہ کا
ہے تنقید کا نہیں کیونکہ اچھی تنقید ایک جرّاح کی مانند اس حصۂ جسم پر نظر مرکوز کرتی ہے
جس پر عمل جرّاحی کیا جا رہا ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدرسوں کی تحریریں نہ تو اچھی تنقید
بن پاتی ہیں نہ اچھے مقالے۔ مقالے کے تحت وہ تنقید لکھتے ہیں اور تنقید کے تحت مقالہ
پھر اساتذہ کی ایک مصیبت یہ ہوتی ہے کہ انھیں جس علم میں اختصاص حاصل ہوتا ہے اس
کا جا و بیجا استعمال وہ اپنی تنقیدوں میں کرتے ہیں۔ تنقید میں نظر کی کمی کو علم سے پورا
نہیں کیا جا سکتا، لیکن مدرسی کو نقاد اپنی علمی نمائش کے بہلانے ترازش ہی لیتا ہے۔
چنانچہ اکثر مدرسوں کے مقالے اور کتابیں تاریخ کا پشتارہ معلوم ہوتی ہیں۔ مارکسزم کی
کی طرح اگر کسی پر وجودیت کا بھوت سوار ہو تو اقبال اور غالب تو ٹھیک الیٹس اور مخدوم
میں وجودی فلسفہ تلاش کرنا اس کے لیے مشکل نہیں۔ اقبال پر لکھتے وقت تو فلسفہ تاریخ

اسلامیات، سیاسیات، اقتصادیات غرض کہ ہر علم کا تخصیصی مطالعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہی حال لسانیات اور اسلوبیات کا ہے۔ لسانیات کے استادوں کی تنقید پڑھتے وقت تو ہمیں محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ادب کے متعلق کوئی چیز پڑھ رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ادب کا میڈیم زبان ہے لیکن مصوری کا میڈیم رنگ ہونے کے ناتے ہم پر یہ لازم نہیں آتا کہ ایک تصویر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہم کلر کیمسٹری کا کورس بھی پورا کریں۔ تنقید کا کام ذوقِ ادب اور لطفِ سخن میں اضافہ کرنا ہے۔ میرے نزدیک تو وہ تنقید جو مسرت انگیز نہیں بصیرت افروز تک نہیں ہو سکتی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ بغیر پر لطف بنے تنقید ہمارے لطفِ سخن کو کیسے دوبالا کر سکتی ہے۔ تنقید ادب کی گفتگو ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادب ہی کی طرح ذہن کو شگفتہ کرے۔ مدرسانہ تنقید کی سب سے بڑی کمزوری اس کی متعلق ثقالت ہے ڈرائیڈن، جانسن، ایلیٹ، حالی سب کے یہاں آپ کو اسلوب کا ایسا شگفتہ تنوع نہ ملے گا جس سے مدرس نقاد عموماً محروم رہتے ہیں۔ جانسن اور ایلیٹ نے بھی تنقید تو کس کس کر ہی لکھی ہے لیکن ہمارے مدرس نقاد لکھنے بیٹھتے ہیں تو کس کسے نہیں البتہ شیروانی کے بٹن اوپر تک بند کر لیتے ہیں۔ ہر مضمون چغل کھاتا نظر آتا ہے کہ بند شیروانی میں ازار بند ڈھیلا ہے۔

مدرس کسی ایک موضوع پر کام کرتا ہے یا یوں کہیے کہ تدریس کے سلسلہ میں اسے کسی ایک موضوع پر کام کرنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں اسے جو مواد حاصل ہوتا ہے اس کے خمیر سے مدرسانہ تنقید کی پوری بیکری چلتی ہے۔ نام چاہے جدیدیت کا رجحان ہو یا جدیدیت کی روایت یا جدیدیت کیا ہے، اس میں آپ کو یہی تذکرہ نظر آئے گا کہ شعرا نے مسدس اور مسمط میں کیا کیا تصرفات کیے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہیئت کے تجربات کے سلسلہ میں اس نے جو کام کیا ہے اس کا مواد اس کے پاس تیار ہے۔ اب اگر اسے روایت اور بغاوت پر مضمون لکھنا ہے تو مسدس اور مسمط کی روایت اور تصرفات کو بغاوت بتا کر کام نکالا جا سکتا ہے۔ اردو شاعری میں حب الوطنی پر مضمون لکھنا ہے تو مسدس اور مسمط کا وطنی مواد حاضر ہے۔ دوبارہ تصرفات کا بیان کیجیے اور فنکاری پر گہری نظر ہونے کی سند بھی مل جائے گی۔ غزل میں مضامین کی تکرار پر ہم اعتراض کرتے ہیں۔ لوگوں نے مدرسوں کی تنقید کو غور سے نہیں پڑھا یہاں بھی انگریزی مٹھائی ہی کا عالم ہے۔

ایک نظر سے دیکھیے تو بیچے پہلے مدرسانہ تنقیدی مضامین بلند حوصلہ کام ہو کر رہے کے

—

محض بہانے ہیں۔ لکھنے والوں نے عرب، ایران اور یونان کے ادب اور تہذیب و تمدن
کی تاریخیں لکھ ڈالیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسے اولوالعزم کام ایک آدمی تن تنہا کیسے کر سکتا ہے۔
کلیم الدین احمد نے تو اقبال کی پٹائی کرنے کے لیے کہہ دیا مستشرق نقاد نہیں ہوتا۔ پھر میں ابھی
براؤن اور نکلسن کے بجائے میں کلیم الدین سے نہیں الجھوں۔ لیکن میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں
کہ سکالر کے لیے نقاد ہونا ضروری نہیں۔ اگر ہمارے اساتذہ اس قسم کے بلند پایہ سکالر
ہوتے تو ان کی تنقیدی کم مائیگی سے چشم پوشی بھی کی جاتی۔ آخر سلیمان ندوی، عبدالسلام
ندوی، صباح الدین عبدالرحمٰن کی تنقیدوں پر کون مغز پاشی کرتا ہے حالانکہ انھوں نے
ادب پر کچھ کم نہیں لکھا۔ لیکن ہمارے اساتذہ کے پاس سے دھان پان تنقیدی مضامین
کے مجموعے چھین لیجیے، ان کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔ جس نوع کی باتیں انھوں نے لکھی ہیں
ایسی باتیں تو ندوی لوگ معارف کے اداریوں میں لکھ دیا کرتے تھے۔ ہاں ان کے
پاس تنقید کا وہ جارگون نہیں تھا جس کی مدد سے اساتذہ تنقید کا طلسم باندھتے ہیں
کیا ہمارے پروفیسروں کا کام کالج کے لونڈوں کی طرح انشائیہ کی بہاریں دکھلانا رہ گیا ہے۔

یونیورسٹی میں ادب کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن یونیورسٹی ایک ادارہ ہے، نہایت طاقتور اور اس میں
ٹیوٹر سے لے کر وائس چانسلر تک کی ایک زبردست ہیرارکی ہے جس کی اپنی اندرونی سیاست
ہوتی ہے۔ جو ہر سیاست کی   مانند اتنی تو کم ظرف ہوتی ہے
کہ اساتذہ کی زبانی تعلیم کی اعلیٰ قدروں اور بلند آدرشوں کی باتیں کھلی عیاری معلوم ہوتی
ہیں۔ آپ ادب میں کسی کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک تنقیصی مضمون لکھ سکتے
ہیں۔ لیکن فنکار اگر بڑا ہے تو ایسے مضمون کا نقصان آپ ہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ ادب میں
نقادوں کی تنقیص و تعریف سے کوئی چھوٹا بڑا نہیں بنتا۔ میں کسی نقاد یا فنکار کے خلاف
مسلسل لکھتا رہوں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ نقاد یا فنکار لکھنا بند کر کے سنیاس لے لیگا
لیکن ادارہ کی بات مختلف ہے۔ اس میں خوشامد سے آدمی خوش رہتا ہے اور اختلاف
سے آپ کی ترقی رکوا سکتا ہے یا آپ کو اتنا پریشان کر سکتا ہے کہ آپ زندگی سے بیزار
ہو جائیں۔ ادب میں تو ذرا نومشقوں سے مل کر من ترا حاجی بگویم کا مشغلہ شروع کیا
تو چاروں طرف واویلا ہوتا ہے کہ گروہ بندی اور دھڑے بندی ہو رہی ہے۔ بڑے
فنکار کی تو پہچان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے فن کے ذریعہ گروہ، حلقہ، رجحان اور تحریک سے

بلند ہو کر اپنی ذات سے ایک تحریک اور رجحان بنتا ہے۔ تخلیقِ فن کا جذبہ اپنی ایک
اندرونی طاقت رکھتا ہے اور پانی کی طرح تمام مزاحمتوں اور رکاوٹوں کے بیچ اپنی
راہ آپ پیدا کرتا ہے۔ تخلیق اندرونی URGE ہے جسے کوئی چیز روک نہیں سکتی
نہاں رہیں ہو، سماج بے پروا ہو، رسالے اور ناشر منتظر ہوں تب بھی لکھنے والا لکھتا ہی ہے
کا یہ ہمارے سامنے کا تجربہ ہے، اور یہ بھی ہمارے سامنے کا تجربہ ہے کہ تعلیمی ادارے
اصحاب پروری کا اڈا ہیں۔ آدمی اگر حوصلہ مند ہے تو لکچرار سے ترقی کر کے وائس
چانسلر تو کیا سفیر اور وزیر تعلیم تک بن سکتا ہے اور اس کے لیے میں بے شمار
سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی کنجیاں اٹک سکتی ہیں۔ علم کی طاقت سماجی
طاقت میں بدل جاتی ہے جب کہ فنکار کے فن کی طاقت صرف فن کی طاقت ہی رہتی
ہے اور اس کے ذریعہ وہ کوئی سماجی کام نہیں نکال سکتا۔ آج قربہ تنخواہوں نے
پروفیسروں کو ادب کا اشرافیہ طبقہ بنا دیا ہے ـــــــ ایک ایسی بیوروکریسی جس
کا کلچرل کاموں کے لیے سرکاری بیوروکریسی پورا استعمال کرتی ہے۔ انعامات واکرامات
اس کی سفارشوں پر عطا ہوتے ہیں۔ کتابیں اس کی سفارشوں پر چھپتی ہیں۔ تہذیبی
اداروں میں ملازمتیں اس کی سفارشوں پر دی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
ادب پر اکاڈمی کا غلبہ ہے۔ بے مغز تنقیدوں اور نکمی مکتبی تحقیقوں کے ڈھیر پہ
ڈھیر لگ رہے ہیں۔ جب کہ تخلیقی ادب کو کوئی کوڑیوں کے مول نہیں پوچھتا۔
ایسا لگتا ہے کہ ادیب اب عوام کے لیے کیا لکھتے، ادیبوں کے لیے بھی نہیں لکھ رہے
صرف پروفیسروں کے لیے لکھ رہے ہیں۔ ان کا کام صرف پروفیسروں کی بھٹئی کرنا
رہ گیا ہے۔ عام انسان، عوام، زندگی کا دکھ سکھ اکاڈمی کے باہر ہے۔ ترقی پسندوں
نے اس عام انسانی زندگی سے رشتہ قائم کیا تھا۔ اور یہی ان کی طاقت کا راز تھا۔ جانے
کیوں مجھے فنکار کا وہ تصور پسند ہے جو یا تو جھیل کے علاقہ کا راہب ہے، یا جگمگاتے
شہروں کا آوارہ گرد یا تو اپنی تنہائی کے پہاڑ کو جھیل جاتا ہے یا گھبرا کر اپنی تنگ و تاریک
کوٹھری سے نکلتا ہے تو خود سے بھی زیادہ تنہا چوک کی قحبہ کو پک اپ کرتا ہے۔ ایک
وسیع اور بے نیاز کائنات کا تنہا آدمی ایک گری پڑی چیز میں اپنی تنہائی کا مداوا ڈھونڈتا
ہے۔ اندر سے اتنا خالی ہو کر کیا کوئی ولی بھی خدا کی طرف رجوع ہوتا ہوگا۔ اسی لیے میں

فنکار کی رنڈی بازی کو اکاڈمی سے اس کے ملٹریشن پر ترجیح دیتا ہوں۔ شاعر کا کلام ثقہ استادوں کو سنانے کے لیے نہیں بلکہ چال چوک چوراہا اور شراب خانہ میں پڑھنے کے لیے ہے۔ فیکلٹی نہیں بلکہ کافی ہاؤس فنکار کا صحیح مقام ہے۔ ترقی پسندوں نے مارواڑی سیٹھوں سے نجات پائی تو بوڑھے پروفیسروں کے اسیر ہوگئے۔ جدیدیت مغرب میں ابھرا ہے پیدا ہوئی لیکن اردو والے تو چھٹی کے روز ہی اسے نصاب میں داخل کرانے لے گئے۔ جدید فنکاروں نے پروفیسروں کی کیسی بھگتی کی ہے وہ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو کچھ اور نہ سہی خورشید الاسلام کے ہیڈ بنتے ہی ان کے اسلوب کی تعریفوں کی رطب اللسانی دیکھیے۔ ہم ہمیشہ کہتے ہیں کہ ہمیں مغرب کی نقالی نہیں کرنی چاہیے۔ ہم سے مغرب کی نقالی ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ اس کے لیے گنزبرگ کی طرح شراب خانوں میں شعر سنانے اور ڈائلن تھامس کی طرح فیکلٹی میں ثقہ پروفیسروں کے سامنے فحش لطیفے کہنے کا حوصلہ چاہیے۔

بلراج کومل

خوشبو

ترے لمسِ دستِ حسیں کی
دلآویز خوشبو
تری انگلیوں سے
مری انگلیوں میں گذرتی ہوئی، جب
ہتھیلی میں اتری تو میں نے
اسے دستِ تشنہ
میں پھر اس طرح سے سمیٹا
کہ محفوظ کر لوں گا شاید ابد تک
میں اپنے لیے صرف اپنے لیے تیرا حسنِ شگفتہ
جمالِ درخشاں
گماں ہے حسیں خواب تک میں
نے محسوس تجھ کو کیا، پاؤں سے سر تلک ہو گیا میں منوّر
کفِ آرزو کھولتا ہوں
تجھے آج آزاد کرتا ہوں، بوئے فروزاں
ہواؤں میں، نیلی فضاؤں میں اڑتی پھرو، آسمانوں کو چھو لو۔
ستاروں پہ اترو
عناصر کو ہاتھوں میں لے لو
کہ خوشبو ہو تم، رنگ ہو، روشنی ہو
سنورتی ہوئی، کیفِ عشرت ادائیں، نئی زندگی ہو!!

بلراج کومل

جنگلوں کی ھوا

وقتِ رخصت اداس اور مغموم آواز میں
اس نے مجھ سے کہا تھا:
تمھیں خوبصورت، حسیں دوستوں کی
رفاقت میسّر ہے، میں کون ہوں
میری قربت کی ہر آرزو
صرف مبہم، پریشاں ہے، اک روز آخر مجھے بھول جاؤ گے تم
مجھے یاد کرنا بھی چاہو گے شاید مگر کر نہ پاؤ گے تم
کل کی لگتی ہے برسوں پرانی، یہ بے نام سی داستاں
مجھے خوبصورت حسیں دوستوں کی
رفاقت میسّر ہے، میں روز و شب
جو چھپاتا ہوں، باتوں کے جنگل اگاتا ہوں جن میں مجھے
میرے دشمن، مرے خوں کے پیاسے کئی
جنگلی جانور ڈھونڈتے ہیں
جوئے یادِ حسیں کی روانی میں کوئی سلگتا ہوا عکس ہے
وہ مجھے اپنی جانب
اشاروں سے اکثر بلاتا ہے
مانوس ہے گرچہ لیکن مرا کون ہے؟
آج تحلیل ہوتا ہوں عکسِ رواں، میں، ترے جسم میں۔
جنگلوں کی ہوا
چیختی ہے مسلسل مرے جسم میں!!

عوض سعید

جونک

"یار بہت بڑی خبر ہے" سلیم نے ڈرائنگ روم میں اچانک داخل ہوتے ہوئے کہا۔
"کبھی تم نے اچھی خبر بھی سنائی ہے؟"
"سنو شوکت کی بیوی نے زہر کھا لیا ہے۔ بچنے کی کوئی امید نہیں!"
وہ کرسی پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جیسے سلیم کی بات اس نے سنی ہی نہ ہو۔
"سن رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟"
"میں نے خبر سن لی ہے اب تم جا سکتے ہو۔"
سلیم ہکا بکا بڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔
"مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔ اسے زہر کھانا ہی چاہیے تھا۔"
"مگر کیوں؟ شوکت تو اسے بہت چاہتا تھا۔"
"صرف چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم یہ بات نہ سمجھ سکو گے مجھے بور نہ کرو۔"
یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔
سلیم تھوڑی دیر یوں ہی کھڑا رہا پھر غصہ سے پیچ و تاب کھاتا ہوا باہر چلا گیا۔
جب سلیم چلا گیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ تنہائی پہ دھیرے ہوئے سگریٹ کیس سے گولڈ فلیک کی ایک سگریٹ نکالی اور ایک لمبا کش لے کر سوچنے لگا۔ یہ سلیم سالا ایسی خبریں سنانے سے پہلے مرتا کیوں نہیں۔ مگر یہ شام کچھ اسے دھواں دھواں سی کیوں لگ رہی ہے۔ اسے یہ کیوں احساس ہو رہا ہے جیسے افروز کی بجائے اس نے ز

پی لیا ہے۔
کمبخت نے سارا مزہ کرکرا کردیا۔ رضا کی پارٹی بھی گئی۔ کتنے دنوں بعد جانی واکر پینے کو مل رہی تھی۔ مگر یہ کیا۔ ٹیلیفون بوتھ کی طرف اس کے قدم کیوں اٹھ رہے ہیں۔ آخر یہ چمکیلے شیشوں والا بوتھ کا دروازہ کس نے بھیڑ لیا ہے۔
پُٹ می آن ٹو جنرل ہاسپٹل پلیز!
"جنرل ہاسپٹل ——"
"ہلو —کیا مسز شوکت"
"ہاں وہ بچ نہ سکیں"
وہ کب گھر لوٹا۔ کہاں کہاں کی خاک چھانی اسے کچھ بھی یاد نہ تھا۔
دوسری صبح جب سلیم پھر آدھمکا تو اسے احساس ہوا جیسے وہ اسے مار کر ہی دم لیگا ——
"تم جانتے ہو میں ہائی پر ٹینشن کا مریض ہوں؟"
"ہاں یہ تو عام بیماری ہے۔" سلیم نے بڑی لاپروائی سے کہا
"خاص بیماری کیا ہوتی ہے؟"
"شخصیت سے فرار۔"
"یہ بھی کوئی بیماری ہے؟"
بیماری نہیں مرض —— بہت پیارا اور خوبصورت جس نے تمھیں جکڑ رکھا ہے۔ تم مسز شوکت کی موت پر آزردہ ہو۔ میرے لیے یہی کافی ہے؟"
"کیا بک رہے ہو؟"
مگر سلیم کوئی جواب دیے بغیر چلا گیا۔
"یہ مردود جب بھی آتا ہے۔ اس کا بی پی بڑھ جاتا ہے۔ سالا مرتا بھی تو نہیں ——"
جب وہ ایک طویل عرصے تک اس سے ملنے نہیں آیا تو اس نے پھر ایک بار اطمینان کا سانس لیا۔ پھر کسی نے اسے بتایا کہ وہ یہ شہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکا ہے۔ اسے بھی یقین ہوگیا۔ جو آدمی دید کا بار اٹھانے کے لیے روز اس کے گھر آتا ہو۔ اگر وہ تین سال

کی لمبی مدت تک دآ سے تو اس کا یوں مطمئن ہو جانا واجبی ہی تھا۔ لیکن اس کی خوشی پرپانی پھیرنے کے لیے ایک دن اس نے پھر اس کے گھر دستک دی۔ وہ ان تین برسوں میں ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ماہ و سال کلاس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا ہو۔ آتے ہی اس نے حسب عادت طنز آمیز لہجے میں کہا۔

"حیرت ہے تم ابھی تک زندہ ہو"

"کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ تمھیں اب تک مر جانا چاہیے تھا"

"تم میری جان کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ مرنا اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو پہلے تمھیں مار کر میں مر گیا ہوتا۔"

"مجھے مارنے سے تمھارا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ میری پیدائش خود میرے لیے ایک حادثہ ہے۔"

ٹھیک ہے لیکن تمھارے گناہوں کا کفارہ میں کیوں ادا کروں۔ میری بھی زندگی خود میرے لیے کفارہ بن چکی ہے۔ مزید خون بہانے کی مجھ میں سکت نہیں ہے۔ اس لیے تم جب بھی مجھ سے ملو تو یہ نہ بھولو کہ میں نے بنارمل لوگوں سے ملنا تقریباً ترک کر دیا ہے۔ کیا تم میرے برتاؤ سے یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں تمھیں کتنے فاصلے پر رکھنا چاہتا ہوں۔"

"دوری اور قرب کے زہر کو پہلے ہی پی چکا ہوں۔ اب میرے لیے قرب اور فاصلہ دونوں برابر ہیں۔ مگر میں تو تمھیں یہ کہنے آیا تھا کہ افروز کی قبر کتبہ سے محروم ہے۔ آج تک کسی نے . . . "

"یہ شکایت تمھیں اس کے شوہر سے کرنی چاہیے۔ قاتل کبھی مقتول نہیں ہو سکتا یہ اور بات ہے کہ مقتول قاتل ہی کا ایک روپ ہے۔ ہر مقتول کے ساتھ ایک قاتل وابستہ ہے اور ہر قاتل کے ساتھ ایک مقتول۔"

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی

لیکن حساب بے باق اسی صورت میں ہوتا ہے جب گنتی صحیح ہو۔"
شوکت نے بالکل سچ کہا تھا کہ حساب کے معاملہ میں تم ایک مارواڑی سے بھی آگے ہو۔"

وہ خلافِ توقع چپ ہو کر رہ گیا۔ جب سلیم اسے روندتا ہوا چلا گیا تو اس نے منہ ہی منہ میں ایک موٹی سی گالی دی اور گھر سے بے ارادہ نکل پڑا۔

پھر اچانک ایک سکوٹر اس کے سامنے آکر رک گیا۔ دراصل سکوٹر میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی تھی ورنہ وہ جگہ ایسی نہ تھی کہ اس نوجوان کو بریک لگانے کی ضرورت پیش آتی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے نوجوان کو دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

اب وہ سڑک کے آخری سرے سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ ایک عجیب کشمکش، تناؤ اور بے چینی سے دوچار ——

اس نے سوچا کوئی فلم ہی کیوں نہ دیکھ لی جائے۔ سامنے ایک سینما ہال تھا۔ دس بج چکے تھے شاید فلم شروع ہو چکی تھی۔ مگر بکنگ پر ویرانی برس رہی تھی۔ اس نے ونڈو پر پہنچ کر اپر کلاس کا ایک ٹکٹ خریدا —— سینما ہال میں اندھیرا ڈول رہا تھا۔ مگر پردے پر روشنی تھی۔ ایک خوبصورت نوجوان گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا ڈاکوؤں کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ دس منٹ اپنی سیٹ پر جما رہا۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ مگر اسے یہاں بھی گھٹن کا احساس ہوا۔ وہ سینما ہال سے باہر آگیا۔

تارکول کی لمبی اداس اور گونگی سڑک آج اسے ایک ویران قبرستان کی طرح لگ رہی تھی اور وہ کسی بے جان قبروں کے بیچ اپنے کندھے پر ایک بے نام کتبہ کو اٹھائے چل رہا تھا۔

●●

مظہر امام

کشمیر کی غزلیں

۱

میں جانتا ہوں وہ نزدیک دو دور میرا تھا
بچھڑ گیا جو میں اس سے، قصور میرا تھا
جو پاؤں آئے تھے گھر تک مرے، وہ اس کے تھے
وہ دل بڑھا تھا جو اس کے حضور، میرا تھا
بڑا غرور تھا دونوں کو ہم رکابی پر
نگاہ اس کی تھی، لیکن سرور میرا تھا
کہا یہ سب نے کہ جو وار تھے، اسی پہ تھے
مگر یہ کیا کہ بدن چور چور میرا تھا
وہ آنکھ میری تھی، جو اس کے سامنے نم تھی
خموش وہ تھا کہ یوم نشور میرا تھا

۲

تو ہمہ گوش ہے نے صورت صدا ہو جاؤں
آج تو اپنی تمنا کا خدا ہو جاؤں
میں نے اس جنگ میں کیا کھویا کسی سے کیوں کہوں
مرہم زخم بنوں، اپنی دوا ہو جاؤں
اپنی ہی خاک اڑاتا پھروں ساحل ساحل
میں ترے دریاؤں سے گزروں تو ہوا ہو جاؤں
کیا لکیریں ہیں کہ آتا ہی نہیں موسم قرب
کیا میں سر تا بہ قدم دست دعا ہو جاؤں
تجھ سے پہلی سی عنایت کی توقع نہ رکھوں
اپنے صحراؤں پہ خود ابر سوں، گھٹا ہو جاؤں
اس دورا ہے پہ کھڑا سوچ رہا ہوں کب سے
تجھ سے بچھڑوں کہ زمانے سے جدا ہو جاؤں

۳

روندی ہوئی زمیں تھی نئے رہگزر بھی تھے
وہ تھے تو ان کے ساتھ نقوشِ سفر بھی تھے

آئے یہاں ہم تو لائے ہیں یادوں کے سائباں
سنتے ہیں اس دیار میں یادوں کے گھر بھی تھے

ہم کو ملا تو سایۂ ابرِ سیہ ملا
ورنہ اس آسمان پہ شمس و قمر بھی تھے

اصرار تھا کہ ذکر ہماری طرف سے ہو
ورنہ ہمارے حال سے وہ باخبر بھی تھے

کل کوئی اور کیا ملا، ایسا لگا کہ تم
برسوں کی راکھ تھی، مگر اس میں شرر بھی تھے

۴

یہ کھیل بھول بھلیّوں میں ہم نے کھیلا بھی
تری تلاش بھی کی اور خود کو ڈھونڈا بھی

کبھی تو دیکھتے ہم شہر کا نظارہ بھی
ترے محل میں جو ہوتا کوئی دریچہ بھی

مرا نصیب تھی ہموار راستے کی تھکن
وہ کون تھا جو پہاڑوں پہ چڑھ کے اترا بھی

یہ آرزو تھی کہ یک رنگ ہو کے جی لیتا
مگر وہ آنکھ جو شیطاں بھی ہے فرشتہ بھی

سمندروں سے گہر کب کے ہو گئے ناپید
تمھارے ساتھ میں گہرائیوں میں اترا بھی

برہنگی پہ بھی گذرا قبائے زر کا گماں
لباس پر ہوا جزوِ بدن کا دھوکا بھی

گرجنے والے برستے نہیں، یہ سنتے تھے
گذشتہ رات وہ گرجا بھی اور برسا بھی

۵

زلزلے سب دل کے اندر ہو گئے
حادثے رومان پرور ہو گئے

کشتیوں کی قیمتیں بڑھنے لگیں
جتنے صحرا تھے، سمندر ہو گئے

دھوپ میں پہلے پگھل جاتے تھے لوگ
اب کے کیا گزری کہ پتھر ہو گئے

وہ نگاہیں کیا پھریں ہم سے کہ ہم
اپنی ہی آنکھوں میں کمتر ہو گئے

تم، کہ ہر دل میں تمہارا گھر ہوا
ہم، کہ اپنے گھر میں بے گھر ہو گئے

کر رہے تھے اپنے زخموں کا حساب
کس کے کس کے نام ازبر ہو گئے

۶

اسے حال سے باخبر کیجیے
مگر خود کو بھی معتبر کیجیے

کئی زلزلے آج آنے کو ہیں
تماشائے زیر و زبر کیجیے

زمانے کا بہتا ہوا رنگ ہوں
مرے خون سے ہاتھ تر کیجیے

بہت دور تک ریت ہی ریت ہے
ذرا دعوتِ چشمِ تر کیجیے

کبھی تو ندامت کا احساس ہو
تقاضہ سرِ رہ گزر کیجیے

کہیں بھی اتر جائیے راہ میں
سفر کو بہت مختصر کیجیے

جدائی کے دن ہیں غزل ہی سہی
یہی ایک کارِ ہنر کیجیے

رفعت سروش

سرِ دوشِ کہستاں

ابتدایہ

چھڑا کر قیدِ بے زنجیر سے شہرِ دیاباں کی
سرِ دوشِ کہستاں لے چلی وارفتگی مجھ کو
سفر ہے پستیوں سے رفعتِ افلاک کی جانب
یہ کس منزل پہ لے آئی ہے شوریدہ سری مجھ کو

۱

سبز کہسار کی ڈھلانوں پر
بستیوں کا عجیب ہے منظر
لکڑی اور ٹین کے کھلونوں کے
ڈھیر بکھرے پڑے ہیں وادی میں

۲

صاف شفّاف ابر کے گالے
اڑتے پھرتے ہیں یوں فضاؤں میں
جیسے میرے خیال کے پیکر
جست کرتے پھریں خلاؤں میں

٣

ابر کا اک آوارہ ٹکڑا
وادی کی آغوش سے اٹھ کر
اونچی نیچی چٹانوں سے
سر ٹکرا کر

ہانپ رہا ہے
میری بالکنی میں آکر
اور مری نظروں کے آگے
تنی ہوئی ہے گاڑھی چادر
میں بھی حیراں وہ بھی ششدر
بے چہرہ ہے سارا منظر

٤

ابر کی چادر اتری، روشن ہوا منظر تمام
جگمگا اٹھی ہمالہ کی سنہری، سبز شام

جیسے خوابوں کی حسیں شہزادیاں ہوں رقص میں
دیدنی ہے وادیوں میں ابر پاروں کا خرام

اڑتا آتا ہے مری جانب سرور وجد میں
ابر لایا ہے نہ جانے کس پری وش کا پیام

بادلوں نے مضطرب ہو کر دفورِ شوق میں
برق کی لہروں سے لکھا ہے فلک پر کس کا نام

جانے کب سے وادیٔ خاموش میں رفعت سرِ وش
عظمتِ اوجِ ہمالہ سے ہے سرگرمِ کلام

٥

پہاڑی پھر دوالی کا سماں ہے
زمیں سے آسماں تک سیڑھیاں ہیں
ہر اک سیڑھی پہ ہے جشنِ چراغاں
افق پر دود صیا بادل خراماں

۶

دامنِ ہمالہ میں
جگمگاتی شب کا یہ
دلگداز منظر بھی
کتنا خوبصورت ہے

مخملی چٹانوں پر
یہ گھروں کی زیبائش
روشنی کے زینے پر
جیسے تار بکھرے ہوں
گاہ مسکراتے ہوں
گاہ جھلملاتے ہوں

وادیٔ خموشی میں
ابر کے حسیں پیکر
رقص کرتے پھرتے ہیں
ریشمی دھندلکوں کے
جال بنتے پھرتے ہیں

آسماں کا اک گوشہ
بادلوں کا مسکن ہے

اور دوسری جانب
چاند مسکراتا ہے
دل کو گدگداتا ہے

جگمگاتی شب کا یہ
دلگداز منظر بھی
کتنا خوبصورت ہے

۷

سارا منظر کہر میں لپٹا ہوا
آخری چوٹی پہ لیکن روشنی
چھوڑ کر جیسے زمیں کی وادیاں
آسماں پر خیمہ زن ہے زندگی

۸

سرمئی ۔ زرد ۔ سرخ ، بادامی
بادلوں کے یہ گھلتے بنتے رنگ
ایک پردہ ۔ ہزار تصویریں
دامنِ آسماں پہ کھلتے رنگ

۹

رو چکا ابر ۔ ہو چکی بارش
تن گیا آج دھوپ کا خیمہ
اپنا آنچل سکھا رہی ہے ہوا
اور زمیں دیکھتی ہے آئینہ

۱۰

پھر کھلی دھوپ پہاڑوں کے حسیں دامن میں
تیز کرنوں نے کیا ابر کو پارہ پارہ
دیتی ہے دعوتِ شوق اپنے پرستاروں کو
اپنے گھونگھٹ کو اٹھائے ہوئے کنچن جنگا

۱۱

کئی دن بعد سورج آج نکلا
نکھر آیا ہے ہر منظر کا چہرہ
مگر یہ چند لمحوں کی چمک ہے
اٹھا آتا ہے پھر وادی سے کہرا
دھواں سا پھیلتا جاتا ہے ہر سو
نہیں سورج کو اس بستی پہ قابو

۱۲

بادلوں کے سفید کاغذ پر
ایک ہلکا سا نقش پیڑوں کا
کاش الفاظ کے دھندلکوں میں
میں یہ تصویر پیش کر سکتا

۱۳

سرو صورت، بلند قامت پیڑ
خود پسندی کے خوبرو پیکر
اک عجب شان سے ہیں استادہ
وادیٔ کوہ کی ہتھیلی پر
دھوپ بکھرے کہ بجلیاں کوندیں
ابر برسے کہ کہر چھا جائے
شام لہرائے دود صہبا آنچل
سرمئی رات جال پھیلائے
ان پہ کوئی اثر نہیں ہوتا
ایک ہی شان سے ہیں استادہ

چاندنی ان حسین درختوں میں
نور کے آشیاں بناتی ہے
آسمانوں کی جھلملپری، بارش
سر سے پا تک انھیں نہلاتی ہے
سارے طوفانِ ابرو رنگ و نور
ان درختوں سے کھیلتے ہیں مگر
ان کی عظمت پہ رشک کرتے ہیں
ہیں یہ امن و سکوں کے پیغمبر
وادیوں کے یہ خوبرو فرزند
ہیں نشاں زندگی کی عظمت کے
یہ تنومند، نوجواں اشجار
نقشِ رنگیں ہیں دستِ قدرت کے

۱۴

سکوتِ شب میں پہاڑوں کا دلکشا منظر
تمام عالمِ امکاں ہے جیسے محوِ سجود
نمازِ عشق ادا کر رہا ہے ہر ذرّہ
سرورِ کیف میں بیگانۂ رسوم و قیود
خرد اٹھائے تو کیسے یہ پردۂ اسرار
بلند و پست میں کیوں ہے یہ زندگی کی نمود
پڑھیں نگاہِ بصیرت سے اہلِ دل اسکو
کھلی پڑی ہے کتابِ نوادراتِ وجود
ہر ایک شے ہے رواں عالمِ فنا کی طرف
مگر خیال کی پروازِ شوق لا محدود

۱۵

الوداع اے فضائے دارجلنگ
رخصت آب و ہوائے دارجلنگ
الوداع آسمانِ گوہر بار
رخصت اے وادیِ جنوں آثار
اے فلک بوس چوٹیو! رخصت
اے جنوں خیز باد لو! رخصت
تم سے نسبت رہی ہے خاص مجھے
ورنہ آتی فضا نہ راس مجھے
رخصت اے جگمگاتی بھیگتی رات
نغمہ بردوشِ عالمِ برسات
اے ڈھلانوں کی کہکشاں رخصت
آسماں زیرِ آسماں رخصت
ابر پارو! سلام لو میرا
میں تمھیں بھول ہی نہیں سکتا
وادیوں میں تمھارا حسن خرام
اہلِ دل سے خموش طرزِ کلام
بے تکلف گھروں میں آجانا
اور درختوں پہ رقص فرمانا
یاد آئے گا بار بار مجھے
اور کر دے گا بیقرار مجھے
تم ہو فنکار، تم ہو صورت گر
تم بناتے ہو نت نئے منظر

رخصت اے تلین رنگ کے مسکن
کوہ پیماؤں کے حسین چمن
رخصت اے ماں کی حسین شاموا
چار رستے کے شوخ نظارو
شہر کا روپ کیا نرالا ہے
پتھروں کو تراش ڈالا ہے
نازنینانِ شہر خوش اطوار
خوش ادا، خوش جمال خوش گفتار
بھولے بھالے یہ خوبرو بچّے
ننھے منّے پہاڑی شہزادے
مرد و زن خوش مزاج و شائستہ
ہر گھڑی کام پر کمر بستہ
جی چراتے نہیں ہیں محنت سے
یہ پہاڑوں کی گود کے پالے
جب نظر آئیں گے نہ یہ منظر
سب پھر آئے گا یاد رہ رہ کر

کنور سین

ایک ٹانگ کی گڑیا

اس دن میں بہت اداس تھا۔

اپنے آخری دنوں میں وہ بھی اداس رہنے لگا تھا۔

ان دنوں اس کے بھگتوں کی بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ وہ ان کی طرف دھیان بھی نہ دیتا۔ ان کی بجائے وہ اپنے گھٹنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا۔

میرا خیال تھا اوگھڑ پیر کو اپنے لنگڑا ہونے کا کوئی غم نہیں۔ لیکن اس کے آخری دنوں میں میرا بھرم ٹوٹنے لگا۔ میں اس کی بے چینی کا کارن کھوجتے ہوئے اس کی بائیں ٹانگ کو دیکھتا رہتا۔ وہ بھی اسے ٹٹولتا ہوا اندر ہی اندر ٹوٹتا رہتا۔

پہلے کافی ہاؤس بند ہوتے ہی اپنے گرد اکھٹا ہونے والوں کو دیکھتا ہوا وہ کسمسانے لگتا اس کی زرد آنکھوں میں عجیب چمک آجاتی۔ دن بھر کی خمالت کو جھاڑ کر وہ اپنی بیساکھی کے سہارے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ دو چار قدم لڑکھڑانے کے بعد بڑی روانی سے ناچتا ہوا اپنے دھول بھرے لمبے بالوں کو جھٹکنے لگتا۔ ہماری حیرت بڑھتی جاتی۔ دھیرے دھیرے ہم اس کے ناچ میں کھو جاتے۔ پھر وہ گھڑی آتی جب اس کی آدھی ادھوری ٹانگ بیساکھی میں جذب ہو جاتی۔ ہمیں یقین ہو جاتا ـــــ پیر لنگڑا نہیں ہے اس کی دونوں ٹانگیں سالم ہیں۔ اس کے ناچ میں کوئی کج نہیں۔ وہ زندگی کی تال کو پہچانتا ہے اور اس کی لے پر ناچتا ہے ـــــ

لوگوں کے من کو پڑھتے ہوئے میرے منہ سے نکل جاتا۔

"یہ پہنچا ہوا فقیر ہے۔ بیساکھی کو زندہ ٹانگ بنانے کا گُر جانتا ہے۔"

بھکتوں کو میری بات پہ سر ہلاتے دیکھ کر پیر کی داڑھی مسکرانے لگتی۔ اس میں الجھے تنکے تھرکنے لگتے۔ پیر بیساکھی کو پھینک کر ایک ہی ٹانگ پر ناچنے لگتا اور اپنے بازو آگے کو پھیلا دیتا پھر ہاتھوں کو اوپر اٹھا دیتا۔ جیسے دنیا بھر کے دین دکھیوں کے لیے دعا کر رہا ہو۔

وہ ناچتا رہتا اور اس کا چھوٹے قد کا کتا کوں کوں کرتا ہوا اس کی بیساکھی کو چاٹتا رہتا۔ مجھے وشواس ہو جاتا کہ پیر کو اپنے لنگڑا ہونے کا کوئی ملال نہیں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا وہ اپنے اپاہج ہونے کو وردان سمجھتا ہے۔

یہ بات اس وقت کی ہے جب کانی ماؤس دھرتی پہ تھا۔ پیر اس کے سامنے والے نیم کے پیڑ کے نیچے ڈیرہ ڈالے پڑا رہتا۔ اپنی چیتھڑوں کی پوٹلی اور ٹین کے ڈبے کو پیڑ کی جڑ میں رکھے سگرٹ بیڑی پھونکتا رہتا۔ کانی ماؤس کی طرف دیکھتا ہوا اپنے کو اندر ہی اندر کھوجتا رہتا۔

اس کے گرد بھیڑ کے اکٹھا ہونے میں اس کی نگاہوں کے درد بھرے بیرن کا بڑا ہاتھ تھا۔ لوگ اس میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔ پیر مسکرانے لگتا۔ ہونٹوں پہ پھیلی مسکراہٹ کو نگاہوں کے پھیکے پن میں گھلتے دیکھ کر بھگت شرمانے جانے۔ تبھی پیر صدا لگانے لگتا اور گھیرے آس پاس کو آنکھیں ملتے دیکھ کر میں بول پڑتا ——" یہ صدا نہیں فطرت کے دل کے ناسور کی ہوک ہے"۔

بھکتوں کو مگن ہوا دیکھ کر پیر اپنی پوٹلی سے چیتھڑا نکالتا۔ اسے زمین پر بچھا کر مجھے اس پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا۔

چند ہی لمحوں میں وہ ریزگاری کو سمیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ اسے اپنے میں ڈوبا دیکھ کر لوگ منتیں ماننے لگتے۔ اس کے گھور گمبھیر چہرے کو دیکھتے ہوئے سجدہ کرتے اور اپنے ٹھکانوں کو چل دیتے۔

رات گئے آکاش کی آنکھیں جھپکنے لگتیں۔ پیڑ سسکیاں بھرنے لگتا۔ دھرتی بھی سسکنے لگتی۔ پیر

آنکھیں کھولتا۔ مجھے اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر کہتا:

"تم اس زرد چہرے والے سے ناطہ توڑ لو۔ اس کے پاس کچھ نہیں۔ میرے پاس بھی اسے دینے کو کیا دھرا ہے؟ اس کی میرے لیے سترد ھا بھی اس کا کلیان نہیں کر سکتی۔" مجھے خاموشی سے اپنی بات سنتے دیکھ کر وہ بیڑی سلگا لیتا۔ دو چار کش کھینچنے کے بعد اسے زمین پر مسل دیتا:

تم اس کا مارگ جانتے ہو نہ منزل۔ اس کے انتشار کا ٹھکانہ نہیں۔ ہسپتال کے علاقے میں رہتے رہتے وہ دماغی دق میں مبتلا ہو گیا ہے۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"وہ میرا پرانا بھگت ہے۔ بہت پہلے اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے آئینہ دیکھ کر دحشت ہوتی ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ کہتا تھا آئینے میں پہلے اسے ایک کے دو پھر دو کے چار اور پھر ان گنت چہرے دکھائی دینے لگتے ہیں۔"

"اس کا کارن بھی بتایا ہوگا؟"

"وہ کوئی ڈاکٹر تھوڑی ہے۔ لیکن مجھے پتہ ہے کہ اس پر دق کے زہر کا اثر ہے۔ اس روگ کے مردہ ہیجان نے اس کا دماغی توازن بگاڑ دیا ہے۔ اس کی کسی بات میں ٹھہراؤ نہیں رہا۔ اب وہ کسی پل کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی دن وہ آئینے سے ہی الجھ جائے اور کانچ کے ٹکڑے اس کے رگ و ریشے کو کاٹ ڈالیں۔

"پھر تو اسے بچانا چاہیے۔"

"کوئی کسی کو بچا سکتا ہے؟" پیر نے میری بات کو رد کرتے ہوئے پوچھا "کیا اس نے کبھی تمھارے ساتھ کافی پیتے ہوئے اچانک ہی کہنا شروع نہیں کر دیا؟"

"کیا کہنا شروع نہیں کر دیا؟"

"یہی کہ قید سے بھاگنے والے پانچوں میں سے ایک بھی نہیں بچا۔ تین پولیس کی گولی کا شکار ہو گئے اور دو نے آتم ہتیا کر لی۔"

"کبھی بار وہ بڑبڑایا مزوند ہے لیکن میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔"

"یہی بڑبڑاہٹ اس کی بیماری کی نشانی ہے۔ اس کا منہ سے نکالی بات کے بدلے سگریٹ مانگنا اور سگریٹ ملتے ہی ماچس کی کے لئے گڑگڑانا اسی بیماری کے کارن ہے۔ جو اس پر قابو در پینے سے مشہد دن بھر بھی کوئی ... ورنہ ... خیر تم اس سے پیچھا چھڑا لو۔ اب تو اس کے چہرے پر تابنی کی چمک بھی لہرانے لگی ہے۔ باتیں کرتے ہوئے منہ سے جھاگ چھلکتی ہے۔ پتہ نہیں وہ کیوں نہیں سمجھتا کہ بات ڈھیر لگانے کی نہیں کاٹ چھانٹ کرنے کی کوجھ بوجھ ہونے کی ہے ... لیکن بندر کے ہاتھ بلیڈ لگ جائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے ... !"

پیر خاموش ہو جاتا آس پاس ماتمی دھن گونجنے لگتی۔ میرے من کے پردے پر ایک کے بعد دوسرا چہرہ ابھرنے لگتا۔ اس پیر کا تھیلا یاد آتا اور سامنے کی چیز دور اور دور کا منظر بالکل سامنے دکھائی دینے لگتا۔ پیر کی خاموشی بولنے لگتی:

"تم تو اس کی محبت سے بھی باز نہیں آتے جس کے بازو کہنیوں تک برف میں دھنسے ہوئے ہیں۔ اسے صرف سردی ستاتی ہے جھلس کر رکھ دینے والی لو کا احساس تک نہیں۔ کیا تماشہ ہے کہ اس کے لیے موسم تین چوتھائی مر چکا ہے۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا ہے کہ ایک باگ کا گھوڑا ایک ہی سمت میں مڑتا رہتا ہے لیکن دشائیں ان گنت ہیں۔ کاش وہ جانتا کہ کوئی راہ منزل تک نہیں جاتی۔ دشاؤں کو بدل بدل کر پہنچنے میں ہی بھلائی مکتی ہے۔ صرف برف کی بات کرتے اس میں دفن اپنے بازوؤں کو دیکھ کر چونکنے اور اس کی دہائی دینے سے کچھ بھی بننے والا نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہم کولہو کا بیل بن جائیں ..."

فضا میں گھر کرتی ٹھنڈک کو محسوس کر کے میں پہلو بدلتا۔ اس کے ساتھ ہی میرے سامنے رُوس کی یاترا سے لوٹے سرکاری لوٹن کبوتر کا چہرہ آ جاتا۔ وہ بار بار کہتا ــــ تم نہیں جانتے سموگر کا کوٹ اور سماوار کیا چیز ہیں ــــ ہمیں اپنی بات پہ مسکراتے دیکھ کر اس کا روز بروز چوڑا ہوتا ہوا ماتھا کھل اٹھتا۔ وہ لُو سے مرجھائی پسینہ پسینہ ہوئی شام کو بھول کر اپنی گود میں پڑے سموری کے کوٹ کو اوڑھنا شروع کر دیتا ــــ میں اسے کافی پینے کے

کے لیے کہتا تو وہ مگر میں پڑے سماوار کی یاد دلاتا ـــــ اب میں کافی نہیں پیتا۔ سماوار میں بنے
قہوے کے سوائے مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا ـــــ

اس کی بات سن کر اس سے ڈیوڑھے قد کا اس کا دوست آگے کو جھک جاتا۔ وہ میز پر کہنیاں
ٹکتے ہی اپنی آنکھیں پھیلاتا پھر اپنے بلور نکال کر پلیٹ میں رکھنے کے ساتھ ہی آہیں بھرنے
لگتا۔

"میں نے ٹرانسپورٹ بھون کا انچارج ہوتے ہوئے بھی یاترا نہیں کی۔ میرے دفتر میں دنیا
بھر کے شہروں ستھانوں کے چتر لٹکے ہیں، لیکن فاصلے طے کرنے کا سکھ میرے بھاگیہ میں نہیں۔
دوسروں کو اپدیش دینے اور خود سمے اور ستھانوں کو وجے کرنے میں اسمرتھ رہنے جیسا
دُکھ کوئی نہیں۔ صرف سادھن مل جانے سے لکش پراپت نہیں ہو جاتا . . ." وہ بلور
اٹھا کر پھر پھولوں میں سجا لیتا "اسی کو دُربھاگیہ کہتے ہیں"

پٹھان کو یوں اداس ہوا دیکھ کر مجھے پیر کی بات یاد آجاتی ـــــ اتنے بڑے ڈیل ڈول
کے آدمی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم کہیں سے چلتے ہیں نہ کہیں پہنچتے ہیں۔ یاترا پاؤں پہ چلنے کا
نام نہیں . . . در اصل دونوں میں سے کوئی بھی نہیں چلتا ـــــ وقت نہ ہم ـــــ

داتا دربار کے بے چین ہوتے ہی پٹھان کی دائیں طرف بیٹھا ڈاک بابو کافی کا پیالہ میز پر
رکھ دیتا اور اپنی پائپ سے کھیلنے لگتا۔ وہ اس وقت کو یاد کرتا جب وہ محض ڈاکیہ تھا۔
لوگوں کو چھٹیاں بانٹنے سے پہلے انھیں پڑھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ اب بھی وہ باہر کے
دیشوں سے آنے والی ڈاک کو کھولنا نہیں بھولتا۔ ان میں سے ایک آدھ خط اب بھی
خود اس کے مالک تک پہنچاتا ہے اور انھیں اس میں لکھی تحریر کو سمجھاتے ہوئے اندر
ہی اندر پھولتا رہتا ہے . . . پائپ کو صاف کرتے ہوئے وہ سمرقند اور شکاگو سے آئے
ان خطوط کو یاد کرنے لگتا جس میں لکھا ہے ـــــ ہم زندہ ہیں اس لیے محسوس کرتے
ہیں ـــــ ہم محسوس کرتے ہیں اس لیے زندہ ہیں ـــــ اسے معاملے کی باریکی کو سمجھنے میں
ناکام ہوا دیکھ پیر کہتا ـــــ یہ بے چارہ نہیں جانتا کہ ہماری پیاس ہمارے اندر کے چشمے
سے کیسے بجھ سکتی ہے ـــــ پیر کی بات کے کانوں میں گونجتے ہی میں ڈاک بابو کی طرف

دیکھنے لگتا۔ وہ اپنی مسکین سوجھوں کو اور بھی دبانے کی کوشش کرتا تو مجھے اس کے ملائم سوٹ میں سے کاغذ کے پھول بلاتے لگتے ——

مجھے کافی ہاؤس کبھی کبھی بہت سوچنے پر مجبور کرتا۔ آکاش میں پہلے ستاروں کو دیکھتا اور چہرہ اٹھاتا۔ یہ دنیا دور سے بھی خوب ہے۔ یونیورسٹی کے پروفیسر ایسے ہی ہوتے ہیں؟ اس سے کوئی بات کی اپنی جیب ٹٹولنے لگتا ہے۔ یہ آدمی ہے یا کوڑے دان؟ پہلے ہی اس میں کچرے کی کمی نا بھرے پڑے ہوں۔ سارے گیان دھیان کے باوجود اس بے چارے کو یہ پتہ نہیں چل سکا کہ ہر سچائی جرم کے سہارے کھڑی ہے اور ہر جرم میں کہیں بہت اندر سچائی اور گہرا ہے۔ ویسے تالستائی، لکھتے، برگساں اور پکاسو پر چڑھائی ہوئی تنقید نشر کرنے میں کیا حرج نہیں۔ آخر چور بھی مالدار کہلانے کا حق رکھتا ہے۔ پہلے ہی ایک دن ندامت ... پیر کی بات سن کر میں حیرت میں ڈوب جاتا —— یہ آدمی کافی ہاؤس کے باہر سے ہی ان بیٹھے لوگوں کی بابت کیسے جان لیتا ہے —— مجھے کافی ہاؤس ایک مردہ گھر دکھائی دینے لگتا جہاں ہم سب اپنا اپنا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں پر خود کو جان نہیں پاتے۔ ہمارے اندر کی سرد مہری ہمیں خود فریبی جیسا ڈھال کر اپنے سے بہت دور کر دیتی ہے —— میں پیر سے پوچھتا —— کیا ہم میں سے کوئی بھی سالم نہیں ہے؟ —— پیر جواب نہ دیتا۔ اس کی خاموشی اور بھی گہری ہو جاتی۔ رات بھی تھک ہار کر اونگھنے لگتی۔ دھیرے دھیرے بے بسی کی چادر اوڑھ کر سو جاتی۔

پھر وہ رات آئی جب راج بھون کا گردو نواح بالکل پن کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اچانک ہی سب کچھ مسمار کیا جانے لگا۔ جان، بے جان ہر چیز کو اٹھانے میں دھر لیا گیا۔ اسی رات کافی ہاؤس کو بھی ملیا میٹ کر دیا گیا۔ اس کے ستھان پر ایک انڈر گراؤنڈ مارکیٹ بنانے کا اعلان ہو گیا۔

پیر کے لیے یہ بہت بڑا حادثہ تھا۔ دھرتی سے اس کا عشق جنون میں تبدیل ہو چکا تھا اور نیا کافی ہاؤس بارہ منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔

پیر بڑی مشکل سے اپنا دل چھوڑ کر نئے کافی ہاؤس میں جانے کو راضی ہوا۔ اپنی پیسا کی

بتر دوں کی پوٹلی اور ٹین کا ڈبہ سنبھال کر چل پڑا۔ اس کا چھوٹے قد کا باریک آواز والا کتا
بی اس کے ساتھ تھا۔ مجھے بار بار کتے کی طرف دیکھتے پا کر وہ رک گیا۔
شاید تمھیں یہ مشو کا کتا یاد آ رہا ہے؟" وہ مسکرایا "یہ وہ تو نہیں لیکن اس سے کم بھی
نہیں" وہ پھر چلنے لگا۔
انی ہاؤس والی بلڈنگ کے بڑے دروازے پہ پہنچ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ "اگر میں یہیں
یرا لالہ دوں؟" اس نے میری طرف پہلی بار بے بسی سے دیکھا۔
نہیں یہاں بیٹھنے سے بات نہیں بنے گی۔"
اچھا چلو" وہ تھوڑا سا سوچ کر وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔
انی ہاؤس تک پہنچنے کے لیے چالیس سیڑھیاں تھیں۔ پہلی دس چڑھتے چڑھتے اس کا
م پھول گیا۔ وہ رکا نہیں۔ لیکن اکیسویں سیڑھی پہ پاؤں رکھتے ہی وہ لڑکھڑا گیا۔
میں اوپر نہیں جاؤں گا" اس نے اپنے کو بڑی مشکل سے سنبھالا "یہ سیڑھی دوسری سیڑھیوں
کے مقابلے میں کافی بڑی ہے" اس نے سیڑھی کے کونے میں پوٹلی اور ڈبہ رکھ دیا اور
انھیں پہلو میں بیساکھی کو لٹا کر وہیں بیٹھ گیا۔
س دن سے بیر اداس رہنے لگا۔ اس دن اس نے کچھ نہ کھایا۔ میرے بہت کہنے پر کوص
ات کو ایک پیالہ کافی پی۔ پھر اکتاہٹ بھرے لہجے میں مجھے گھر جانے کے لیے کہنے لگا۔
دوسری شام کو اس کی عجیب حالت تھی۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کی ایک ٹانگ والی
گڑیا تھی۔ گڑیا کو دیکھتے ہوئے وہ روئے جا رہا تھا۔ روتے روتے اپنی بیساکھی چاٹتے کتے
کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگتا تھا۔ مجھے دیکھ کر بھی اس نے گڑیا ہاتھ سے چھوڑی نہ رونا بند کیا
و میں نے پوچھا ——— "یہ کیا ہے؟"
یہی تو ہے جسے میں نے آج تک چھپائے رکھا" اس کی آواز میں تھکن اور اداسی کا
نام نہیں تھا "یہ مجھے ایک کمہارن نے دی تھی۔ ان دنوں میں گلی محلے گھومتے
ہوئے صدا لگاتا اور لوگوں کو ان کے کلیان کا دلاسا دلاتا پھرتا تھا۔ . . "پیر سے
و بھری" ایک دن وہ کمہارن میرے پاس سے گزر رہی تھی۔ میری صدا سن کر رک گئی

ایک پل میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اپنے سر پر رکھے ٹوکرے میں سے
گڑیا نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ مجھے اپنی طرف حیرت سے تکتے پا کر بولی سنبھا
سنبھال کر رکھنا ——— اسی دم مجھے لگا گڑیا بے جان مٹی نہیں ہے ——— لیکن میں نے
اسے چیتھڑوں میں چھپا دیا۔ آج برسوں بعد اسے نکالا ہے . . . پھر خاموش ہو گیا۔
"وہ کیوں؟"
"کل سیڑھی پر لڑکھڑاتے ہی مجھے اس کا خیال آیا اور اس کے بھید کا پتہ چل گیا۔"
"کون سے بھید کا؟"
"یہی کہ اس گڑیا نے اپنی رچنا کے دوران کمہار کے وجود سے منکر ہونے کا پاپ کیا
کمہار نے اسے ادھورا چھوڑ دیا۔ یہ نہیں جانتی تھی . . . یہ بے چاری نہیں جانتی تھی . . !
فقیر دلاپ کرنے لگا۔
"کیا نہیں جانتی تھی؟" میں سہم گیا
"یہ معصوم نہیں جانتی تھی کہ ایک آنچ کی کسر کا نتیجہ کتنا المناک ہوتا ہے۔ ایک آنچ کی کمی
آدمی کو کہیں کا نہیں چھوڑتی . . . " پھر کالی ہاؤس کو چاٹتی باقی سیڑھیوں کو نمناک آنکھوں
سے دیکھتا ہوا کتے کو سہلانے لگا "اب مجھے اس جانور کا ہی بھروسہ رہ گیا ہے۔"
مجھے خاموش کھڑا دیکھ کر دوبارہ: شاید تم حیران ہو گئے۔ یہ بیکار ن کا نہیں جوانی میں مالک
کے مرتے ہی اس کی لاش کو لاوارث چھوڑ کر روٹی کی تلاش میں نکل گیا تھا۔
"کیا کہتے ہو؟" میں نے قدرتی ہوں آواز میں پوچھا۔
"میں غلط نہیں کہتا۔ مجھے وشواس ہے میرے مرنے کے بعد یہ مجھے چھوڑ کر نہیں جائے
گا آپ لوگوں کا انتظار کرے گا شمشان گھاٹ تک میرا ساتھ دے گا۔ دیکھتے نہیں
آج بھی میری بیساکھی کو کتنے پیار سے چاٹ رہا ہے" فقیر نے پھڑکتے ہونٹوں پر نظریں جما دیں
"میری ایک ہی سمسیا ہے۔ میں اپنا درد خواب نہیں ہونے دینا چاہتا . . "
اس بات کے بعد میرا گڑگڑا ابھرا اس نے تانج کر دکھایا وہ صدا ہی لگائی۔ اس نے اپنے
بھگتوں سے منہ موڑ لیا۔ اب وہ تھا مٹی کی گڑیا تھی، چھوٹے تھے ٹکوں ٹکوں

کرتا کتا تھا جو لگاتار پیسا کی کو چاٹتا رہتا۔ وہ تو مجھے بھی گھلا دینے پر تل گیا تھا۔
یہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اس کے دن تھوڑے ہیں۔ میں نے ایک بیرے کو راضی
کیا کہ اگر وقت بے وقت کچھ ایسا ویسا ہو جائے تو مجھے فون کر دے۔
دوسرے ہفتے بیرے نے مجھے پیر کے مرنے کی اطلاع دی۔ میں نے فوراً پوچھا "اس کا
کتا تو اس کے پاس بیٹھا ہے"
میری بات کا جواب نہ دے کر اس نے مجھے کافی ہاؤس پہنچنے کے لیے کہا۔
کافی ہاؤس کی اکیسویں سیڑھی پر قدم رکھتے ہی میں نے جو کچھ دیکھا اس نے میری روح
سن کر دی۔
پیر چت لیٹا تھا۔ اس کے سینے پر ایک ٹانگ کی گڑیا ادھ مری پڑی اس کی داڑھی چوم
رہی تھی، اس کا کتا بڑے شوق سے اس کی آدھی ادھوری ٹانگ کو چبا رہا تھا۔
مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ وہ غرّایا اور مجھ پر جھپٹا۔ میرے پیچھے ہٹتے ہی اس نے پھر
اپنے دانت لنگڑی ٹانگ میں گاڑ دیے۔

●●

کنور سین

منزل

اس بار بھی وہ اکیلا ہی تھا۔ اب بھی اسے سپھلتا کی پوری آشا تھی۔ جو کچھ اس نے بتایا اسے سن کر مجھے پورا وشواس ہو گیا کہ وہ منزل کو پا لے گا۔

پہلے بھی وہ دلدل کے پاس پہنچ کر ہی رکتا۔ تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد اس میں اتر جاتا اس کے چہرے پر پھیلی نراشا کو دیکھتا ہوا میں اکیلا کھڑا رہتا۔

یہ سب بڑے ویران واتاورن میں ہوتا۔ آس پاس ہلچل ہوتی نہ آواز سنائی دیتی۔ دھرتی ڈولتی نہ آکاش پھٹتا۔ دلدل ابلتی رہتی اسے نگلتی رہتی۔

اس کے گم ہوتے ہی میں پھر اس جگہ پہنچ جاتا جہاں سے یاترا شروع ہوتی۔

اس بار جو کچھ ہوا اسے دیکھ کر میں سناٹے میں گھر گیا۔ اس نے پکار کر کچھ کہنا چاہا لیکن آواز بیچ میں ہی اس کا ساتھ چھوڑ گئی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہ گیا۔

یاترا سے پہلے اس نے مجھے بتایا۔۔۔ اس بار وہ ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا جس کے کارن اسے پہلے جیسی نراشا کا سامنا کرنا پڑے۔

اپنی سمسیا اس کے حل پر اس نے میری رائے پوچھی۔ میں چپ رہا۔

میں کیا کروں اسیم ہوتے ہوئے بھی میری اپنی سیما ہے۔ میں اس کے ساتھ چل سکتا ہوں اس کی بات سن سکتا ہوں۔ رائے نہیں دے سکتا۔

یہ جان کر وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر پتہ نہیں کیا سوچ کر اپنی پگھلی

پاگلوں کو تاکتا ہوا اپنی دھیر بندھاتے لگا ۔۔۔ میں نے سب دیکھ لیا ہے۔ جو نہیں دیکھا اسے بھی محسوس کرنے لگا ہوں، کھوئے ہوئے کو پانا اور پائے ہوئے کو کھونا۔۔۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔۔۔ اب میں اپنے سوائے کسی پر بھروسہ نہیں کروں گا۔ پہلے بھی پڑھی پڑھائی اور سنی سنائی نے مجھے چکر میں ڈالے رکھا اور میں چلنے کے باوجود راستہ طے نہ کر سکا۔ لیکن اب . . .

اس بار دلدل سے باہر آیا تو اس میں بڑی لچک اور پھرتی تھی۔ چہرے پر انوکھی دمک اور آنکھوں میں عجیب چمک، ہونٹوں پر مسکان اور زبان میں مٹھاس، ہاتھ پاؤں میں جان اور بازوؤں اور ٹانگوں میں پھڑکن ۔۔۔ اس کے سننے، سونگھنے، محسوس کرنے دیکھنے اور چکھنے کی شکتی دیکھ کر لگا وہ پوری سرشٹی کو جیت لے گا۔

مجھے اپنے انتظار میں کھڑا دیکھ کر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تمھارے جیسا دوست اور کوئی نہیں۔ تم سدا میرے انتظار میں ملے۔ جانے کب سے تم میری سُدھ لیتے رہے ہو۔"

وہ سامنے پھیلے مارگ کو دیکھنے لگا۔ "تم چنتا نہ کرو۔ اس بار میرے ساتھ ہی تم بھی مُکت ہو جاؤ گے۔ میرے بار بار دلدل میں گم ہو جانے کا چکر ختم ہو جائے گا۔۔۔ میں جانتا ہوں تم یگوں تک میرا ساتھ دے سکتے ہو۔ لیکن مجھے بھی تو کچھ سوچنا چاہیئے۔" وہ میری آنکھوں میں اٹک گیا۔

مری چنتا چھوڑ دو۔ اپنی سوچو۔ باتما کو سپھل بناؤ۔ میرا کیا ہے۔ میں تو تمھارے ساتھ رہ کر بھی مُکت ہوں اور تم سے بچھڑ کر بھی۔ سچ پوچھو تو میرے لیے مکتی اور بندھن میں کوئی بھید نہیں۔"

میری بات سن کر وہ پھر چہکنے لگا۔ "اب میں نے سب کچھ جان لیا۔ آس پاس کو پہچان لیا۔ دھرتی کے من میں جھانک کر دیکھ لیا۔ آکاش کا بھی کوئی بھید مجھ سے چھپا نہیں۔ اب مارگ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ پہلے میں اس کا داس تھا اب یہ میرا داس ہے۔ باہر اور بھیتر کا گیان معمولی بات نہیں ہوتی۔ شاید یہی آخری بات ہے جیسے . . ."

مجھے اپنی بات دھیان سے سنتے دیکھ کر وہ جھومنے لگا "پہلے اتنی بات تھی۔ پھر کرتی پر میرا ایسا ادھیکار نہ تھا۔ اب تو وہ یہ مجھے بتا سکتی ہے۔ نہ میرا ناطہ دیکھ سکتی ہے۔ نہ مجھے دلدل میں اترنے کا آدیش دے سکتی ہے۔" وہ رکا اور سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔ "پہلے تو میں اپنے سامنے کے منظر کو گھور گھور کر دیکھتا رہتا۔ اس کا بننا بگڑنا میری سمجھ میں نہ آتا۔ میں الجھن میں پڑ جاتا۔ بھلا میں کے ساتھ کوئی کتنی دور جا سکتا ہے؟ اسی لیے تو مارگ مجھ پر سوار ہو جاتا اور مجھے دلدل کے پاس پہنچا کر ہی دم لیتا۔"

اس نے لمبا سانس لیا۔ "میرا کوئی دشمن نہ ہوتا مگر پھر بھی مجھے ہی دوشی ٹھہرایا جاتا!"

"وہ کیسے؟" میں پوچھ بیٹھا۔ "مگر تم کہتے ہو، ورنہ بھی تم ہی سمجھ گئے۔"

"کیسی بات کرتے ہو!" وہ تڑپ اٹھا۔ "میں کچھ بھی نہ کرتا۔ میری نظر اپنی پرچھائیں سے آگے نہ جاتی۔ سب کچھ مجھے کبھی نہ حل ہونے والی پہیلی جیسا لگتا۔ میری حالت اس اندھے جیسی تھی جو لاٹھی کی لکڑی پر گھومنے کے بعد بھی پڑھا بتانے کا دعوےٰ کرے۔ لیکن اب..."

"اب کیا؟" میں نے سنبھل کر پوچھا۔

"اب وہ بات نہیں رہی۔ اب سب کچھ میرے آدھین ہے اور..."

"اور تم؟"

"میں؟" وہ سکپکایا۔ "یہ بھی کوئی سوال ہوا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب یاترا شروع کرو۔"

"تمہیں ابھی شک ہے کہ..." وہ ٹھٹکا۔ "تم جانتے ہو اس بار میں نے وہ پستک نہیں پڑھی جس میں دور دور تک پھیلا ریگستان مجھے ڈرا دیتا اور میں اس کے چھوٹے سے نخلستان کے آسرے یاترا شروع کرتا۔"

"اس میں کیا برائی تھی؟"

"تم نہیں جانتے۔ وہ نخلستان ہی میرا دشمن تھا۔ وہ مجھے کہیں کا نہ چھوڑتا۔ بس یہی چاہتا کہ میں اپنا لیا دھرا اس کے ارپت کر دوں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنے کو کچھ نہ سمجھوں۔ تم ہی بتاؤ کیا کوئی ادھار اداسی کہیں پہنچ سکتا ہے؟ ذرا بھی نہ ہو تو منزل کیسی؟

"کیا کہتے ہو! وہ شاستر تو . . ."

"نہیں وہ شاستر میرے کام کا نہیں۔ وہ مجھے اپنے سے باہر رہنے کو کہتا ہے۔ لیکن میرا کام پرکرتی کے گربھ کو ٹٹول کر اس میں چھپے بھید کو جاننا ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو!"

"پھر بھی تم مجھ پر شک کرتے ہو۔ میری شکتی کا اندازہ لگانے میں اسمرتھ ہو۔ تم نہیں جانتے کہ گرنتھ کی رچنا کرنے والے کے ساتھ کیا بیتی!"

"کیا کہتے ہو؟"

"میں جھوٹ نہیں کہتا۔ وہ گرنتھ کے انتم ادھیائے پر پہنچ کر گھبرا گیا۔"

"وہ کیوں؟"

"اسے بودھ ہوا کہ گرنتھ میں سوائے اندھکار کے وہ اور کچھ بھی پیدا نہیں کر سکا۔ تم ہی کہو جہاں دھرم پتر اپنے گورو کا سر کاٹنے کے لیے جھوٹ بولے، کنواری ان اپنے ہی بیٹے کی جان لینے کے لیے سازش رچے، یودھا اپنے فرض کو بھول کر اپنے بزرگ کی جان لینے کے لیے دھوکہ دھڑی سے کام لے اور خود بھگوان بڑھ کر باپ اور بیٹے میں بھید کیے بغیر جیتنے کا منتر دے وہ گرنتھ کیسا ہوگا۔ رچنا کار نے اسے نرک کھنڈ بننے سے بچانے کے لیے اس میں وہ ادھیائے جوڑ دیا جو نخلستان جیسا ہرا بھرا دکھائی دیتا ہے ورنہ . . ."

"وہی ادھیائے جس کی ماری، لہولہان پرکرتی کو . . ."

"نہیں" وہ چلّایا "وہ میرے وناش کا کارن ہے۔ اسی نے مجھے اپنے کو پوری طرح سمجھنے اور پرکھنے اور کام میں لانے نہیں دیا۔ اسی کے کارن یاترا مجھے ہر بار دلدل پر پہنچاتی رہی!" اس نے ادھر کو دیکھا۔ "نخلستان میں پناہ لینے اور صرف اپنے بوتے پر ریگستان کو پار کرنے میں بڑا انتر ہے!"

اس نے لمبا سانس لیا۔ "وہ ادھیائے سانپ سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ پیچھے من میں میرے تئیں ترشنا پیدا کرتا ہے۔ مجھے میری ہی نظر میں کچھ نہیں رہنے دیتا

میں بس ریوتا کے چرنوں میں بیٹھ کے پرشاد جیسا بن جاتا ہوں۔ اپنی بدّھی پھیکی سا اور دکاش ساودھنا میں وشواس کھو بیٹھتا ہوں۔

"وہ کیسے؟" میں پریشان ہوا تھا۔

"وہ مجھے وشواس دلاتا ہے کہ میں جو کرنا چاہتا ہوں یا کر رہا ہوں وہ ہو چکے کو دہرانے کے سمان ہے۔ مثلاً میں صرف مرے ہوئے کو مارنے والا ہوں۔ تم ہی بتاؤ جاننے کے بعد میری کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ میری یہ حیثیت ہی میری سمسیا ہے۔ سوال سرشٹی کے پھیلاؤ کا نہیں سوال اس میں میرے استھان کا ہے۔"

مجھے خاموش نظروں سے اپنے کو تکتے پا کر وہ بولا "مارگ اور منزل میں کوئی بھید نہیں کرم اور پھل ایک ہی چیز ہیں" اس کی آواز تیز ہو گئی "کرم میں تیاگ کی بات مجھے راس نہیں آتی۔ یہ ارپن کیا ہوتا ہے؟ کس کے ارپن؟ کس لئے ارپن؟" وہ رکا "یہ گیان مجھے یونہی پراپت نہیں ہو گیا۔ میرے ساتھ جو ہوتا آیا ہے اس کا چنتن کرتے یُگ بیت گئے۔ اب مجھے پتہ چل گیا ہے کہ میں راستے پر قابو پا کر کیسے منزل کو پا سکتا ہوں۔"

"تمہارے ساتھ کیا ہوتا آیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم سب جانتے ہو۔ ہمیشہ سے میرے ساتھ ہو۔ پھر بھی انجان بنتے ہو۔" وہ مسکرایا۔ "کیا تم نہیں جانتے ہر بار میری یہ درگت کیوں ہوتی رہی؟ میں منزل کی بجائے دلدل کے پاس کیوں پہنچتا رہا؟"

مجھے سر جھکائے اپنی بات سنتے اور پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کو کریدتے دیکھ کر وہ کہنے لگا۔ "جو ہے اسے اپنے آدھین کیے بنا بات نہیں بن سکتی۔ اپنے کو اس کے چرنوں میں رکھ دینے یا مایا جال مان کر اس کی جانب پیٹھ کر کے کھڑے ہو جانے سے میں کہیں نہیں جا سکتا۔ تم ہی بتاؤ ——— پتھر کو توڑے بغیر ہم اسے دھول میں کیسے بدل سکتے ہیں؟ بات سرشٹی کو اپنے ماننے کی نہیں اسے اپنے اشارے پر چلانے کی ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے اس کی طرف دیکھا ——— میں کیا کروں۔ میری اپنی سمسیا ہے یہاں

آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھا اور کان رکھتے ہوئے بھی بہرہ ہوں۔ میرا سوچنا، سوچنا
محسوس کرنا، محسوس کرنا ایک برابر ہے۔ جس چیز کو دیکھ سکتا ہوں اسے پرکھ نہیں سکتا
بات کو سن سکتا ہوں اسے سمجھ نہیں سکتا۔ اس کا بھی کارن ہے۔ سرشٹی میرے ساتھ
ہر سمے پوری کی پوری جڑی رہتی ہے۔ میں اس میں اور وہ مجھ میں وچرتی رہتی ہے۔
میرے لیے آدمی اور ادانت میں کوئی بھید نہیں۔ اس لیے یاتری جو بھی کہتا ہے مجھے اس
پر وشواس ہو جاتا ہے۔۔۔

"میں نے بتایا تو ہے!" وہ پھر دور تک دیکھنے لگا۔ "کرنی اور ہونی کو بس میں کر لینے کا
گُر مجھے آ گیا ہے۔ اب میرے کہیں بھی ڈگمگانے کا سوال نہیں رہا۔"

"یعنی کہ۔۔۔"

"یعنی کہ ہونہار میری اِچھا کا نام اور میرے کرم کا پرینام ہے۔ یہ اب میرے سے پرے
کی وستو نہیں رہی۔"

"پھر تم خود ہی منزل ہو۔ تمھیں یاترا کی ضرورت ہی نہیں۔ بیٹھے بٹھائے ہی۔۔۔"

"نہیں بات ایسی بھی نہیں۔ گھڑ سواری کے بغیر کوئی یودھا نہیں کہلا سکتا۔ یاترا کیے بغیر
کوئی منزل کا ادھیکاری نہیں بن سکتا۔ اگر میں یاترا نہ کروں تو دلدل کا وجود کبھی نہیں
مٹ سکتا۔"

"یہی بات تم نے پچھلی یاترا شروع کرتے سمے کہی۔ لیکن پہلے ہی قدم پر ہار کر بیٹھ گئے۔ اسی
لیے رشتوان کو پہلے تمھیں وراٹ ادھیائے کی یاترا پر لے جانا پڑا۔ سچ بتاؤ شمشان کی
جھلک دیکھے بغیر تم موت کے ڈر سے مکت ہو سکتے تھے؟ باپ اور بیٹے کے بیچ کی
کھائی کو پاٹ سکتے تھے؟؟"

"پھر وہی بات!" وہ تلملایا۔ "میں نے کہا تو ہے کہ وہ یاترا میری نہیں تھی۔ وہ تو ہونہار
تھی۔ میں اسے دہرانے والا کردار تھا۔ اس کا رچنا کار نہیں۔ اسی لیے میں شردھا بھگتی اور
آتم سمرپن کے چکر میں پھنس گیا۔" اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "اب رشتوان کی بات نہ کرنا۔
اس نے کہا تھا وہ دلدل سے بچنے کا طریقہ بتائے گا۔"

"کیا اس نے غلط کہا تھا؟"

"تم جانتے ہو اس کے بتائے مارگ سے بھی مجھے دلدل پار ہی پہنچایا۔ ختم ہونے کی بجائے دلدل کہیں زیادہ پھیل گئی۔ رکھوان بھی جھلاوہ نکلا۔ اس کے کہنے کے مطابق کرم کرنے پر بھی مارگ بدلا نہ منزل۔"

"پھر تو اس بار تمہیں رکھوان کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے رکھتو کی بھی ضرورت نہیں۔ اس بار میں اپنے پاؤں پر چلوں گا۔"

"دیکھ لو۔ کوئی کمی نہ رہ جائے ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟" وہ ٹھٹکا۔

"ورنہ تمہاری اِچھا پھر تمہیں اِچھادھاری سانپ بن کر ڈس لے گی۔ اس کے زہر سے اندھے ہو کر تم پھر دلدل۔۔۔"

"چپ بھی رہو۔ میرے پاس ہر مصیبت کا علاج ہے۔" اس نے جیب سے ایک ڈبیہ نکالی۔ "اس میں سانپ کے زہر کا تریاق ہے۔ مجھے پتہ ہے سانپ ہی میری انتم سمسیا ہے۔"

"یہ نئی بات ہے۔ اِچھادھاری سانپ کے زہر کا تریاق تو۔۔۔"

میری بات سن کر وہ مسکرایا اور کمرے سے نکل کر آنگن میں آ گیا۔ وہاں کھڑے برگد کو تھوڑی دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد اس نے پھونک ماری۔ آگ کی ایک لپٹ پورے پیڑ پر چھا گئی دوسرے پل پیڑ جل کر راکھ ہو گیا۔

مجھے ہکا بکا کھڑا دیکھ کر وہ ہنسا اور اس سے پہلے کہ راکھ ہوا میں بکھر جاتی اس نے ڈبیہ کھولی۔ اس میں سے چٹکی بھر سفوف لے کر برگد کی جڑ میں ڈال دیا۔ آنکھ جھپکتے ہی برگد پہلے کی طرح لہلہانے لگا۔

"مجھے وشواس ہو گیا کہ تمہیں رکھتو کی ضرورت ہے نہ رکھوان کی۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ بیساکھی کے سہارے چلنے والا لنگڑا کہلاتا ہے۔ لنگڑا نہ تو دوڑ سکتا ہے نہ ناچ ہی سکتا ہے۔ اس کے منزل پر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میں اس کی کرامات کو دیکھ کر بولا۔

اس بار یاترا لمبی تھی اور کٹھن بھی۔ پہلے رتھوان یاتری کی مدد کرتا۔ اسے راستہ سمجھاتا۔ کٹھنائیوں کو دور کرنے کا طریقہ بتاتا۔ آڑے وقت میں اس کے کام آتا۔ اداسی اور نراشا میں اس کی ڈھیر بندھاتا اور اسے اٹھانے لیے جاتا۔ نہ یاتری کے پاؤں تھکتے نہ ان میں آبلے ہی پڑتے۔ لیکن اس بار وہ اکیلا ہی سب کچھ سنبھالتا سمیٹتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اپنی بدھی اور شکتی سے پہاڑ کو دھول، جنگل کو راکھ اور سمندر کو بادل بنا کر اڑاتا ہوا منظر کو اپنے من کے مطابق بدلتا چلا گیا۔ اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت تھی نہ خواہش۔ وہ تو مجھ سے بھی بیگانہ ہوا مارگ سے جڑنے میں مست تھا۔ یہاں تک کہ وہ مارگ کو اور مارگ اسے پہچاننے لگا۔ میں نے کئی بار اسے اپنی سُدھ لینے کو کہا لیکن اس نے میری بات پر کان نہ دھرے ہترودھ سے آگیا جب وہ راستے میں آگی جھاڑیوں کو اپنی کہنیوں سے اکھاڑنے لگا۔

یاترا میں پہلے اس کے پاؤں گم ہوئے۔ پھر ٹانگیں گھٹنوں تک گھس گئیں۔ ہاتھ کلائیوں کا ساتھ چھوڑ گئے اور بازو کہنیوں تک چڑھ گئے۔ ریزہ ریزہ بکھرتا ہوا وہ اندھا دھند چلتا گیا۔ ایک ستھان پر پہنچتے ہی سامنے پھیلی ہوئی دھند کو دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا "اب منزل دور نہیں۔ اسے پار کرتے ہی۔۔۔" تبھی اس نے دیکھا میں پیچھے کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا ہوں۔ وہ ٹھٹکا اور میری طرح گردن گھما کر پیچھے کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں پھٹی رہ گئیں۔ پیچھے پہاڑ جوں کا توں کھڑا تھا۔ جنگل لہرا رہا تھا اور سمندر گرج رہا تھا۔ وہ سکتے میں آگیا اور پتھرائی آنکھوں سے آس پاس کو اچھا دھاری سانپ کا روپ دھارن کرتے ہوئے دیکھنے لگا — لگتا ہے ہم وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے۔ اس بار تو۔۔۔"

دوسرے ہی پل وہ چونکا اور اسے اپنی جیب میں پڑی ڈبیہ کا دھیان آیا۔ لیکن اسے باہر نکال کر کھولنے والے ہاتھ ٹھنٹھ بن چکے تھے اور وہاں سے بھاگنے میں مدد دینے والے پاؤں غائب تھے۔ ہر زخم ہڈی تک اتر گیا تھا۔

●●

مخمور سعیدی

پہاڑوں سے اتر کر جب وہ میدانوں میں آیا تھا
پگھلتی برف کی سوغات اپنے ساتھ لایا تھا
پرانی یاد کا آسیب خود اپنا ہی سایا تھا
جدھر ہم آئے تھے وہ بھی ہمارے ساتھ آیا تھا
کسے تھا اس کے کھو جانے کا غم اس شہر بے حس میں
سڑک کی بھیڑ میں جس نے اکیلا خود کو پایا تھا
غضب کی دھوپ میں جلتے تھے جو بے آب خطّے تھے
جہاں چشموں کی ٹھنڈک تھی وہیں پیڑوں کا سایا تھا
بہا کر لے چلا پانی تو کیا؟ کچّی تھیں دیواریں
ندی کے بیچ میں مٹّی کا گھر کس نے بنایا تھا
کماں سے تیر چھوڑا ابھی نہ تھا اس نے ابھی لیکن
مرے سینے میں اک گھائل پرندہ پھڑپھڑایا تھا
پھر اس کی روشنی میں صاف پہچانا گیا منظر
فصیلِ شب پہ اک قطرہ لہو کا جگمگایا تھا
مکیں چپ تھے، مکانوں کے دریچے کھلتے جاتے تھے
صداؤں نے پسِ دیوار کیا جادو جگایا تھا
رہے مخمورؔ کچھ دن تک در و دیوار کے قیدی
نکل کر شہر سے پھر سب نے ویرانہ بسایا تھا

محسن زیدی

تین غزلیں

۱

کبھی کبھی تو نظر ڈال اپنے اوپر بھی
کھلے ہوئے ہیں کئی پھول تجھ پہ باہر بھی

وہ آس پاس مرے دل کے اب بھی رہتا ہے
قریبِ جاں سے کہاں جا سکا بچھڑ کر بھی

عجیب موجِ شرر بار لمس لمس میں تھی
کہ جل رہے تھے بدن پانیوں کے اندر بھی

تری نگاہ نے اپنی سی کر کے دیکھ لیا
اتر سکے نہ رگِ سنگ میں یہ نشتر بھی

بہا کے لے گیا سچائیوں کو جھوٹ کے ساتھ
کہ اسکے پاس تھے طبل و علم بھی لشکر بھی

ذرا سی دیر کو پتھر کا بت ہمیں بھی بنا
جگا دے لمس کا جادو ذرا سا ہم پر بھی

تمام سبزے ہی سبزے کی رو نہیں محسن
کہیں کہیں تو لہو رنگ ہے یہ منظر بھی

۲

ایسا جادو کچھ اس نظر کا رہا
جاگنا رات رات بھر کا رہا

دشت در دشت گھومتے گزری
سایہ سایہ کسی شجر کا رہا

آمد و رفت کو ترستے رہے
در مقفّل ہی اپنے گھر کا رہا

میں بھی پوچھا کیا پتا اس کا
وہ بھی جویا مری خبر کا رہا

ٹوٹ کر برگ بھی گرے تھے مگر
شاخ کو غم گل و ثمر کا رہا

راستے کی رفاقتیں کب تک؟
جب تعلّق نہ عمر بھر کا رہا

اپنی منزل الگ رہی محسن
رخ جدا اپنی رہگزر کا رہا

۳

میں ہی رکا نہ وقت کی رفتار دیکھ کر
کہتا رہا وہ مجھ سے، عبث سر ہلا دیکھ کر
ہم اپنے درمیاں سے نہ پردہ اٹھا سکے
حائل خود اپنے جسم کی دیوار دیکھ کر
پھر زخمِ سرد میں کسی اجنبی کو میں
حیران ہوں معین و مددگار دیکھ کر
یوں پڑھ کے اس نے ایک طرف رکھ دیا مجھے
جس طرح پھینک دے کوئی اخبار دیکھ کر
آئے تو پاس خواب کے جھونکے کئی مگر
واپس چلے گئے مجھے بیدار دیکھ کر
یاد آگئیں وہ سبز قبائیں لہو میں تر
جی ڈر گیا ہرے بھرے اشجار دیکھ کر
پہلے سے ہو گیا تھا بدلتی ہوا کا علم
موسم سمجھ گیا تھا وہ آثار دیکھ کر
وہ بے خبر تھی کہ خود سے بچھڑ کر نہ مل سکا
آیا ہوں سارے کوچہ و بازار دیکھ کر
یہ مت سمجھ کہ تجھ سے گلہ کچھ نہیں مجھے
میرے لبوں کو تشنۂ اظہار دیکھ کر
آئینۂ نگاہ میں تھا آبلوں کا رقص
ہر سمت اس کا عکس شرر بار دیکھ کر
محسن وہ سیلِ نور تو اندھا ہی کر گیا
دیکھا گیا نہ پھر اسے اک بار دیکھ کر

سرشار بلند شہری

۱

در در میں شجر آویزاں
شاخوں پہ ثمر آویزاں
خوش رنگ ثمر میں خوشبو
خوشبو میں ثمر آویزاں
ذرات بدن تابندہ
خورشید نظر آویزاں
صد رنگ پرندہ آدم
صد رنگ سفر آویزاں
شہروں میں شجر آوارہ
جنگل میں بشر آویزاں
پرشور شرارہ دستک
خوں خوف خطر آویزاں
در میں دیوار علاقہ
دیوار میں در آویزاں
زنجیر قدم زیبائش
سر حکم نظر آویزاں
فریاد حنوط حاکم
پلکوں پہ سحر آویزاں
مسجد قراءت پاکیزہ
لمحات حسن آویزاں

۲

قطرہ قطرہ سرخ لہو کا یار
نقرئی زریں سبز تماشا یار
نیلے پیلے سرخ گلابی رنگ
گل خوشبو آواز کرشمہ یار
آؤ موت کے در پہ دستک دیں
ہو جائے پھر زندہ دھماکہ یار
ذرہ ذرہ سورج کی تصویر
سورج کی تصویر تماشا یار
جسم علاقہ خوشبو خوشبو گل
خوشبو خوشبو جسم علاقہ یار
آتش زدہ چنار کا منظر ہے
گل بوٹا گلنار سراپا یار
کرۂ ارض سے خارج صبح و شام
اب مت لینا نام خدا کا یار
گھر سے سیدھا رستہ قبرستان
پل دو پل ہے زندہ ہوا کا یار
سایہ سایہ سوکھا پیڑ ببول
چبھ جائے گا پاؤں میں کانٹا یار
خیر کی جانب آنکھ اٹھانے سے
زندہ ہیں ہم شکر خدا کا یار

حامدی کاشمیری

یہ بشارت ہے تو تیرے لب کے روشن لمس کی ہے
منجمد ظلمات سے گزرو تو بہتی روشنی ہے
برف و باراں کا کہیں کوئی نشاں تک بھی نہیں ہے
دست و پا پتھرائے ہیں، چہروں پہ تاریکی جمی ہے
وہ برہنہ جسم، کالے بال کھولے آ ملے گی
خواب آور سبز راہوں میں منوّر تیرگی ہے
کتنے قدآور صنوبر کھائیوں میں گر رہے ہیں
معبدوں سے اس پہر نکلو یہ منظر دیدنی ہے
آئیں گے بحری پرندے ساحلی بستی کی جانب
چاندنی خفتہ دریچوں پر اکیلی جاگتی ہے
اب بھی ست رنگے جزیرے میں وہ میری منتظر ہے
موج کے رتھ پر ہوا یہ مژدہ لے کر آ گئی ہے

ڈاکٹر نریش

وہ شخص جو ہے میرے واسطے عدو کی طرح
رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے کیوں لہو کی طرح

گواہ ہیں مرے گھر کی تمام دیواریں
کہ تیری یاد کو رکھا ہے آبرو کی طرح

سمٹ سکو تو سمٹ کر گلاب بن جاؤ
بکھر سکو تو بکھر جاؤ رنگ و بو کی طرح

اٹھا تھا صورت فریاد صبح دم اے دوست
مٹا ہوں شام کو مفلس کی آرزو کی طرح

نریشؔ باندھ کے رکھے گا مجھ کو کون کہ میں
بکھر چکا ہوں فضاؤں میں گفتگو کی طرح

کرشن مراری

آج نینن میں بس گئے آ کر
کھوئے کھوئے اداس سے منظر

سب مہ و سال سو گئے شاید
زرد موسم کی اوڑھ کر چادر

غم اسی کا دیا ہوا تو ہے
کیا خوشی اداس سے ہٹ کر

کس قدر رہنما منِ تشنہ ہیں
تیکھے تیکھے سے سوچ کے تیور

کچھ فنا و بقا نہیں مفلوج
کیا تماشہ ہے اے تماشہ گر

تو جیتی ہی رہی ازل سے سوچ
آدمی جائے ہے کہاں مر کر

ڈوبنے والے ڈوبتے ہی گئے
ایک دلکش خیال کے اندر

ہر قدم پر یہ ناچتی سی ہوا
ٹھہرا ٹھہرا سا سوچتا منظر

پھر خرابے تلاش کرتا ہے
دل سرابوں کی راہ پر چل کر

نکھرا جائے ہے یہ اسی کارن
لاج ہی تو ہے روپ کا زیور

یہ تیرے روپ کا رسیلا پن
جیسے بکھری سی دھوپ کا منظر

پھر چھلک سی اک لہو کی بوند
دیکھو پلکوں پہ سج گئی آ کر

منہ جو موڑا ہے آج دنیا سے
ساری دنیا بنی ہے میرا گھر

صدیق حبیبی

۱

وہی رنگ رخ پہ ملال تھا یہ پتہ نہ تھا
مرا غم بھی شامل حال تھا یہ پتہ نہ تھا
وہی شام آخری شام تھی یہ خبر نہ تھی
وہی وقت، وقت زوال تھا یہ پتہ نہ تھا
مجھے کر گیا جو تہی تہی بھرے شہر میں
وہ مرا ہی دست سوال تھا یہ پتہ نہ تھا
مجھے بت بنا کے چلے گئے کہ ورد سکوں
تمہیں میرا اتنا خیال تھا یہ پتہ نہ تھا
وہ ہوا سے سرک تھی جس سے دل کا دیا بجھا
مرے دل کا بجھنا کمال تھا یہ پتہ نہ تھا
میں حبیبی ڈھونڈھوں اسے کہاں وہ کہاں ملے
وہ تو آپ اپنی مثال تھا یہ پتہ نہ تھا

۲

اپنی خاک سیاہ ہی ملتی اپنا بخت سیاہ
سانسوں کی الجھی آشوبی گرہیں سخت سیاہ
خون کے ہر قطرے میں گونجے پت جھڑ کی آواز
اک جھٹنا را داسی کا لگے ہے دل پہ درخت سیاہ
اپنی آگ میں جلتا جگنو ڈھونڈے راہ پناہ
میلوں گھور اندھیرا پھیلا ہر سو دشت سیاہ
دن سیمابی شہر میں جیسے تپتی ریت پہ اوس
شام ہوئی اور دھیرے دھیرے ہونا وقت سیاہ
جانے کب سے بھاگ رہا ہے سورج جان بچائے
رات مسلسل پیچھا کرتی باندھے رخت سیاہ
دل کے طاق پہ جلتا ہے اک مدھم نور چراغ
خوابوں کا گمنام فرشتہ تاج و تخت سیاہ
ایک ذرا سی آؤں جب میں تھوڑا سا زہراب
کھینچ لے آنکھوں سے کوئی غنچہ پیوست سیاہ
یہ دورِ محبت جیسا تھا جب تک تم تھے ساتھ
تنہائی کے کرب میں جل کر ہو در وہمت سیاہ

اندرسروپ دت ناداں

اس سفر میں کچھ زیاں اے بے خبر تیرا بھی ہے
ہے جو طوفانوں کی زد میں وہ نگر تیرا بھی ہے

کھینچتا پھرتا ہے کیوں ہر سُو لکیریں آگ کی
اے شرر پیشہ! اسی بستی میں گھر تیرا بھی ہے

کل جہاں رکھی تھی تو نے جُرم سنگیں کی بِنا
آج اُنھیں مُجرم اندھیروں میں سفر تیرا بھی ہے

آج کا شبخوں ترے دشمن ہی کا ماتم سہی
لیکن اس پُرہول وادی میں گذر تیرا بھی ہے

اوڑھ کر دعدے ترے ننگے ہوئے بستی کے لوگ
اور تو خوش ہے کہ اُن پر کچھ اثر تیرا بھی ہے

اب تو تجھ پہ کُھل گیا ہوگا ترا رنگِ حساب
وقت کے دھارے پہ حرفِ معتبر تیرا بھی ہے

یہ بتا ناداں کہ تجھ کو زندگی سے کیا مِلا؟
مانگنے والوں کی بستی میں تو گھر تیرا بھی ہے

مش۔ک۔ نظام

اب زمینوں پہ آسمان کہاں
دھوپ ہے سر پہ سائبان کہاں
فرد باقی ہیں خاندان کہاں
ڈھونڈتے ہیں مکیں مکان کہاں
تم ہو خاموش ہیں بھی گم سم ہوں
اب کوئی اپنے درمیان کہاں
اب ہواؤں میں ہم معلق ہیں
اپنے ہونے کا اب گمان کہاں
کاغذی ناؤ ہے بھروسہ کیا
ان جہازوں کے بادبان کہاں
ناپتا ہوں نظر سے اونچائی
پر سلامت ہیں پر اڑان کہاں

مشتاق جاوید

نظر کے سامنے اک خوشنما منظر تو رہنے دو
کہ اس کے عکس کو آئینے کے اندر تو رہنے دو
پھر اسکے بعد خوابوں کے سہارے ٹوٹ جائینگے
ہماری آنکھ میں تم نیند کو پل بھر تو رہنے دو
ازل سے چلچلاتی دھوپ میں جلتا رہا ہوں میں
برہنہ سر پہ میرے ابر کی چادر تو رہنے دو
پسِ دیوار کوئی دشمنِ جاں گھات میں ہوگا
مرے دستِ جنوں میں دو تو پتھر تو رہنے دو
سرور و کیف کا عالم نہ چھینو میری آنکھوں سے
جو یاں سرسبز تھے انکو فضا خور پر تو رہنے دو
کہیں میرا لہو بھی برف کی صورت نہ جم جا
ذرا جسم و جاں میں دھوپ کا لشکر تو رہنے دو
جو تم لکھتے مسافر کو نشانِ منزل کا بتلائے
سرِ کہسار نصب اے جاوید وہ پتھر تو رہنے دو

نورچند یاس

جب زمیں کا جسم خوں سے بھر گیا
دھیان اپنا آسمانوں پر گیا
دی اصولوں کو اسی نے زندگی
خواہشوں کا جو لہو لے کر گیا
گھاؤ خاموشی کا گہرا کیوں نہ ہو
دور تک آواز کا پتھر گیا
تھا جہاں مجھکو اندھیرے کا یقیں
روشنی پائی وہاں تو ڈر گیا
جب شرر ٹوٹا تخیّل کا میرے
غم کے خد و خال روشن کر گیا
گھٹ گئیں مجھ میں تمنّائیں میری
قتل کا الزام بھی مجھ پر گیا

جمیل انور

تعاقب

.... پھر وہ ہے یہ ایک آدمی رو رہا ہے اسے روتے دیکھ کر مجھے اپنے
چاروں طرف بکھرے ہوئے مضحک المیے کا احساس ہوتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ کہیں بھاگ
جاؤں لیکن کہاں ...... کہیں د کہیں تو جانا ہی پڑے گا کہ کالی آندھی آنیوالی ہے کیونکہ
بقول کسے قرآن شریف میں چودھویں صدی کے بعد کا ذکر نہیں ہے اور یہ صدی ختم ہونا
ہے سچ تو یہ ہے کہ صدی کے ساتھ ساتھ میں بھی ختم ہو رہا ہوں اور ہاں تم نے مسجد کی
سیڑھیوں پہ رینگتے ہوئے سانپ دیکھے تھے کل سارے شہر میں تو ہلچل مچ گئی تھی۔ چھوڑو یار،
کوئی نئی بات کرو میں تو بچپن سے دیکھتا چلا آ رہا ہوں ٹرین آئی نہیں ہے اور لوگ پلیٹ
فارم سے اتر اتر کر پٹڑیوں پہ انتظار کرنے لگے ہیں اچھا ہوتا کہ وہ ٹرین کی تلاش میں نکل
پڑتے لیکن نہیں بہت سارے لوگ پٹڑیوں کے پیچ دار جالوں میں الجھے مختلف سمتوں
نکل چکے ہیں جی چاہتا ہے چپکے سے ان کے کانوں میں کہہ دوں کہ تم لوگ جس ٹرین کی
تلاش نکلے ہو اس ٹرین کا وجود ہی ختم ہو چکا ہے اب پلیٹ فارم اور پٹڑیاں ہی تمہارا
مقدر ہیں مسجد میں اذان ہو رہی ہے اللہ بہت بڑا ہے ہاں یہ بھی سچ ہے کہ یہ کمینہ انسان
بہت چھوٹا ہے لیکن سنا ہے کہ کل ایٹمی خلائی جہاز خدا کی تلاش میں جانے والا ہے۔ اچھا
ہے خدا مل جائے تو بہت سارے مسائل حل ہو جائیں گے ہو سکتا ہے کہ مسائل حل
ہونے کے بجائے اور بھی الجھ جائیں کیونکہ خدا کے بھی اپنے مسائل ہوں گے اگر وہ

انسانوں سے اپنے مسائل کے حل دریافت کرنے لگے تو۔۔۔۔۔ لیکن وہ تو خدا کی
سازش کی تلاش میں نکلے ہیں اور ان کی مرغیوں کے تمام انڈے گندے ہیں اور زمین
کے چہرے کی جھریوں میں آسمان کا گدلا عکس نظر آ رہا ہے کیونکہ زمین دن بدن بانجھ
ہوتی جا رہی ہے اور ہمارے ہاتھ زنگ آلود۔۔۔۔۔ اور بجریوں کی فصل تو ابکی بہت اچھی
ہے گندم کون خریدے گا بہتر ہوگا ہم خرید لیے جائیں کیا خیال ہے کل شیعہ سنی فساد
میں ایک آدمی شہید ہو گیا نہیں نہیں کتے کی موت مارا گیا آج کل کتے تنگ و تاریک
گلیوں میں بھٹکنے لگے ہیں اور زہر کی گولیوں کا اسٹاک ختم ہو گیا ہے ویسے بازار میں گولیاں
کئی قسم کی ملتی ہیں لیکن وہ نقلی ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اصلی ہونے کا نقاب
اپنے چہروں پر چڑھائے ہوتی ہیں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اپنی ساری خوشیاں اپنے جسموں
سے کھرچ کھرچ کر کھا جائیں اور جنگل تو یوں بھی ہمارا انتظار کر رہا ہے سنا ہے جنگل میں
سالخوردہ پادری انسانوں کی تلاش میں نکلے تھے وہاں پادریوں کو انسان تو نہ ملے البتہ درندوں
نے انھیں پھاڑ کھایا جو بچ نکلے وہ واپس شہر لوٹ آئے اور شہر ہی میں اپنی تبلیغ کرنے لگے
بے وقوف ہیں کیا پتہ ۔۔۔۔۔ دم دار ستارہ نمودار ہوا ہے لوگ گھروں سے نکل نکل کر
شاہراہوں پر آ گئے ہیں اور اسے دیکھتے ہوئے اپنی اپنی کھوئی ہوئی دُموں کا ماتم کر رہے
ہیں کیونکہ تہذیب کے جسم پر بال اگ آئے ہیں اور اس کے دانت اور ناخون تیز ہو گئے
ہیں اور میرا دل ویت نام بن گیا ہے جہاں کھیتوں میں چلتے ہوئے ہل آج بھی چھپے
ہوئے بم دریافت کرتے ہیں اور کسانوں کے چیتھڑے اڑ جاتے ہیں انھیں کھیتوں
سے ایک نسل اگے گی جس کے سینے میں دل نہیں ایٹم بم دھڑک رہا ہوگا کیا اس نسل سے
تم آنکھیں ملا سکو گے۔ میں وقت کی شاخ سے ٹوٹا ہوا اک لمحہ ہوں لیکن یہ کوئی افسوس
کی بات نہیں۔ وقت کی شاخ سے لمحے ٹوٹتے ہی رہتے ہیں اور خزاں کا زرد موسم ہر وقت
اجڑے گھونسلے تیار ہی رہتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہماری جڑیں زمین سے اکھڑ گئی ہیں اور ہم
زمین اور آسمان کے درمیان خلا میں لٹک رہے ہیں اور بانجھ اور بنجر زمین کے سینے سے نکالے
گئے طوفان بپھرے کالے ہاتھوں میں قید ہو گئے ہیں۔ اس لیے زمین سے اپنا رشتہ استوار

کرنے کے لیے جھاڑیاں اور پتے کھانا جائز ہے آسمان سے گزرتے گرجتے ہوائی جہاز سے
دو ہیرا شوٹ اتر رہے ہیں پتہ نہیں وہ مشق کر رہے ہیں یا کوئی حادثہ ہونے والا ہے اور آج
کل تو یہ عالم ہے کہ عقل پر لاکر اثر گئی ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا
ہونے والا ہے بہتر تو یہی ہوگا کہ ہم آنے والے حادثوں کی مشق شروع کر دیں اس طرح عین
وقت پر غلط کم محسوس ہوگا آج صبح دو آدمی ٹرام کی پٹریوں کو عبور کر رہے تھے کہ ٹرام آگئی
اور اس کا وجود کئی ٹکڑوں میں کٹ گیا ہاتھ اور پیر پٹریوں سے چپک گئے سر کٹ کر فٹ پاتھ
پر خون اگلنے لگا اس نے لوگوں سے استدعا کی کہ بھائیو میرے اعضا اٹھا کر جمع کر دو میں گھر
لے جاکر اسے گوند سے چپکا لوں گا لیکن لوگوں کی سماعت مر چکی تھی وہ رکے بغیر آگے بڑھتے
گئے کچھ لوگوں کی سماعت زندہ تھی وہ رکے لیکن وہ بھی اس کے اعضا نہ چھو سکے کہ خون
آلود اعضا چھونے سے ان کا وضو ٹوٹ جائے گا اور فرصت ہو تو دوستوں کا خون پینے
میں بھی مزا آتا ہے کل ہی میرا ایک دوست رات کے وقت میرے گھر میں داخل ہوا۔ اس کا
چہرہ سرخ اور پیٹ حاملہ عورتوں کی طرح پھولا ہوا تھا کمرے میں داخل ہو کر اس نے اپنی شہ
رگ کھول دی اور خون بہانے لگا شاید اس نے زیادہ مقدار میں خون پی لیا تھا میں نے
اس سے کہا کہ بھائی یوں خون ضائع نہ کرو بلکہ کسی بلڈ بینک میں جمع کر دو ممکن ہے کل تمہیں
خون کی ضرورت پڑے لیکن وہ نہ مانا اور خون بہاتا رہا حتی کہ اس کا جسم غبارے کی طرح پچک
گیا اور وہ وہیں مر گیا اسی وقت میں نے اپنا گھر چھوڑ دیا کہ اب اس کا کفن دفن کون کرے
اس ساحلی علاقے میں جہاں صرف شراب خانے اور قحبہ خانے ہیں کل رات بڑا ہنگامہ ہوا
تھا جہاز شام ہی کو لنگر انداز ہوا تھا اور ملاح مہینوں سے دو مہینوں سے زمین نہیں دیکھی تھی
اور صرف سمندر کی نمکین ہوا ہی پیتے رہے تھے ساحل پر اتر آئے اور شراب خانوں اور قحبہ
خانوں پر حملہ کر دیا خوب شراب پی اور سڑکوں ہی پر اختلاط کرنے لگے تہذیب و اخلاق کے
بارسوخ ٹھیکیدار چلاتے ہی رہ گئے لیکن وہ ملاح زمین سے اپنا رشتہ استوار کرتے رہے
مجبوراً بارسوخ ٹھیکیداروں نے شہر کا فیوز اڑا دیا اور سارا شہر ساحلی علاقہ بن گیا اندھیرا
..... اندھیرا ...... اور میرا عقیدہ ہے کہ میں اپنا لمس زدہ وجود نہیں دیکھ سکتا اور اپنے

دل کی دھڑکنوں کو محسوس کر کے خوش ہو لیتا ہوں جب سے میرے زنگ آلود پھیپھڑوں میں ٹی بی
کے جراثیم داخل ہوئے ہیں میں نے لیڈی ڈاکٹر سے عشق کرنا شروع کر دیا ہے اس لئے مجھے
اسپتال کے بستر سے اٹھا کر اپنی خوابگاہ کے بستر پہ سلا دیا ہے امید ہے اب میں اچھا ہو جاؤں گا
لیکن جب آنکھیں صحرا بن جاتی ہیں اور آنسو نخلستان کا سراب بن جاتے ہیں تب ہونٹوں
کی مسکراہٹ کا عکس اسپتال کے بستر سے قبر تک سفر کرنے لگتا ہے اور مجھے آخرت سے
بہت ڈر لگتا ہے خاتمہ کہیں نہیں ہے تلاش تو ہمیں دروازوں کی ہے جب ہم دروازہ اول
تلاش کر لیں تب قیامت آسان ہو جائے گی اسے کیا معلوم جو ہر روز سورج کو سوا نیزے
پہ ناچتا ہے قیامت تو ہر پل جاری ہے اسے اس بات کا علم اس وقت ہوگا جب نیزہ
خود اس کے جسم میں ترازو ہو جائے گا لیکن وقت کی انگلیاں ہمیں تولتے وقت ہمیشہ
ڈنڈی مار جاتی ہیں اور ہم ہمیشہ سفر ہی میں زندگی گزارتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ ویٹنگ
روم میں موسم کیسے داخل ہو جاتے ہیں جبکہ شہر کی ساری عمارتیں ایئر کولر ہو چکی ہیں اور
فٹ پاتھ کے رہنے والے سردی سے مرنے لگے ہیں اور ان کی سڑی ہوئی لاشوں کی بدبو
گھروں میں آنے لگی ہے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے ورنہ سارا شہر بدبو کی لپیٹ میں آ جائے گا بکھرے
ہوئے وجود کو جوڑنا اب بہت آسان ہو گیا ہے میں ہر صبح کو بستر سے اپنے وجود کا ہر ذرہ چن لیتا
ہوں اور اطمینان سے شاہراہ پر نکل آتا ہوں اور ہر صبح کی طرح شاہراہ جنہ نامکملیت کا احساس
رگوں میں گردش کرنے لگتا ہے لیکن اس وقت گھر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور میں اپنا
نامکمل وجود لیکر شہر میں آوارہ گردی کرنے لگتا ہوں کہ شہر کی رگوں میں دوڑنے والا خون
میری رگوں میں گردش کرنے والے ہو سے میل نہیں کھاتا اور رات کے وقت تو گھر کا
دروازہ کھل ہی جاتا ہے میں نے اسے کئی بار سمجھایا کہ یار ہر وقت یادوں کو یوں اٹینڈ
مت کیا کرو کبھی یادوں کا کیسٹ چوری ہو جائے یا اس کا فیتہ ٹوٹ جائے تو تم بھی میری
طرح ہو جاؤ گے۔ حال تو در بدر ہے ہی مستقبل اور بھی تاریک ہو جائے گا جبکہ ماضی کوئی کن
کھلا اچکا چوری کر چکا ہے اور میں زمان و مکان سے آزاد ہو چکا ہوں اور جسم پر لگے گھنے
بالوں کے جنگلات میں بھٹک رہا ہوں اور مسرتوں کے چشموں کی تلاش میں ہوں جبکہ

چشمے زمین کی اندرونی تہوں میں اتر گئے ہیں اب مجھے زمین کے نیچے سفر کرنا ہے اپنے آپ
کو اپنا جسم کر لو یہ آواز کہیں گونج رہی تھی۔ اور بس پہاڑی چکردار راستوں پر اڑتی جا رہی
تھی چاروں طرف گہری کھائیوں میں تیروں کے جنگلات اُگے ہوئے تھے اور میں بس
کے پائدان پر بے سہارا کھڑا تھا اور بس کے اندر سونے اور رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی اور جب
اچانک تاریکی مسلط کر دی گئی اور گھروں کے دروازوں کو باہر سے بند کر دیا گیا تب وہ سب
چوہوں کی طرح اپنے اپنے گھروں میں سرنگیں بناتے تھے اور تیل پلائی لاٹھیاں جمع کرتے
تھے کہ تاریک رات مسلط کرنے والی لمبی ناک والی ڈائن ونا ما سڑکوں پر گشت کر رہی تھی۔
یکایک تمام دروازے کھل گئے لوگوں نے تیل پلائی لاٹھیوں سے اس لمبی ناک والی ڈائن
کو مار مار کر قصبے سے باہر پھینک دیا جہاں وہ زنجیرے بجا بجا کر برگد کے نیچے بین کرنے لگی۔ لوگوں
نے سکون و آسودگی کا سانس لیا ہی تھا کہ وہ ڈائن زنجیرے چھوڑ چھاڑ کر قصبے کی فصیلوں پر
شگاف کرنے لگی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ چائے کے ساتھ اخبار بھی پینا چاہیے کہ چائے تو
ہضم ہو کر مثانوں کے راستے خارج ہو جاتی ہے لیکن اخبار ہضم ہو کر ہاتھوں میں تیل پلائی
لاٹھیاں تھما دیتا ہے میں سرطانی لمحوں کی بازگشت سن رہا ہوں اور میرے چاروں طرف
عنکبوتی حصار تنگ ہوتا جا رہا ہے ایک دن میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور اپنے
تمام کپڑے اتار دیے اور آئینے میں اپنا برہنہ جسم دیکھنے لگا جسم کی سطح پر کوئی زخم نہ تھا پھر
تکلیف کیسی میں نے لباس پھر پہن لیا کہ لوگوں کو تو افواہیں اڑانے کا فن خوب آتا ہے
ان کی فاختائیں نوک کی اڑ چکی ہیں لہٰذا اب وہ افواہیں اڑانے لگے ہیں کل ہی قصبے کا
ایک معصوم بچہ فاختہ کی شکل کے ایک غبارے کو دیکھ کر خوشی سے چیخ مار رہا تھا
اور اسی وقت اڑتی ہوئی لوہے کی فاختہ نے بیٹ کر دی اور قصبے کے در و دیوار شعلے
اگلنے لگے۔ اس وقت وہ ہنستا ہوا معصوم بچہ کہاں غائب ہو گیا کسی کو علم نہیں اللہ کو
بھی نہیں۔ جو رات بھر کمرے میں بند بحث کرتے رہے تھے کہ کائنات جبر و استبداد کے
نرغے میں پھنس چکی ہے اور دانشوروں کو کچھ کرنا چاہیے رات بھر وہ جلتی ہوئی قندیل کی
روشنی میں لفظوں کی قے کرتے رہے اور صبح دم وہ سو گئے جب وہ دوپہر کو جاگے تو وہ

اور کھڑکیوں کی درزوں سے آنے والی سورج کی روشنی میں جلتی ہوئی قندیل بدل رہی تھی۔
میں اس کے غم میں برابر شریک ہوں کیوں کہ اس کی بیوی ہر سال ایک انڈا دیتی ہے اور
سانپوں سے بچانے کے لیے مسجد کی محرابوں تلے مہندی کی سرسبز ٹھنڈی چھاؤں میں
چھپا دیتی ہے اب تو یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے کتنے انڈے گندے رہیں اور کتنے
بچے اچھائی اور برائی کیا ہے میں آج تک سمجھ نہیں سکا ہوں نہ ہی میں جاننے کی کوشش
کرتا ہوں مذہب کی رسی سے زندگی کا چھنار صوب میں پسینہ خشک کرنا ہے سوال یہ
ہے کہ مچھلی سمندر میں کیوں پیاسی مر جاتی ہے۔ کل رات وہ اپنی بیوی کی کھال اوڑھ کر
سو گیا اور ہڈیوں کو اس نے گلی میں پھینک دیا تھا جہاں ایک آوارہ بھوکا کتا ہڈی کی
تلاش میں جانے کب سے بھٹک رہا تھا وہ ہڈیوں پر جھپٹا اور چبانے لگا۔ اس کے مضبوط
جبڑوں سے ہڈیوں کے چرمرانے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن وہ تو سو چکا تھا بیوی کی کھال
اوڑھ کر اسے کیسے وہ آوازیں سنائی دیتیں اسی لیے میں کھال پر یقین نہیں رکھتا ہوں اور
ہڈیوں میں سرسراتے جذبوں کی پرستش کرتا ہوں سنا ہے بیسویں صدی کے اختتام تک
تیسری جنگ چھڑ جائے گی مریخ پر زمینی پلاٹ کر لیے جائیں تو بہتر ہو گا ورنہ ایٹمی تابکاریوں
کی سرخ سرخ زبانیں زرد بچوں کو چاٹ لیں گی مریخ جانے والے راکٹ کا ٹکٹ مل جائے
گا تو میں اس سے ملے بغیر ہی چلا جاؤں گا۔ اب میں بہت بدل گیا ہوں اب کسی سے الگ
ہونا کسی سے رشتہ توڑ لینا کسی سے بچھڑ جانا میرے نزدیک بے معنی ہو گیا ہے بہت
عرصے پہلے جب میں اپنی محبوبہ سے بچھڑ گیا تھا تو نہ جانے کتنے عرصے تک روتا رہا تھا
لیکن یہ آج سے بہت پہلے کی بات ہے جب کہ آج میں بہت بدل گیا ہوں کافی عرصے بعد
دوستوں سے ملاقات کرنا اچھا ہوتا ہے بہت ساری تبدیلیاں یکلخت سمٹ آتی
ہیں۔ نومبر میں ملنے والے دوست سے میں نے رخصت ہوتے ہوئے کہا تھا کبھی اب
ستمبر میں آنا لیکن وہ مارچ ہی میں مل بیٹھا وہ مارچ کی ایک گلابی صبح تھی لیکن اس کی
آنکھیں زرد ہو رہی تھیں اسے اپنی پڑوسی جوان لڑکی سے عشق ہو گیا تھا اس لڑکی کی
آنکھیں سبز تھیں اور اسی کی آنکھوں کی زردی میرے دوست کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

دونوں کا یہ تعلق عشق کا ہو چکا تھا کہ لڑکی کی شادی ایک بڈھے سے ہو گئی اور نتیجہ نا پتہ ہو گیا سنار
کیا زہر خرید نے کے لیے اور اسے پولیس پکڑ کے لے گئی آج کل وہ کالا عدالت میں پڑا ہے وہ
اس کی بیر قانی مجبوری کہ سرخ چیچی ہو گئی ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ صبح سویرے اٹھ کر بزرگوں کو
سلام کرنا چاہیے یاد رہے بات ہے کہ بزرگ اب اس قابل رہ بھی کہاں گئے ہیں پھر بھی صبح سویرے
اٹھ کر انھیں سلام کرنا ہی چاہیے ورنہ حوالات .... وہ لوگ ہفتہ سے جڑی
بوٹیاں اور درختوں کی چھالیں کھا کر زندہ تھے پتہ نہیں انھیں کیا سوجھی کہ وہ بھوک ہڑتال
کرنے لگے لیکن میں جانتا ہوں کہ کچھ نہیں ہوگا مہینے دو مہینے میں کچھ لوگ بھوک سے
مر جائیں گے کچھ لوگ مالکن کی گولیاں کھا جائیں گے اور بقیہ لوگ پھر واپس جنگل کو لوٹ
جائیں گے اور اپنی وہی پرانی غذا کھانے لگیں گے اور تو اور کل سرمایہ داروں نے ایک
جلوس نکالا تھا تم نے دیکھا تھا...... خیر میں وہاں موجود تھا بڑے بڑے ریشمی بینرز
پر ان کی مانگیں درج تھیں جن کا مطلب تھا کہ آج کل وہ بے حد پریشان ہیں اور مزدور ان کا استحصال کر
کر رہے ہیں وقت کا چکر الٹا چلنے لگا ہے وہ اپنی بہنوں کو دیکھ کر شہوت محسوس کرتے ہیں
کیا تمھیں بھی شہوت محسوس ہوتی ہے اپنی بہنوں کو دیکھ کر۔ فاحشہ عورتوں سے ملنا بری
بات نہیں میں ایک طویل عرصے تک فاحشہ عورتوں سے ملتا رہا پھر لوگوں نے پکڑ کر
ایک شریف عورت سے میرا نکاح کر دیا اور جاتے ہوئے کہا اب عمر بھر کے لیے ایک رنڈی
دستیاب ہو گئی ہے کیوں کہ مجھے اب فاحشہ عورتوں اور اپنی شریک حیات میں کوئی
بھی فرق نہیں لگتا بڑی عجیب بات ہے وہ بارہ تیرہ سال کی لڑکی جو جنرل اسٹور میں کام کرتی
ہے میں جب بھی دودھ خریدنے جاتا ہوں اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ
تیرنے لگتی ہے اور دودھ کا پیکٹ دینے کے بعد وہ الماری کے شیشے میں دیکھ کر اپنے
ہونٹوں کی لپ اسٹک درست کرنے لگتی ہے اتنی کم عمر میں معاشیات سے دلچسپی
رکھنا ٹھیک نہیں۔ ایسے ہی بوسیدہ لمحات میں بڑھاپا چہرے کے دروازے پر دستک
دینے لگتا ہے اور جب صبح وہ سو کر اٹھے گی اور آئینہ دیکھے گی تو اس کے چہرے پر جھریاں
پیدا ہو چکی ہوں گی اور بال سفید ہو چکے ہوں گے مریخ کی طرف جاتے ہوئے راکٹ

کی دم کے فضلوں نے سارے شہر کو متعفن کر دیا اور اندھیری گذرگاہ میں کھڑی وہ عورت
بھی نظر آنے لگی جو اپنا بوسہ چار آنے میں فروخت کرتی ہے۔ بوسہ پیارا، چار آنے پچیس
پیسے لیکن میں تو ہمیشہ سے حساب میں کمزور رہا ہوں کہیں سے گوشت اور خون کے جلنے
کی بدبو آ رہی ہے اور وہ مینڈولین پر نغمے بجا رہا ہے بہت عرصے پہلے وہ ایک دن مینڈولین
پر دیپک راگ بجا رہا تھا کہ اچانک اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تب اس نے فوراً
میگھ ملہار بجانا شروع کر دیا لیکن سارے تار ہی ٹوٹ گئے تھے گھبرا کر اس نے مینڈولین
پھینک دیا تھا اور دریا میں چھلانگ لگا دی تھی دریا میں چکنی چکنی سڈول رانوں والی
مچھلیاں اسے دیکھ کر کانا پھوسی کرنے لگیں تھیں اور اس کے گرد رقص کرتے ہوئے
شہوت ناک اشارے کرنے لگی تھیں اس نے دیکھا تھا ان کی کوکھ کی صدف جیسی ابھیوں
کے نطفوں کے موتی چمک رہے تھے اس دن سے اس نے تیراکی بھی چھوڑ دی کیا یہ
بہتر نہ ہوگا کہ تنگ و تاریک پھیلی ہوئی گلیوں کے پر پیچ جالوں میں مسجدوں کے
سفید گنبد نظر آئیں اور ابھی پر پیچ گلیوں کے جالوں سے پرے شہر آرزو ہو تاکہ کبھی جب
ہم اپنے کمروں کی قبروں میں گھٹن محسوس کریں تب باہر نکل آئیں اور گرد و پیش کے
حالات کا جائزہ لے کر باغوں کی تازہ ہواؤں کو اپنے اپنے پھیپھڑوں میں بھر کر واپس قبروں
کی سمت لوٹ جائیں کہ نیلی دھند ہر طرف بکھرنے لگی ہے اور لاشیں اپنے اپنے کندھوں
پر کتبے اٹھائے قبروں سے اُبل رہی ہیں اور گلیوں بازاروں اور سڑکوں پر نمائش کے
لئے بھٹک رہے ہیں چلتی پھرتی لاشیں دیکھئے بیسویں صدی کا سب سے بڑا معجزہ
ٹکٹ صرف ایک روپیہ ہے کوئی خریدنے والا جوان مرد آج کل جیبوں میں سوراخ ہو
گئے ہیں جیسے ملکے جہیں مہنگائی ہمالیہ کی چوٹی پر جا کر رہنے لگی ہے چلو چل کر اسے کھینچ لائیں
سنہالی جیبوں میں اس کا گھر بنا دیں تاکہ فرصت کے اوقات کے۔ ایل سہگل کے
گیت سنا کریں اور ہر سال ایک اولاد پیدا کرنے کی سکت پیدا کریں اک بنگلہ بنے نیارا...
......اخبارات کے اسکینڈلوں پر آج کل خودکشی کی وارداتیں زیادہ نظر ہونے لگی ہیں
سر پر الٹا لٹکا ہوا آسمان اب کالا ہو گیا ہے اور سورج کی رنگیلی روپہلی زنگ آلود ہو گئی ہے

نظامِ شمسی کے باہر کیا ہوگا ماہر فلکیات جانیں مجھے اب کسی شے سے بھی دلچسپی نہیں رہ
گئی ہے اپنے آپ سے بھی نہیں...... لیکن نہیں شاید میں ہزار سالہ جیلے خلفشن کے ہو
بہر کیف ہوں مجھے اپنے آپ سے دلچسپی ضرور ہے کیوں کہ میں کسی سے محبت کرتا ہوں
کسی سے نفرت کرتا ہوں کسی کی خوشامد کرتا ہوں کسی کی جیب کاٹتا ہوں اور زندہ
رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آج کل میں فیشن زدہ سگے سانچ اوقات جلوسوں میں گھومتا
ہوں ڈاکٹر نے اسے پنسلین کا انجکشن لگا کر شادی کا مشورہ دیا وہ خاموش رہا وہ
ڈاکٹر سے کیا کہتا وہ شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اور اس کی رانوں کے جوڑوں کے دونوں
غدود مسلسل کام کر رہے ہیں اور وہ اس سماج کے غلط پرزوں کی مشین میں پسا جا
رہا ہے اس لیے اس کی رگوں میں لہو کی بجائے پنسلین گردش کر رہی ہے اور سیاست
دانوں کی انگلیاں آکٹوپس کے سونڈوں کی طرح ساری زمین کو اپنی گرفت میں لیے
ہیں۔ اور ہم اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے ہم سب کٹھ پتلیاں ہیں اور اشاروں
پر حرکت کر رہے ہیں جب میری آنکھوں میں یرقان کا پودا اگا تو میں زرد آسمانوں کی سیر کے
لیے تیار ہو چکا تھا لیکن لوگ خاموش رہے ان حرامیوں نے مجھے پکڑ لیا اور ڈاکٹر کے
پاس لے گئے ڈاکٹر نے میری آنکھوں کی زرد پتلیوں کا معائنہ کیا اور فیصلہ صادر کر دیا
کہ ہم سب اپنے اپنے والدین کے حیوانی جذبات کی پیداوار ہیں جبکہ "نیو [illegible]"
کی نہریں شہر کی نچلی جگہوں سے گزرتی ہیں چلو آؤ کھدائی کریں لیکن نیا سال آنے
والا ہے دسمبر کے چہرے پر سفید بال اُگ آئے ہیں وقت دردِ زہ سے کراہ رہا
ہے نیا سال آنے والا ہے کڑوے دکھ کو سہا جا سکتا ہے لیکن مایوسی کو سمجھنا آسان کام
نہیں اور وہ یہودی لڑکی جو ہر وقت زیورات سے لدی پھندی رہتی ہے نہیں جانتی
کہ لوہے کے بند کیپسول میں کیا ہوتا ہے اور یہ لوہے کا کیپسول جب آواز کی رفتار
سے سفر کرتا ہوا رائفل کی نال سے نکلتا ہے اور گوشت کی دیوار کو پار کرتا ہے تو سیاہ
اندھیرے کی گردش ہونے لگتی ہے ایک کائنات کی موت کا علم اسے کیا ہوگا
خاندان میں لوٹ چلیں وہاں [illegible] کا بستر انتظار کر رہا ہوگا اداسی بستر پہ لیٹی

ہا انسان پیدا ہوا جس کے ہاتھوں میں زیتون کی سبز ڈالی ہوگی لیکن اب مجھے
زیتون کی سبز ڈالی اور رائفل کی نال میں کوئی فرق نظر نہیں آتا کیوں کہ میرے سامنے
ی کمل گھڑی کی آنکھ ہے دھوپ میں پگھلی ہوئی سرخ نظر آتی ہے جہاں دوپہر میں
وئی نظر نہیں آتا ہے لیکن جب سورج ڈھل جاتا ہے اور شراب کی بوتل میز پر رکھے
رہا ہوتا ہوں تو لوگ جمع ہونے لگتے ہیں اور شہادت کی انگلیاں اٹھا اٹھا کر
وہ پھسپھس کرنے لگتے ہیں کہ میں شراب پیتا ہوں مجھے ان پر غصہ آتا ہے اور رحم بھی
جو خونخوار بھیڑیے ان کے جسموں کے پیمانوں سے ان کے خون پی رہے ہیں انھیں
بات کا احساس نہیں اور یہ میرے کمرے میں جھانک رہے ہیں جا بجا ڈائس اسٹیج تیار
ہے اور وڈیو اسپیکر سے سبز باغات نشر ہو رہے ہیں تمھارے سروں پر ایک ڈنڈے
راستہ ہی رہنا چاہیے کہ تم سب بھیڑیں ہو یسوع مسیح کی بھیڑیں بے شعور معصومیت
ذبح علامت میری زندگی گھڑی کے ڈائل میں قید ہو کر رہ گئی ہے اور میں ہزاروں
سال بلا پیر کے بغیر مسلسل گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ سفر کر رہا ہوں شہروں
جسم بڑھتے بڑھتے دوسرے شہروں کے جسموں سے اختلاط کرنے لگے ہیں جنگل ختم
گئے ہیں اور سمندروں کو پاٹا جا رہا ہے ایک دن وہ بھی ختم ہو جائیں گے ساری
یا ایک شہر بن گئی ہے اور فطرت نمائش گاہوں میں قید ہے اور مجھے وہ لوکا یاد
ہے جو سرما کی ایک کہر آلود شام کو پارک کے ایک ویران گوشے میں مشقت زنی کر رہا
اس کی کھلی آنکھیں دھندلے افق میں نہ جانے کس کو تلاش کر رہی تھیں اور ان
کھوں سے قطرہ قطرہ غم ٹپک رہا تھا جب تم اس زندگی کو اچھی طرح سمجھ لو گے تب
مہارے بال سفید ہو جائیں گے ہاں یہ ساری کائنات اقتدار کے منظر میں ڈھل
ہا ہے اور ہم سب سلو موشن میں بھاگ رہے ہیں لیکن فرار کی ساری راہیں بند
ہیں یہ ادھورا منظر اپنی تکمیل چاہتا ہے اور خدا کی آنکھ کا کیمرہ اس منظر کو اپنے فیتے
ازبر کرنے کا ہاں یہی آسمانی سازش ہے دوستی کے درخت کے پھل کب کے سڑ
ایک الماری میں کیڑے سے بچ بچا رہے ہیں جبہ و دستار کی منجمد عمارتیں پہننے والے ریاکار

منافقت کے بیج بو رہے ہیں انتظار کرو کہ اس درخت کی چھاؤں میں گہری نیند کا خواب
تمہارا منتظر ہے اگر نیند نہ آئے تو ایل۔ ایس۔ ڈی کھاؤ اور کھاتے رہو ایک وقت
آئے گا جب گہری نیند کے سمندروں میں غرق ہو جاؤ گے اور مسائل سمندر کی ریگ
پر تیر رہے ہوں گے اور سطح آب کے نیچے کی نیلی گوں دنیا کتنی خوبصورت ہے اور
اسے بدلنا اسکیمو کو ٹھکرانا ہے اور جب وہ ہپی لڑکی حاملہ ہو گئی تو اس کے بچے نے پیٹ
کے اندر سے سوال کیا کہ میرا باپ کون ہے تب وہ ہپی لڑکی جو سکون کی تلاش میں پیرس سے
چلی تھی اور ہانگ کانگ، برما، سیلون سے ہوتے بھارت تک آئی تھی واپس لوٹ
گئی حیرت ہے لوگ ایشیا میں سکون تلاش کرتے ہیں جب کہ سکون کے کیپسول
یورپ نے ایجاد کیے ہیں اور اس کیپسول کی لطیف دیواروں کے اندر ایشیائی لہو
دھڑک رہا ہے یہ میں اس لیے تمہیں کہہ رہا ہوں کہ میں ایشیا میں رہتا ہوں بلکہ
اب میں صرف اور صرف انسان ہوں اور ساری سرحدوں کی لکیروں کا تصور میں نے
ختم کر دیا ہے اس لیے میں ساری عظمتوں کا افتخار ہوں اور وین لینڈ کا باسی ہوں.....

محسن علی

دشت و بلا

وہ بہت کالی ہے ـــــ بالکل سیاہ مرمر سے تراشی ہوئی، چکنی، چمکدار ـــــ
کسی رخ سے اسے دیکھیے، جوانی ابھری ابھری نظر آتی ہے ـــــ پھر ہر عضو اپنے ابھار میں ہو یا دبیں ہو یا گہرائی میں، عیاں عیاں سا لگتا ہے اپنے اشاروں کے ساتھ کنایوں کے ساتھ ـــــ

اس کا سارا ہی بدن بے لباس لگتا ہے کہ بدن روشن ہے ایسا اپنے اظہار میں، اپنے تکلم میں ـــــ

وہ چپ ہو یا نظر جھکائی ہوئی ہو یا کہیں اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی ہو، اس کے وجود کی ساری ہی کیفیات صرف جسم و جان میں تپش پیدا کرنے والی سرگوشیاں کرتی ہوتی ہیں اور یہ یقین دلاتی ہیں کہ ـــــ وہ اچھوتی ہے ـــــ
خصوصاً جب وہ نظریں پھیری ہوئی ہوتی ہے اور دوسری طرف کہیں متوجہ ہوتی ہے تو اس کے بدن کے بے خبر حصوں میں مسلسل بلاوے ہوتے ہیں "آجاؤ، قریب آجاؤ"
یہ ایک شہر کی بات ہے

میں دور دیش کا رہنے والا ہوں ـ ہرے بھرے جنگلوں سے لگی لگی ایک چھوٹی سی بستی کا ـــــ بہت بہت یاد آتی ہے اور ہر بار ایک نئے قسم کا زخم لگتا ہے کہ اودے نیلے رنگ کی ایک چھوٹی پہاڑی تھی، پہاڑی کا دامن سرمئی ہوا کرتا تھا اور ـــــ کھلا کھلا ـــــ

۔ سویرے کے بعد کی بالطمعت عظمی پرجیب عنفوان شباب جیسی کرنیں آہستہ آہستہ پڑنے لگتیں اور طنڈکوں میں دور تک۔ اتر جاتیں، ساری وادی کے اسرار مسکراتے ہوئے اس طرح جاگ پڑتے جیسے لات بھر عشق میں جتلا رہے ہوں۔
پھر وادی کے کسی روشن گوشے سے ایک تان اڑتی ـــــ ایک تروتازہ جوان کے سینے سے۔ اور ساری وادی کے سینے میں اتر جاتی۔ وہ ایک جھرنے جیسا شفاف گیت ہوتا تھا اور اس کے بول ہوتے تھے

یہ دھرتی میری نہیں
آکاش میرا نہیں
یہ چاند سورج میرے نہیں
بس ایک بار ـــــ تو آجا
یہ سب میرے ہو جائینگے
ان سب پر ـــــ میں راج کرونگا
میں یہاں ہوں ـــــ دور ساری دنیا سے ـــــ

پتہ نہیں یہ گیت کیسا تھا، لگتا تھا کتنے ہی ایسے شاعروں نے مل کر لکھا تھا جن کے نام کبھی اور کہیں لکھے نہیں گئے ـــــ
دور دور تک یہ گیت اڑتا ہوا، کلیلیں بھرتا ہوا نظر پڑتا تھا ـــــ پھر وہ گیت اچانک ایک جگہ آکر تھم جاتا تھا۔ جیسے اس کا ایک حصہ ٹوٹ کر کہیں گر گیا ہو اور اب گیت کا وہ حصہ گایا نہیں جاسکتا اُسے کوئی سن نہیں سکتا ـــــ

"بس ایک بار ـــــ آجاؤ

.... میں یہاں ہوں، دور ساری دنیا سے" کے بعد ایک ایسا سکوت چھا جاتا تھا جیسے وہ تروتازہ نوجوان کمیدہ کر ـــــ ان بے نام شاعروں کو زمین پر کہیں تلاش کررہا ہو جنھوں نے اس گیت کو پورا کیا تھا کہ
گیت کا وہ "تو" آگیا۔ گیت کے بول جیسی سادہ سیدھی الھڑ سی لڑکی غزالی آنکھیں

لینے لگی ـــــ وادی کے پھول گانے لگے۔ پہاڑی ڈھلوانوں سے وہ گیت کلیلیں بھرتا ہوا اترا، پاگل ہواؤں کی طرح اور نیچے ندی کی چھوٹی چھوٹی لہروں پر ناچتا ہوا ندی سے آگے نکل گیا ـــــ جنگل کی ہوائیں اس گیت کو شاخوں پر اٹھائے پیام دیتی رہیں ـــــ
اس وادی کے ٹھیک بیچ میں، جہاں ندی میں جاکر ملنے والے جھرنے بہتے ہیں، جہاں جنگلی پھول گھیرے ڈالے ہوئے ہیں، وہاں اس تر و تازہ نوجوان کو اس کے گیت کا "تو" مل گیا ـــــ دھرتی اس کی ہو گئی۔ آکاش اس کا ہو گیا۔ چاند اس کا ہو گیا، سورج اس کا ہو گیا۔ اور پھر وہ دنیا سے دور ہو گیا ـــــ
پھر وہیں ایک بار ایک لمحہ کے لیے پتہ نہیں کونسی بات ہوئی کہ ایک کوندہ سا لپکا۔ سارے آسمان سے سورج لاپتہ ہو گیا، زمین پر جیسے اوندھے منھ گر گیا ہو۔ ساری وادی جل کر خاکستر ہو گئی۔ وہاں اب کچھ نہیں تھا ـــــ بس کچھ بھی نہیں ـــــ
ندی بھی جل گئی تھی اور اس کا پانی ابلتے ہوئے خون کی بدبو بن کر فضاؤں میں پھیل گیا تھا۔ ایک کٹے ہوئے پیڑ کے تنے پر وہ غزالی آنکھوں والی الھڑ لڑکی اپنے پیر لٹکائے ہوئے بیٹھی تھی۔ اس کی نظروں کے بالکل سامنے ندی کی، گدگدی پیدا کرتے والی، چھوٹی چھوٹی، بہت چھوٹی لہریں تھیں۔ پیچھے سبزہ زار پر کتنی ہی بھیڑیں چر رہی تھیں، خود رو بیلیں مسکرا رہی تھیں ـــــ اس الھڑ لڑکی کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں ـــــ جنگلی پھول کتنے روشن ہوتے ہیں اور اپنے وجود سے دور دور تک بھی تر و تازہ لگتے ہیں ـــــ خوشبو کے ساتھ ان کی تر و تازگی بھی فضا میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے ـــــ
سورج اس کے قریب آ گیا تھا لیکن وادی میں آج ابھی تک وہ تان نہیں اٹھی تھی ـــــ
اچانک گھوڑے کی ٹاپوں کی صدا آنے لگی ـــــ گھوڑا ندی کے کنارے آکر کھڑا ہو گیا۔ سوار اترا اور اس کٹے ہوئے تنے کے پاس جاکر خونخوار نظروں سے اس سہمی ہوئی لڑکی کو دیکھنے لگا ـــــ وہ جنگل کا کوئی بھیڑیا تھا۔ ان غزالی آنکھوں پر جھپٹ پڑا۔ لڑکی بھاگ نکلی۔ اس سے آگے اس کی چیخیں تھیں۔ ساری وادی کو اپنی مدد کے لیے بلا رہی تھی لیکن وہ خونخوار بھیڑیا کسی طرح بار بار اس پر جھپٹ پڑتا تھا ـــــ لڑکی کے گورے بدن سے

خون برس رہا تھا سبزہ زار پر سرخیاں نظر آرہی تھیں۔ وادی میں جیسے وہ ایک ہی بھیڑیا
تھا۔ سارے وحشی نابود ہو گئے تھے ——— اب پہاڑی کے اوپر جانے
والا راستہ تھا۔ وحشیوں کا نمایا ہوا۔ اس پر وہ بھاگ رہی تھی۔ بھیڑیا پیچھا کئے جا
رہا تھا ——— اس سے قریب ہو گیا۔ اس پر جھپٹ پڑا۔ اسے دبوچ لیا۔ اس کے
ناخونوں میں اس لڑکی کا لباس تھا ——— چر، چر ——— اف واقعی سورج
اودے سے منہ کر پڑا ——— ایک ایسی چیخ ساری وادی میں گونجی جیسے آسمانوں کے ہر حصہ
سے ٹکرا گئی ہو ———
ایک گہری کھائی تھی ——— اندھیرا تھا۔ اور ہر طرف خاموشی تھی۔
بھیڑیا چپ تھا اور لڑکی کھائی کی خاموشیوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی تھی ———
ایک عام بات، ایک ادنےٰ سا واقعہ ——— !!
پتہ نہیں انسان کی کس تہذیب نے، کس تمدّن نے اس الھڑ لڑکی کو اس طرح مہذب
بنایا تھا۔ اس میں یہ احساس جگایا تھا کہ ایک چھوٹی سی بات کے لیے کھائی کی
خاموشیوں کی ہو گئی ——— پچھڑا پن، جہالت ——— بے تہذیبی ———

اب میں جہاں رہتا ہوں وہ ایک بہت بڑا شہر ہے ——— بلند و بالا شہر ———
یہ ایک تنگ و تاریک گلی ہے اور جس چھت کے نیچے میں زندگی گذارتا ہوں اسے
یہاں گھر کہتے ہیں۔
میرے تین پڑوسی ہیں، جو آنے والے زمانے کے شہری ہیں۔ لیکن غلطی سے
وقت سے پہلے پیدا ہو گئے ہیں ——— ایک ہونے والا بہت بڑا مصوّر ہے
جوان ہے لیکن اس کی بہت بڑی داڑھی ہے اور کپڑے بہت ڈھیلے ڈھالے ہیں
دوسرا ہونے والا مشہور شاعر ہے۔ لگتا ہے وہ دراصل نہ کسی گھر میں رہتا ہے
نہ باہر وہ صرف اپنے اندر رہتا ہے۔ بالکل اپنے اندر۔ پوری طرح اپنے آپ کو
چھپائے ہوئے۔

تیسرا اس آنے والے زمانے کا بڑا فلسفی ہے جس کو یقین ہے کہ وہ اکیلا ہی اس ساری دنیا کو اپنی ایک نئی دنیا میں ڈھال لے گا ـــــ ان تینوں کے اطراف وہ سارے شہری پھیلے ہوئے ہیں جن کو دیکھنے سے لگتا ہے کہ وہ سب گذرے ہوئے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں ـــ میرے ان تینوں پڑوسیوں میں اور اس پرانی مخلوق میں کالے کوسوں کا فاصلہ حائل ہے ـــ

یہ تینوں ہر شام اپنی تاریک گلی سے نکل کر ایک دوسری تاریک گلی میں جاتے ہیں ـــ پھر رات کے اندھیروں کو اپنے وجود سے روشن کرتے ہوئے اپنی گلی کو اس طرح لوٹتے ہیں جیسے وہ واقعی اب ایک نئے زمانے میں قدم رکھ رہے ہیں ـــــ تینوں کے قدم لڑکھڑاتے ہوتے ہیں ـــــ تینوں کچھ گانے لگتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی دیر کو تینوں قہقہے لگاتے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ اب اس دھرتی پر صرف وہی تینوں وس ہیں۔

پھر باقی ساری رات ان کی کھلی کھلی آنکھوں کے سامنے سے گزرتی رہتی ہے ـــ بے معنی بے نیز رات ـــــ یہ پراسرار رات ایک نئی زندگی کو اپنی گود میں سنبھالے ہوئے ـــ

شاعر اس طرح ٹہلتا رہتا ہے جیسے اس کے پاؤں ہی نہیں۔ جانے کیسے کیسے خیال آتے ہیں وہ کبھی کبھی اچانک بھڑک اٹھتا ہے اور اس کا سارا وجود ایک شعلہ بن جاتا ہے رات کو روشن کرنے کے لیے ـــ

مصور کی لمبی داڑھی رات میں زیادہ لمبی نظر آتی ہے ـــ وہ جتنا سست نظر آتا ہے اتنا ہے اس کے اندر وقت اتنی ہی تیز رفتار سے گھوم رہا ہے ـــ اس کے ماتھے پر بہت سارا پسینہ ہوتا ہے ـــ وہ اندر ہی اندر کتنی محنت کر رہا ہے ـــ کام بہت اور وقت کم ہے ـــ صبح سے پہلے وہ سارے تصور تصویر بن جائیں۔ اور ایک نئی زندگی میں ڈھل جائیں۔

بڑا فلسفی ـــ پتہ نہیں کس طرح سر سے پیر تک سوچتا ہوا نظر آتا ہے ـــ کہیں

اس کے اندر درد ہو، کرب ہو، کوئی اسے سزا دے رہا ہو ــــ وہ دور دور تک
ہر سمت دیکھتا ہے۔ کہیں کچھ نظر آجائے، ایک روشنی ایک تجلی ــــ وہ مسلسل
لکھ رہا ہے، اس رفتار سے کہ رات بھی ساتھ دینے سے ڈر رہی ہے ــــ
صبح ہوتے ہوتے تینوں اپنی اپنی چھت کے نیچے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ محبت شب
کے جلے ہوئے ان تینوں سے پہلے اور ان تینوں کے بعد مجھے اگر کوئی چوتھی شخصیت
نظر آتی ہے اس شہر میں تو وہ ہے وہ کالی لڑکی ــــ سیاہ مرمر سے تراشی
ہوئی چکنی، چمکدار ــــ کسی رخ سے اسے دیکھیے جوانی ابھری ابھری نظر آتی
ہے ــــ ہر عضو اپنے ابھار میں ہو، تناؤ میں ہو یا گہرائی میں وہ عیاں عیاں سا
لگتا ہے۔ اپنے اشاروں کے ساتھ، کنایوں کے ساتھ ــــ اس کا سارا ہی بدن
بے لباس لگتا ہے کہ بدن روشن ہو ایسا! اپنے اظہار میں، اپنے تکلم میں وہ
چپ ہو، نظریں جھکائی ہوئی ہو یا اپنے خیالات میں کہیں کھوئی ہوئی ہو، اس کے
وجود کی ساری ہی کیفیات صرف جسم و جان میں چبھن پیدا کرنے والی سرگوشیاں
کرتی ہوتی ہیں اور یقین دلاتی ہیں کہ ــــ وہ اچھوتی ہے
پتہ نہیں کس تہذیب و تمدن نے مجھ میں اس کالی لڑکی کے لیے وہ جذبہ پیدا کر دیا
ہے جس کو میں ہمیشہ اپنے اندر ایک کرب کی طرح محسوس کرتا رہتا ہوں۔ سمجھ
نہیں کیسے یہ یقین ہو گیا ہے کہ ذہن میری اختراع ہے ـ ہو سکتا ہے اچھوت بھی ہو
ــــ پھر پتہ نہیں میں یہ سوچنا کیوں ضروری سمجھتا ہوں کہ ــــ وہ اچھوتی ہے
یہ کالی لڑکی بھی اس تاریک گلی میں رہتی ہے جہاں میں رہتا ہوں، شاعر رہتا ہے
مصوّر رہتا ہے اور وہ فلسفی رہتا ہے۔ اس تاریک گلی کی تاریک رات کی کوکھ سے
ایک نئی زندگی پل رہی ہے، آج میری سرشاری کا عالم دیدنی ہے ــــ جیسے کہ
سفر تمام ہوا جاتا ہے۔ میں خود تمام ہوا جاتا ہوں۔ وہ کالی لڑکی آج مجھ سے ملنے
والی ہے۔ اس بھرپور وعدے کے ساتھ کہ وہ ساری زندگی میرے ساتھ گزارے
گی۔ اس کے اس وعدے میں وفا کی خوشبو ہے، ایک یقین کا گہرا رنگ ہے ــــ

اور یہ بات بھی مجھ پر روشن ہے یہ بات میرے لیے کوئی راز نہیں کہ میرے جینوں
چھوٹے بیٹوں لئے اس کالونی کے اندر راہ پائی ہے، جو ور راستے سے —— لیکن
اس کے باوجود بہت ساری خوشیوں کے بیچ وہ مجھے بالکل اچھوتی لگتی ہے
ان بہت ساری خوشیوں کے ساتھ میں آج اس کا منتظر ہوں —— ساتھی
زندگی ساتھ گذارنے کے لیے ——

ظفر احمد

تین نظمیں

(۱)

بند اندھیرے کمرے میں
دھیرے
دھیمے
ہتھیلیوں کے پیچھے سے
پھینک رہا ہے
شعاعیں

۲

کیا
کہیں
جو چاہیں
ہو سکتے ہیں
چپ رہیں

۳

تیشۂ فرہاد
ہجرِ ہیر
وصالِ شاہجہاں
ہم کتنے لوگوں کا رہسیہ جانتے ہیں

ساحل احمد

چار نظمیں

۱

سرسراتی پیلی ندی
آنکھوں میں موت کی خاموشی
انگلیاں منجمد ——
میں ——
جنگل کے کونے میں
وشالتا کو ——
پہنچ چکا ہوں
بے انت ہو چکا ہوں

۲

کھیت میں آدمی کھڑا تھا
(آدمی کی طرح)
اور ڈنڈے کے اوپر
ہانڈی بندھی تھی
ناک، منہ، کان اور آنکھیں بنی تھیں
پرندے ڈر رہے تھے۔

۳

ایک ویران علاقہ میں
کچی دیواروں کے درمیان
مرے ہوئے
(یا مارے ہوئے)
جانوروں کی ہڈیاں جمع تھیں
(جو بہت دور دور سے لائی گئی تھیں
یا منگائی گئی تھیں)
گدھ اونگھ رہے تھے

۴

جب تل کے نیچے
دھوپ کھڑی ہوتی ہے
وہ اس کی دھار دودھیا چاندنی کی
نوک پر
روکتی ہے
اور لمبے لمبے ناخونوں سے
پپڑیاں نوچتی ہے
لذت ڈھونڈتی ہے

عبد الصمد تپش

ایک نظم

عقل و دانش کی ٹھنڈی پون جب چلے
ذہن کے بام و در آپ رکھئے کھلے
پچھلے مذہب، معقولے، باطل کریں لوگ جب
آپ بھی مان لینا

عقل و دانش کی دہلیز پر
اپنے سب فلسفے، نظریے، دائرے، تجربے
قتل کر دیں تو اک بات ہے
وقت کے ہاتھ میں جب نئی کوئی سوغات ہے
ہاتھ بڑھ کر اسے تھام لے

ٹھنڈی ٹھنڈی پون عقل و دانش کی جب بھی چلے
ذہن کے بام و در آپ رکھئے کھلے !!

چندربھان خیال

اندھے چاند کی پیدائش

بوڑھی بیمار تھلتھل شریر والی رات
اوندھی بے سدھ پڑی ہے
ایک اندھے چاند کو جنم دے کر
گہرا سردسناٹا
جھینگروں کے ہاتھوں میں سیٹیاں تھما کر
گہری نیند سو گیا
میں بھی اندھا ہو گیا

بائیں ہاتھ کی ہڈی کا نرم گودا
دائیں ہاتھ کی انگلیوں نے
کھرچ کھرچ کر پھینک دیا
اور خول میں سائیں سائیں
بجتی صدائیں
بار بار جلتی ہیں بجھتی ہیں
کالی کتیا کی زرد آنکھوں کی طرح
کالی کتیا بھورے پلوں کی تھوتھنوں میں
سوکھے تھن ڈال کر

آکاش کو گھورتی ہے

دور کوئی اکیلا
اس ماحول سے بھاگ کر
خود سے جدا ہو کر
پہاڑ کی چوٹی پر جا بیٹھتا ہے
پتھر پر پھیلی ہوئی اپنی جیبھ کو
پتھر سے کچلتا ہے
اپنے لہو کی گندھ سے بیزار
اندھے چاند کی طرح بے بس اور لاچار
پھر بھی جینے کو تیار

جیسے مندر کا پجاری
دیوتاؤں کی آرتی اتارتے وقت خود کو چھلتا ہے
تھالی کا دیپک اکیلا جلتا ہے
کیوں؟ میں تمہیں بتاؤں گا
چاہو تو پوچھ لو جا کر
کالی کتیا سے

ہرتپال سنگھ بیتاب

نظم

اکیلا چھوڑ دو مجھ کو
ہجومِ بے کراں کا ساتھ
میں دینے سے قاصر ہوں
پرندے : جو افق پر اڑ رہے ہیں
کس طرح ان کو میں کاغذ پر اتاروں
دھند میں لپٹے ہوئے نقطے اگر تصویر بن جائیں
انھیں عنوان کیا دو گے ؟
یگوں سے تم بہاروں کے ہو شیدائی
جب اپنے کھوکھلے جسموں کو دیکھو گے تو گھبرا جاؤ گے یارو!
یہی بہتر ہے اب
اپنی کتابیں باندھ کر سب
پھینک آؤ تم اندھیروں میں
جہاں تتلیاں اڑتی ہیں دیکھو ـــــــ دور گلشن میں
تعاقب میں نکل جاؤ
کبھی سرسبز تازہ موسموں کی بھی خبر لاؤ !

ہے۔ یہ فعلیاتی ماضی کے کسی تاتا بل فراموش واقعے سے گہری اور اٹوٹ وابستگی کا انعکاس
ہوتا ہے یا حال کی کسی تلخ حقیقت کا استعارہ یا مستقبل کی کسی تخیلی تصویر کا پیش خیمہ
جس میں احساس کی روح اور مشاہدات کی انگیخت بہرحال کروٹیں لیتی ہوئی دکھائی
رتی ہے۔ انسانی زندگی کے وہ نفسیاتی پہلو جن کی آفاقیت مستند رہی ہے ان کی ترجمانی
یرت کے کلام کو ایک ایسی سچائی کا حسن عطا کرتی ہے جس کے جمالیاتی رنگ روپ کی
ہہ میں روحانی قدروں کی آنچ بھی ہے اور اساطیری شعور کے رگ وریشہ کا تانا بانا بھی
یرت نے عصری رجحانات کو اپنے فطری رنگ وآہنگ میں غیر شعوری طور پر اس طرح
مو دیا ہے کہ اس کا انفرادی اسلوب اور بھی نکھر گیا ہے۔ چنانچہ سنجیدہ قاری جہاں اپنے
پ کو حیرت کے بنیادی تغزل کے بہت قریب پاتا ہے وہ جدید شاعری کی اچھوتی لذتوں
ے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔

یرت کے بارے میں یہ اکثر محسوس کیا جاتا ہے کہ اس قدر سلجھا ہوا شاعر ہوتے ہوئے
بھی وہ ادبی ماحول میں کم کم دکھائی دیتا ہے۔ دراصل آج سے پندرہ سال پہلے صورت
حال بالکل برعکس تھی۔ لیکن زندگی کے تلخ تجربات نے اسے کچھ ایسے سکی میلانات کی
رف موڑ دیا ہے کہ تنہائی پسندی اس کی فطرت بن گئی ہے اور غیر معمولی حساس ہونے
ی وجہ سے اسے اس گہری تنہائی کا احساس بھی ہے۔ وہ اس تنہائی کا مداوا بھی چاہتا
ہے بشرطیکہ یہ مداوا کسی کے فطری خلوص کی طرح "بے ارادہ ملاقات" کے روپ میں
بھائے کوئی اپنی آنکھوں میں "منظروں کی طرح سمیٹ لے" میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اگر
سے بے تکلف سہارے مل جائیں تو یہ نرم رفتار درویش شعر وسخن کی محفلوں میں معزز
مہمان بھی بن جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے کھلتا ہے مگر بے کراں ہو جاتا ہے۔
یرت کی ان چند غزلوں میں کیفیات کی چھلکتی اور ہمکتی ندی جس قدر شفاف ہے اس
قدر گمبھیر بھی ہے۔ تنگنائے غزل میں وہ وسعتوں کا معتقد ہے۔ اس نے کہا ہے

غالب کو تنگنائے غزل سے گلہ کیوں تھا
کیا وسعتیں سمو نہ سکا اختصار میں؟

رام پرکاش راہی

ہنراج حیرت

چھ غزلیں

۱

کہیں خلا میں کوئی بندش چھٹی ہو گی
مرا خیال ہے اب شام ڈھل چکی ہو گی

پڑھا تو تھا کہیں میں نے کسی فقیر کا قول
بغاوتوں کی نگہبان سپردگی ہو گی

میں خود سے محو تکلم تھا بے حجابانہ
مجھے خبر نہ تھی دنیا بھی سن رہی ہو گی

مرے وجود کو آہنگ بھی اسی نے دیا
مرے عدم کا سبب بھی یہی صدی ہو گی

حیات میں وہ تمام اسباب ہے اب کہ جہاں
نہ اعتقاد معاون نہ آگہی ہو گی

یہ جنوری کا مہینہ بھی کٹ گیا حیرت
خدا کے فضل سے کل ایک فروری ہو گی

۲

خود ہی اپنا راز خود ہی راز داں بن جاؤں گا
ایک لمحے کا یقیں ہوں پھر گماں بن جاؤں گا

حرف کی صورت زباں پہ ایک بار آنے تو دو
دیکھتے ہی دیکھتے میں داستاں بن جاؤں گا

ابتدا میں اک علامت تھا گزرتے وقت کی
انتہا تک اگلے وقتوں کا نشاں بن جاؤں گا

جب تراشا جا رہا تھا ذہن میں میرا بدن
کس نے سوچا تھا کہ میں شعلۂ امکاں بن جاؤں گا

ہوتے ہوتے وہم میں تحلیل ہو جاؤ گے تم
اور میں بھی ایک سعیِ رائیگاں بن جاؤں گا

حیرت ایسا ہی مشیت کا ہے شاید فیصلہ
جھلملاتی لو سے ابھرا ہوں دھواں بن جاؤں گا

۳

بہ مقدارِ نوا زِ حیراں تھا
میرا چہرہ مجھی پہ چسپاں تھا
بیقراروں نے میچ لی آنکھیں
سامنے ایک دشتِ امکاں تھا
کتنے سورج مجھے چبانا پڑے
میں کڑی دھوپ سے گریزاں تھا
تن تنک نوک مجھ سے بدظن ہیں
میں کبھی برگدوں کا مہماں تھا
غالباً بوالہوس تھے ہم حیرت
جذب بھی ورنہ قربِ ساماں تھا

۴

یہی شہر میں ہے، کہ اندھی ڈگر
یہیں تھا کہیں ہم فقیروں کا گھر
ہو مقصود میرا نظارہ اگر
کبھی بے ارادہ ملاقات کر
بہت چھا چکا وسعتِ ذہن پر
کبھی دل کی گہرائی میں بھی اتر
کمال ایک سیّال شعلے کا ہے
کہاں ورنہ خوابوں میں کوئی خبر
ستارے نگاہوں میں ڈھلنے لگیں
اس انداز سے اس ادا سے بکھر
جھپکنے لگے آنکھ حیرت میاں
بڑی سحر کُن ہے شمیمِ سحر

۵

کھڑے ہیں سامنے احباب اجگروں کی طرح
بلا رہا ہے بیاباں کھلے دروں کی طرح
خلا میں ڈوب نہ جاؤں کہیں مہک بن کر
مجھے سمیٹ لو آنکھوں میں منظروں کی طرح
نہ جانے کون ہے خالق ان آبگینوں کا
خیال ذہن میں آتے ہیں پیکروں کی طرح
اب اور ہی کوئی دنیا مجھے عطا فرما!
بساطِ دشت بھی محدود ہے گھروں کی طرح
اماں ملے گی مجھے جانے بحر و بر میں کہاں
گرا ہوں ٹوٹ کے اڑتے ہوئے پروں کیطرح
کماں عصر ہے بے چہرگی، مگر حسرت
سخنوروں سے تو ملیے سخنوروں کی طرح

۶

میں اکیلا بچاؤں گا کیسے اسے مجھ پہ چھوڑو نہ اس کی اماں دوستو
پھاڑ جائیں گی احساس کے شہر کو زندگی کی یہ ویرانیاں دوستو
قہقہوں کو بھی زعمِ رفاقت تو تھا لیکن ان کی یہ قسمت کہاں دوستو
غم ہی آخر بنا پاسبانِ جنوں، غم ہی ٹھہرا مرا رازداں دوستو
مجھ میں کیا بات ہے میں نہیں جانتا لیکن اتنا ہے مجھ پر عیاں دوستو
لاکھ چہرے بدل کر تم اس سے ملو، تم پہ ہوگا نہ میرا گماں دوستو
جب چلے تم ہمیں دیکھتا چھوڑ کر، چیختے تھے بصد کرب دیوار و در
روز ملتے نہیں دل سے دل دوستو، روز بستی نہیں بستیاں دوستو
میں خود اک خواب ہوں یا کسی خواب کی چلتی پھرتی ہوئی ایک تعبیر ہوں
اٹھ رہی ہیں سوالوں کی مانند کیوں میری جانب سبھی انگلیاں دوستو
یہ زمانہ تو گونگوں کا، بہروں کا ہے، تم بھی گونگے بنو تم بھی بہرے بنو
مت کہو اپنی رودادِ بے چارگی، مت سنو قصۂ دیگراں دوستو

نئی کتابیں

(تبصرے کے لیے کتابیں بھجوانا ضروری ہے)

نام کتاب : رشتہ گونگے سفر کا
مصنف : مظہر امام
قیمت : دس روپے
ناشر : شب خون کتاب گھر ۳۱۳
رانی منڈی - الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳

مظہر امام بنیادی طور پر ترقی پسند شاعر ہیں - اپنے شعری سفر کی ابتدا ہی میں وہ اُس دور کی عام روش کے مطابق ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے - زخم تمنا جوان کا پہلا شعری مجموعہ ہے اس دور کی یادگار ہے جب مارکسزم کے بارے میں کچھ پڑھے سُنے بغیر ادب میں انقلاب کا نعرہ بلند کرنا ایک فیشن بن چکا تھا - مظہر امام نے بھی بہت سے دوسرے نوجوان شعرا کی طرح اس فیشن کو جوں کا توں قبول کیا اور نتیجے میں وہ اس دور کے سکہ بند اور چالو قسم کے موضوعات پر نظمیں اور شعر لکھکر سرخ شاعری میں اضافے کا باعث بنے - زخم تمنا کا مطالعہ میں نے آج سے تقریباً ۲۰ - ۱۸ برس پہلے کیا تھا اور یہ محسوس کیا تھا کہ مظہر امام میں شعر گوئی کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں اور اگر انہوں نے شاعری میں اپنا راستہ الگ چن لیا تو یقیناً ان کے اندر کا فطری شاعر اپنی انفرادیت کا لوہا منوا لے گا -

ان کا دوسرا مجموعہ رشتہ گونگے سفر کا ادب میں جدیدیت کے عروج کے ساتھ طلوع ہوا، جو کسی قدر ان کی شخصیت کے انفرادی پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے - اس مجموعے کی پہلی نظم کے چند ابتدائی مصرعے ملاحظہ فرمائیں :

وہ الفاظ، جن کے سہارے کبھی ہم کلامی کے آداب سیکھے تھے میں نے
وہ الفاظ اپنے معانی کی کینچلی پھینک کر
دشتِ بے معنویت میں گم سم کھڑے ہیں

یہاں شاعر ہمیں ایک نئے روپ میں نظر آتا ہے - بے حاصلی کے احساس نے اس کے ذہن میں ایک ایسا اضطراب پیدا کر دیا ہے جس سے اس کی سوچ کا دھارا ایک نئی سمت میں بہنے کے لیے بیتاب نظر آتا ہے لیکن یہاں بھی پرانی سرخ شاعری کے مکروہ سایے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور اسے

صاف ستھرے مصرعوں کی قطاروں پر بوسیدہ بیعتوں میں مدفون، آرائش پسند کاکل اور بے معنی
ایسی ترکیب اور الفاظ سر اٹھا اٹھا کر اپنی موجودگی کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ اس مجموعے میں
شامل کئی اچھی نظموں کے ساتھ یہی صورت پیش آئی ہے۔ مثال کے طور پر:

عقیدے نیزوں کے زخم کھا کر سسک رہے ہیں۔
یقین کی سانس اکھڑ چلی ہے
دھواں خوابوں کے ہونٹ سے خاک دھوں کے شعلے ابل رہے ہیں
عزیز قدروں پہ جانکنی کی گرفت مضبوط ہو گئی ہے

——— اکھڑتے خیموں کا درد

زخم خوردہ عقیدوں پہ مرہم لگانے سے کیا فائدہ
اپنی مجبوریوں کی جبیں پر بھی اب جھریاں پڑ چلیں
اپنے غم پر بھی فرسودگی کی سفیدی جھلکنے لگی

——— دھوپ میں ایک مشورہ

وقت احساسِ خجالت سے جھکائے ہوئے سر
اپنی مجبور نگاہوں سے یہ کرتا ہے سوال
"کیا ترے شوق کی وارفتہ مزاجی ہے وہی؟"

——— کھویا ہوا چہرہ

نظموں کے یہ ٹکڑے دوسرے درجے کے ان ترقی پسند شاعروں کی یاد دلاتے ہیں جن کی مذکورہ بالا
اسلوب میں لکھی ہوئی عوامی نظمیں اب اپنی کشش کھو چکی ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ مظہر امام جو عصرِ حاضر
کے تقاضوں کو بخوبی سمجھتے ہیں اور جو "ایک صبح مری ہوئی" "گوشت کا نغمہ" "کھلے آسمان کے نیچے" "ٹھہرے
ہوئے لمحے سے پرے" جیسی نئے موضوع و اسلوب کی حامل نظمیں کہنے پر قادر ہیں، ابھی تک کچھ
بے رنگ لفظوں اور ترکیبوں سے اپنی شاعری کو جگہ جگہ سے کیوں داغدار بنا دیتے ہیں۔
ان کی کئی غزلوں کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا ہے۔ چہرۂ فردا، سرِ غم، دیدۂ بینا،
گنبدِ [illegible]، تندیِ صہبا، نکہتِ نغمہ، آواز جیسی عامیانہ ترکیبیں اور "چہرۂ مایوس پہ بھی بانکپن آیا تو ہے،"
"لو میں اپنے رستے ہوئے زخموں کی قبا لایا ہوں،" جیسی پامال زمینیں ان کی انفرادی پہچان کو مشکل بنا
دیتی ہیں۔ لیکن جہاں جہاں انھوں نے ترقی پسند شاعری کی استعمال شدہ لفظیات سے انحراف

ٹوٹتے ہوئے قدروں نئے محسوسات کے اظہار کے لیے لفظوں کو نئے انسلاکات کے ساتھ پیش کیا ہے
وہاں اشعار کی تازگی فوراً متوجہ کرتی ہے مثلاً :

دیواریں ہل رہی ہیں زمان و مکان کی
گرتا ہوا یہ گھر کوئی آکر سنبھال دے

زندگی کیا ہے مسلسل برداشت
خود کو اب توڑ کے باہر آؤں

خوشی سے آگ لگاؤ کہ اس محلے میں
مرا مکان ہی نہیں ہے تمھارا گھر بھی ہے

جاتے ہو تو بچوں کو بھی ساتھ اپنے لیے جاؤ
جب لوٹ کے آؤ گے تو یہ گھر نہ ملے گا

دوسروں کا قصہ بھی اب نیا نہیں لگتا
کون سا ورق الٹوں کس کی داستاں دیکھوں

آج کے دور کی تصویر دکھائی دے گی
آکے دیکھو یہ مکاں، چھت بھی نہیں، در بھی نہیں

ہم نے سنا ہے دھوپ کڑی ہے راہ میں موت بھی آجاتی ہے
جانے لوٹ کے کب آئیں گے دور سفر پر جانے والے

مظہر امام بھی کسی قدر اپنے پیش رو ترقی پسندوں کی طرح رجائیت کے پرستار ہیں۔ اگر وہ ترقی پسندا
کی شعری روایت سے رجائیت کو نکال کر بقیہ بوجھ اپنے کاندھوں سے اتار پھینکیں تو اردو کی

ئی شاعری میں ان کا انفرادی رنگ دور سے پہچان لیا جائے گا۔ رجائیت پرستی کوئی ایسی بری
یز نہیں جیسا عام طور پر میری نسل کے بیشتر شاعروں اور ادیبوں نے سمجھ لیا ہے لیکن زندگی کی تلخ
ور اُن حقیقتوں کے ادراک کے ساتھ اگر ہم آنے والی نسلوں کی زندگی کے راستے آسان
انے کی خاطر مظہر امام کی طرح خود میں تھوڑی سی رجائیت پیدا کر لیں تو نئی شاعری کے حق
یں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

○

نام کتاب : رشتۂ کلام
قیمت : دس روپے

مصنف : محسن زیدی
تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،
جامعہ نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵ -

محسن زیدی کی چند نئی غزلوں پر تعارفی نوٹ میں (سطور جلد ۵) میں نے لکھا تھا کہ
محسن زیدی نے غزل کی روایت سے صرف صحت زبان اور لطافتِ بیان کی حد تک استفادہ
یا ہے ورنہ نئے محسوسات کے اظہار کے لیے نئی لفظیات کا جراُت مندانہ استعمال کیا ہے" اور یہ بھی
ن کی غزل فنی تنظیم کے ساتھ ساتھ تخلیقی حسن کا احساس بھی کراتی ہے اور اپنے خالق کے بعض
ردی پہلوؤں کی پہچان بھی"

میری یہ رائے محسن زیدی کے زیر نظر مجموعۂ غزلیات رشتۂ کلام کے فلیپ پر دوسرے
ر ادا کے ساتھ بھی درج کی گئی ہے جسے پڑھ کر کچھ شعر فہم لوگوں نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ
ں نے محسن زیدی کے سلسلے میں نئے نئے محسوسات کے اظہار کے لیے نئی لفظیات کے جراُت مندانہ
تعمال" کی بات یوں کہی ہے۔ شاید یہ لوگ نئی لفظیات کے استعمال کے جملہ حقوق اپنے حساب سے
الاسکہ شعرا کے نام پہلے ہی سے محفوظ کرا چکے ہیں لہٰذا انہیں چاہتے کہ کوئی دوسرا شاعر ان پر اپنا حق
دعویٰ کرے۔

جن لوگوں نے محسن زیدی کے پہلے مجموعۂ غزلیات شہر دل (مطبوعہ ۱۹۶۱ء) کا مطالعہ کیا
ہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ ابتدا میں روایت کے کس قدر اسیر تھے۔ شعر تب بھی وہ صاف ستھرے
ور بے عیب کہتے تھے لیکن ان کے ہر ہر شعر میں دوسرے شعرا کی صدائے بازگشت صاف سنائی دیتی
تھی۔ شہر دل میں شامل بیشتر غزلوں کی زمینیں وہی تھیں، جو تیسرے درجے کے روایتی اساتذہ نے

کہ شعرا کو محبوب رہی ہیں، سر یہ اعالیہ، خمریاتی اور انقلابی، عاشقانہ اور صوفیانہ، نیم فکری اور نیم سیاسی روایتی غزل کے جتنے بھی رنگ ہیں ان سب کی جھلکیاں پختہ صورت میں مگر سکہ بند ترکیبوں اور مروّج ردیفوں اور قافیوں کے ساتھ شہر دل کی غزلوں میں جگہ جگہ مل جاتی ہیں۔ ایسی غزلوں کے مطالعے کے بعد کسی شاعر سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ آگے چل کر غزل کو قافیہ پیمائی کے درجے سے بلند کر کے اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بنائے گا۔ لیکن حیرت ناک اور مستحسن حقیقت ہے کہ محسن زیدی نے شاعر کے منصب کو پہچانا ہے اور اپنے اندر کے فطری شاعر کو روایت کے حصار میں زیادہ دیر تک اسیر نہیں رہنے دیا۔ ان کے تازہ ترین مجموعۂ کلام سے یہ چند شعر ملاحظہ کیجیے۔ ایسے اشعار اس مجموعے کے ہر ہر صفحے پر شعر کے سنجیدہ قاری کی توجہ کھینچ لیتے ہیں:

آج تک نہر ہے جس دشت کے سینے پہ رواں
پیاس میں قتل ہوا تھا وہیں لشکر اپنا

مجھ کو اس گوشے میں بس جلنے دو یونہی صبح و شام
بجھ گیا تو سارے آنگن میں دھواں ہو جاؤں گا

دشمنوں دشمنوں میں میل ہوا
زہر میں زہر مل گیا آخر

سیاست میں ماہر تھا دشمن مرا
مجھے تیغ دے کر سپر لے گیا

مدتوں سے مجھے اپنی بھی نہ پہچان رہی
جانے کس طاق پہ رکھ آئے ہیں چہرا اپنا

اک مکاں ڈھونڈ رہا ہے جو اسی شہر میں تھا
اپنے ہاتھوں میں لیے شہر کا نقشا کوئی

جب پچھلی رُت میں خود سے جُدا ہو رہا تھا میں
ایسی ہی کچھ فضا تھی یہی وقتِ شام تھا

نفی مقصود ہے ان کو میری
جمع جب ہوں گا گھٹا دیں گے مجھے

جدا ہوں سب سے تو انبوہ میں نہ شامل کر
مجھے الگ سے کوئی شخصیت نمایاں دے

ان اشعار میں نہ تو روایتی غزل کی ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں اور نہ ہی نئی غزل کے مروج
نعرہ لا جن سے آجکل ہر شاعر اپنا چراغ جلا رہا ہے۔ فیشن پرست شاعروں کے مجمع سے الگ
محسن زیدی نے اپنی انفرادی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے جن محسوسات کو اپنے اشعار میں
پیش کیا ہے ان کی تازگی و شادابی سے کوئی بھی سنجیدہ قاری انکار نہیں کرسکتا۔ محسن زیدی
موجودہ دور کے ان شعرا میں نہیں ہیں جن کے ہاں صرف درجن بھر محسوسات ہیں اور جو انہی
درجن بھر محسوسات کو الٹ پھیر کے ساتھ نت نئی ترکیبوں میں چھپا چھپا کر پیش کرتے رہتے
ہیں۔ محسن زیدی کی غزلوں کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کو اپنے طور پر جیا ہے۔
ان کے نزدیک زندگی صرف چند منظروں کی پابند نہیں بلکہ ہمہ جہت اور ہمہ رنگ ہے۔ لہٰذا اُن
کے ہاں محسوسات کی کمی نہیں۔ ان کا ہر شعر ایک نئے احساس کی خبر دیتا ہے۔

میں محمود سعیدی کے اس خیال سے متفق ہوں کہ محسن زیدی کے بعض اشعار میں سانحۂ
کربلا اپنی پوری معنویت کے ساتھ کار فرما نظر آتا ہے۔ ماضی کے حوالے سے موجودہ صورتحال
کو سمجھنے کی یہ کوشش لائقِ تحسین ہے اور نئے شعرا میں ایسی مثالیں خال خال نظر آتی ہیں۔
محسن زیدی نے لفظ و منظر اور داخلی و خارجی نواح میں جو معنی خیز اور فطری رابطہ

کیا ہے مجھے یقین ہے کہ اس سے جدید غزل کے نئے افق روشن ہوں گے۔

○

نامِ کتاب: حصارِ آب | مصنف: حیات لکھنوی
قیمت: دس روپے | ناشر: پی۔ کے۔ پبلی کیشنز، گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

حیات لکھنوی جتنے سنجیدہ، شائستہ اور پُرتکلف ہیں اتنی ہی سنجیدہ شائستہ اور پُرتکلف ان کی شاعری ہے۔ مجھ جیسے ان کے قریبی دوستوں نے بھی بہت کم موقعوں پر انھیں بے تکلف گفتگو کرتے دیکھا ہے۔ سنا جاتا ہے کہ وہ کبھی بے تکلف شاعرانہ محفلوں میں سرِ جام پر بے تکلفی پر اتر آتے ہیں۔ مگر حیات لکھنوی نے آج تک اپنی اس شائستگی کو بے حجاب ہونے کا موقع نہیں دیا۔ دہلی جیسے شہر میں رہتے ہوئے بھی۔ غور سے لکھنوی تہذیب جس طرح سینے سے لگا رکھا ہے اس کی مثال تو موجودہ لکھنؤ میں بھی مشکل سے ملے گی۔ روایت کو اس طرح اپنا لینا کہ وہ مزاج کا حصہ ہو کر رہ جائے کبھی کبھی عجیب صورتِ حال پیدا کر دیتا ہے۔ اپنی شخصیت کی نشو و نما کے لیے اور اپنے عہد کی محرومیوں اور محرومیوں کے ادراک کے لیے روایت سے رابطہ پیدا کرنا تو ایک حد تک ضروری ہے لیکن روایت سے خود کو اس قدر ڈھک لینا کہ اپنا چہرہ ہی نظر نہ آئے، کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے۔

حیات لکھنوی کے اس پہلے مجموعۂ غزلیات میں بیشتر غزلوں پر وارداتِ حسن و عشق کی ترجمانی کرنے والی اردو غزل اور لکھنوی کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ ان میں زندگی کی آب و تاب تلاش کرنا محال ہوتا۔ غالباً یہ حیات لکھنوی کی ابتدائی غزلیں ہیں جو اس مجموعے میں وافر تعداد میں موجود ہیں۔ شاعر کے ذہنی ارتقا کے مدارج سے قاری کو آشنا کرنے کے لیے اگر ایسی دو چار غزلیں ہی شامل کر لی جاتیں اور تازہ غزلوں کی تعداد کچھ اور بڑھا دی جاتی تو زیادہ مناسب ہوتا۔ اور اس صورت میں روایتی غزل کا رنگ اتنا حاوی نہ ہوتا۔

ادھر دو چار برسوں میں حیات لکھنوی نے عصری زندگی اور فن کے تخلیقی رویوں سے جو ذہنی اور جذباتی رشتہ استوار کیا ہے اس کے نتیجے میں کئی خوشگوار نتائج سامنے آئے ہیں۔ اول: غزل کی پامال زمینوں اور فرسودہ لفظیات و تراکیب سے گریز، دوم: شخصی اظہار کی کوشش میں نئے محسوسات کی پیش کش اور سوم: عصری زندگی کے مسائل سے ہم رشتگی کی بدولت موضوعاتی سطح پر

تازگی اور تنوع کی طرف پیش قدمی ۔

مندرجہ ذیل اشعار میں ان خوشگوار تغیرات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے، ملاحظہ کیجیے:

اسی سے خائف ہیں موسموں کی بے کیفی
جو سبز شاخ پہ اک زرد رو پرندہ تھا

کاش پھر آئے وہ معصوم زمانہ جس میں
شام سے پہلے ضروری ہو مرا گھر جانا

سوچتے رہتے ہیں ہم لوگ مگر مشکل ہے
اپنے اپنے در و دیوار سے باہر جانا

خدا کے واسطے مُہرِ سکوت توڑ بھی دے
تمام شہر تری گفتگو کا پیاسا ہے

یہ قتلِ جسم کی لذت کا جاں فزا احساس
وہ میری روح پہ احسان کر گیا جیسے

بڑے خلوص، بڑی سادگی سے ملتا تھا
وہ ایک شخص خدا جانے اب کہاں ہوگا

حیات اور کسی کو تلاش کیا کرتا
خود اپنے آپ کو ڈھونڈا تو دستیاب نہ تھا

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار عصری غزل کے نمائندہ اشعار نہیں ہیں۔ حیات لکھنوی کے ہاں فکر و نظر میں جو تبدیلی گزشتہ چند برسوں میں پیدا ہوئی ہے وہ کسی منصوبے کی پابند نہیں کہی جا سکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ تبدیلی یکدم ظہور میں آتی لیکن حیات کے یہاں ایسا نہیں ہوا کہ وہ رات ہی رات میں روایت کا کھونٹا اتار کر

اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو گئے ہوں بلکہ ان کے تخلیقی رویّے میں یہ تبدیلی دھیرے دھیرے اور فطری انداز میں آئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ دو شعر دیکھیے:

متاعِ چشمِ تمنا کی آس بنتا ہے
ٹپک پڑے تو ہر آنسو پیاس بنتا ہے

مجھے شہرِ تمنا دن میں بھی یوں ہی نظر آیا
کہ جیسے رات میں اُجڑے ہوئے بازار لگتے ہیں

یہ اشعار حیاتؔ لکھنوی کی اس ذہنی کیفیت کی یاد دلاتے ہیں جب وہ ایک طرف روایتی انداز سے خود کو دُور رکھنے کی کوشش میں تھے اور دوسری طرف شعر کے تخلیقی رویّوں کی جانب بھی ان کی پیش قدمی جاری تھی۔ ان اشعار میں اگرچہ ایک نیا احساس اور نیا معنی خیز منظر طلوع ہوتا ہے لیکن یہ کرشمہ ہر شعر کے دوسرے مصرعے کا ہے جس میں الفاظ کی فنی تنظیم قافیہ پیمائی کا حاصل نہیں بلکہ احساس کے نئے پن سے اس کے تخلیقی ربط کا نتیجہ ہے، جس سے ان اشعار کے پہلے مصرعے مفلس نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ اس ذہنی اور جذباتی کشمکش کے دور سے گزر چکے ہیں۔ ان کی تازہ غزلیں جن میں کچھ غزلیں اس مجموعے میں بھی شامل ہیں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ انہوں نے شعر کے نئے رویّوں کے پیشِ نظر غزل کو جس اعلیٰ تخلیقی عمل سے اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے، اس سے وہ جلد ہی نئی غزل میں اپنے لیے ایک مخصوص جگہ بنا لیں گے۔

—— کمار پاشی

جدید اردو ادب کے لیے

سطور

سال میں چار جلدیں

جلد: ۸
اپریل ۱۹۷۹ء

قیمت:
فی جلد: ۳ روپے
سالانہ: ۱۲ روپے

ترتیب

کمار پاشی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتا:
سطور پرکاشن، ۱/۳۲ دہلی گیٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اگلے صفحات میں

پرنٹر پبلشر : سطور پرکاش۔ خطاط : جمال گیاوی۔ مطبع : نعمانی پریس، دہلی۔

ایک ادبی مسئلہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ سنجیدہ ادبی رسائل کی تعدادِ اشاعت بہت کم ہے۔ عام قارئین جن میں بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی شامل ہیں سستے تفریحی ادب کی تلاش میں نیم ادبی اور نیم فلمی رسائل کی طرف بھاگتے ہیں۔ یہ بات واقعی توجہ طلب ہے اور اس پر یقیناً سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جانا چاہیے اور کوشش کی جانی چاہیے کہ سنجیدہ ادبی رسائل کی اشاعت میں توسیع ہو اور وہ وسیع حلقے تک پہنچ سکیں۔

ہندوستان کے بہت سے صوبوں میں اُردو اکیڈمیاں قائم ہیں اور انھیں ہر سال اُردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے حکومت کی طرف سے ایک معقول رقم امداد کے طور پر حاصل ہوتی ہے یہ رقم کس طرح استعمال میں لائی جاتی ہے اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

۱ : کتابوں کی اشاعت کے لیے مصنفین کو کُل خرچ کا نصف یا اس سے کچھ زیادہ حصہ بطور امداد۔

۲ : سال بھر کی مطبوعہ کتابوں میں سے منتخب کتابوں پر انعامات۔

۳ : چھوٹے بڑے کتب خانوں کو اُردو کتابوں اور رسائل

کی خرید کے لیے امدادی رقم

۴: حاجت مند ادیبوں اور شاعروں کو ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں مالی امداد وغیرہ وغیرہ۔

منتخب مسودوں کی اشاعت یا منتخب کتابوں پر انعامات کے سلسلے میں جو کمیٹیاں تشکیل کی جاتی ہیں اور ان میں جو لوگ شامل کیے جاتے ہیں ان کے کارناموں کی گونج تو سب نے سنی ہوگی اس بارے میں مزید کچھ کہنا لاحاصل ہوگا کہ ان کی رسائی صاحب اقتدار و با اختیار لوگوں تک ہے جن کے پاس عوامی شکایتوں پر غور کرنے کے لیے نہ فرصت ہے نہ فراغت کوئی غیرت مند ادیب با آواز بلند چلائے یا انعام کی رقم اچھالتا پھرے کمیٹیوں کے طریقۂ کار میں کسی قسم کی تبدیلی کے امکانات نہیں نظر آتے

اب رہا کتب خانوں کو کتابوں اور رسائل کی خرید کے لیے اور حاجت مند ادیبوں کو ان کی ادبی خدمات کے لیے مالی امداد دینے کا معاملہ تو اس سلسلے میں بھی شکایتوں کا ایک دفتر ہے کہ جس کا ذکر لاحاصل ہے۔ لہٰذا ہم کسی اردو اکیڈیمی میں کوئی نئی یا پرانی شکایت درج کرا کے شکایت ناموں میں کسی مزید اضافے کے حق میں نہیں ہیں ہم تو صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سنجیدہ ادبی رسائل کی توسیع اشاعت میں اگر اردو کی تمام اکیڈیمیاں دلچسپی لیں تو یہ رسائل تھوڑے تھوڑے وقفوں میں نکل کر بلکہ بہت دنوں تک زندہ رہیں اور سنجیدہ اور اعلیٰ ادب پیش کرتے رہیں اس کے لیے اردو اکیڈیمیوں کو صرف اتنا کرنا ہوگا کہ وہ سنجیدہ ادبی رسائل کی ہر ماہ معقول تعداد میں خرید کر ان کتب خانوں میں رکھوا دیں جن کو اکیڈیمی کی مالی امداد حاصل ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ تمام اردو اکیڈیمیاں اس پر غور کریں گی کیونکہ یہ شکایت نہیں ایک ادبی مسئلہ ہے۔

[illegible] ۱ [illegible]

۵

محمد علوی

دلّی

دلّی تیری آنکھ میں تنکا
"قطب مینار"
دلّی تیرا دل پتھر کا
"لال قلعہ"
دلّی تیرے بٹوے میں
"غالب کا مزار"
رہنے دے
بوڑھی دلّی!
کپڑے نہ اُتار

۶

رشید امجد

طناب ٹوٹا خیمہ

یہ شہر بہت پُراسرار ہے۔ یہاں لوگ جاگ رہے ہیں پھر بھی سو رہے ہیں۔ سو رہے ہیں پھر بھی
جاگ رہے ہیں۔

سڑک کے بیچ بیچ اس منڈیر پر جو اس چوڑی سڑک کو دائیں بائیں تقسیم کرتی ہے، بمشکل
توازن درست کرتی ایک عورت، ایک مرد اور ان کے درمیان ایک گول مٹول بچہ —— سڑک
پار کرنے کی کوشش میں ایک قدم اُٹھاتے ہیں لیکن سنسناتی گاڑیوں کی سیٹیاں انھیں پیچھے دھکیل
دیتی ہیں۔

چوک میں ٹریفک کا سگنل سُرخ ہوتا ہے۔

دونوں بچے کو بازوؤں سے پکڑ لیتے ہیں اور ڈولی ڈنڈا —— ڈولی ڈنڈا کرتے
سڑک کی پچھلی بانھوں میں اُتر جاتے ہیں۔

بچہ بازوؤں میں جھولتے ہوئے ہنستا ہے —— غوں —— غوں غوں۔

نظر دوڑاتا ہے۔ دائیں ہاتھ ٹیلے کے ساتھ جڑے پانچ چھ کیکر کے درخت ہیں۔ اوپر سے یہ الگ دکھائی
دیتے ہیں۔ لیکن نیچے جاکر ایک ہو جاتے ہیں۔ زمین دور دور تک کٹی پھٹی ہے۔ اونچے نیچے ٹکڑے،
گندم کی سبز نالیاں جن میں پیلا بہت جھلملا رہی ہے۔ بائیں طرف درختوں کا ایک خاموش
جھنڈ، کھیتوں کے درمیان خاموش سوتی ہوئی پگڈنڈی۔

تینوں سڑک کے دوسری طرف پہنچ گئے ہیں۔ بچے کو فٹ پاتھ پر کھڑا کر کے مرد گزرتی
ٹیکسیوں کو ہاتھ دے رہا ہے۔

ایک ٹیکسی ان کے قریب رک جاتی ہے۔

وہ بچے کو بازوؤں میں جھلائے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ بچہ اُچک اُچک
کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ٹیکسی کی رفتار تیز ہوتی ہے پھر کم ہونے لگتی ہے۔

برابر کی گلی میں سے بھینسوں کا ایک قافلہ لپکتا ہے اور سڑک عبور کرنے لگتا ہے۔

مرد ہنستا ہے۔

عورت اس کی طرف دیکھتی ہے تو کہتا ہے ——— اس سڑک پر جیپیں اور بھینسیں
صدی ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔"

ٹیکسی بھینسوں کے درمیان سے راستہ بنانے کی کوشش میں ایک اور گاڑی سے
ٹکرا جاتی ہے۔

دونوں ڈرائیور نیچے اُتر آتے ہیں اور ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرانے کے لیے
زور زور سے بولتے ہیں۔

پیچھے دور تک ٹریفک رکی ہوئی ہے۔

بھینسوں والا بڑے مزے سے ——— ہو ہو کرتا چلا جا رہا ہے۔

ٹیلے کے چاروں طرف ایک پُراسرار خاموشی ہے۔

اکا دکا درختوں کے ساتھ چلتی پگڈنڈی ڈھلوان کی طرف مڑنے لگتی ہے۔ اس
سے آگے گہری کھائی ہے۔ اتنے سالوں میں بھی اس پر پل نہیں بن سکا۔ کھائی کے دوسری
طرف جرنیلی سڑک ہے جس پر سارا دن ٹرک، بسیں اور کاریں دوڑتی رہتی ہیں۔ کھائی
سے اس طرف خاموش کھیت ہیں، یہاں رات پھیلی ہوئی آتی ہے اور یاد کو پیار کر

لیٹ جاتی ہے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی سورج گھر کے آنگنوں میں جھانکیاں مارنے لگتا ہے۔

گو ——— گو کی آواز وقفوں وقفوں سے چاروں طرف گونجتی ہے۔ ایک ہی

لے ——— ایک ہی سُر میں۔

ٹیکسی ایک چھوٹی سڑک پر دوسری گاڑیوں کے ہجوم میں گھری قدم قدم چل رہی ہے

بچہ اچھل اچھل کر کھڑکی کی طرف لپکتا ہے۔

"دیکھو، دیکھو شیشے سے سر نہ ٹکرا جائے" مرد عورت کو خبردار کرتا ہے، اونچے

ٹیلے پر بیٹھا وہ سامنے والے کھیت میں کام کرتی ایک عورت اور اس بچے کو دیکھ رہا ہے۔

عورت چھوٹے چھوٹے کچے پودے توڑ رہی ہے اور بچہ انہیں گڈیوں میں باندھ رہا ہے۔

سورج کی کرنوں میں جوانی کا گرم خون دوڑنے لگا ہے، وہ جسموں پر چٹکیاں لینے

لگی ہیں۔

پسینے میں ڈوبی ہوئی عورت اور بچہ۔

چھولئے، سود اور گیہوں کی مسحور کن خوشبو۔

اور مسلسل ——— گو ——— گو،

ٹیکسی آگے پیچھے کے رش میں اب تقریباً رک گئی ہے،

بچہ شیشے میں سے جھانکتے ہوئے مسلسل غوں غوں ——— غوں غوں

کر رہا ہے۔

عورت کہتی ہے۔ "——— دیکھو منا باتیں کرنے کی کوشش کر رہا ہے"۔

بچہ سن کر ——— "اُم آکاں ——— کنکاں ——— کاں" کرتا ہے"

"دیکھا ——— دیکھا" عورت خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔

مرد مسکراتا ہے ——— ایک گہری پُراسرار مسکراہٹ۔

"بس بولنے کا چاؤ ہی ہوتا ہے۔" وہ مسکراتا رہتا ہے ——— "ہم بول سکتے

ہیں مگر کیا واقعی بول سکتے ہیں؟"

بچہ اس بات سے بے نیاز، شیشوں میں جھانکتے ہوئے ——— غوں، غاں،

آکناں ——— کاں کا" کرتا رہتا ہے۔

آگے ایک مانگے والا بدکے ہوئے گھوڑے کو رام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مسلسل بیپ بیپ میں مصروف ہوتی گاڑیوں کی لمبی قطار،

ایک موٹر سائیکل ٹیکسی کے برابر آ رکتی ہے۔ موٹر سائیکل پر ایک جوان جوڑا بیٹھا ہے۔ لڑکے نے جین کی جیکٹ اور پتلون پہنی ہوئی ہے۔ لڑکی نے پتلون نما پائجامہ اس کے کھلے گلے میں سے سینے کی گولائیاں نمایاں ہو رہی ہیں۔ اُس نے لڑکے کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال رکھا ہے،

ٹیکسیوں کے پیچھے بیٹھے سارے مرد اسے دیکھتے، ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور منہ سے ہاں ہائے کرتے ہیں۔

سڑک کے دوسری طرف فٹ پاتھ پر دو عورتیں سفید ٹوپی دار برقعہ پہنے سڑک پار کرنے کی جستجو میں کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر جاتی ہیں۔ ان کے لمبے خیمہ نما برقعے ان کے لیے مصیبت بنے ہوتے ہیں جو بار بار ان کے پاؤں میں اُلجھتے ہیں۔

ٹیلے پر بیٹھا وہ خاموش چپ نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہے، عورت اور بچے نے بھاری گٹھڑیاں سروں پر رکھ لی ہیں اور مزے مزے پگڈنڈی پر چلتے جا رہے ہیں۔

گھوڑا تانگے والے کی مسلسل کوششوں کے باوجود نہیں مان رہا۔ سیٹرنگ کے پیچھے بیٹھے سارے پوں پوں کر رہے ہیں۔ برابر کی گلی سے ایک بیل گاڑی نکل کر ٹیکسی کے دوسری طرف آن کھڑی ہوتی ہے۔

بچہ شیشوں میں سے جھانکتا ہے ——— "اماں ——— کاں کاں" کر رہا ہے بکا ہوا گھوڑا۔

اس کے پیچھے گاڑیاں، بیل گاڑیاں، موٹر سائیکلوں کی قطاریں رفتہ رفتہ ساکت ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ایک پُراسرار شور

شور ہی شور

دفعتاً ٹیکسی ڈرائیور کو احساس ہوتا ہے کہ پچھلی سیٹ پر گہری خاموشی ہے۔

وہ تیزی سے مڑتا ہے

پچھلی سیٹ خالی ہے

وہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور اس کی نظریں دکانوں پر لگے سائن بورڈوں پر جا رکتی ہیں۔

عورت چائے کے ایک اشتہار پر چپکی ہوئی ہے۔
سو سگریٹ کے ایک اشتہار پر کھڑا ہے
اور بچہ ——— دودھ کے ایک اشتہار پر گلاس ہاتھ میں لیے کچھ کہہ رہا ہے۔
یہ شہر بہت پُراسرار ہے یہاں لوگ جاگ رہے ہیں، پھر بھی سو رہے ہیں، سو رہے ہیں پھر بھی جاگ رہے ہیں۔

●●

مظہر الزماں خاں

پہلا اور آخری آدمی

وہ سب کے سب سائبان درختوں کے نیچے لیٹے ہوئے تھے۔ اُن کے جسموں پر تہہ در تہہ گرد جمی ہوئی تھی اور گردنوں میں تحفظ کے پروانے جھول رہے تھے جو آتے وقت ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے کہ اب وہی اُن کی ساعتوں کی ضمانت تھے۔ تاہم ہر آہٹ پر اُن کے سینوں میں بیٹھے ہوئے پرندے پھڑپھڑانے لگتے تھے تو انھیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب وہ اُڑنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ اور اگر کوئی پرندہ کسی کے سینے سے اُڑ جاتا تو اس کی جگہ دائرہ بنا دیا جاتا تھا کہ وہی اس کی زندگی کا حاصل تھا۔

راستے لوح پر کھینچی ہوئی ان گنت لکیروں کی طرح گڈمڈ ہو چکے تھے۔ اور چاروں طرف دکھائی نہ دینے والا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ اور وہ زمین سے اُٹھ کر کبھی کبھی گھٹنوں کے بل۔ بڑی مشکل سے چند فٹ کا فاصلہ طے کر لیتے تھے تو ان کے پھیپھڑوں میں دھواں بھر جاتا تھا۔ سانسیں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی تھیں اور سینے کے اندر بیٹھے ہوئے پرندے کی بینائی دھندلاہٹ

اور راستہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ سب کے سب درخت سے گرے ہوئے پتّوں کی طرح زمین پر بکھرے پڑے تھے کہ دفعتاً ایک وجود نے اپنے قریب لیٹے ہوئے دوسرے وجود سے کہا۔

"سُنو!"

"برسوں سے سُن رہا ہوں کہ اب سُنتے رہنا ہی زندگی کی غذا بن چکا ہے۔"

"کیا ہم میں کوئی بینائی والا ابھی موجود ہے۔ جو ہمیں دیکھ کر پہچان سکے۔"

"پتا نہیں! وہ بولا۔ "ہم تو صرف صورِ اسرافیل کے منتظر ہیں۔ تاکہ اس طلسمی زمین سے چھٹکارا مل سکے۔"

"آؤ مل کر ڈھونڈیں اور اسے راہبر بنا کر آگے بڑھیں۔ تاکہ جہاں سے آئے تھے وہیں جانے میں کچھ سہولت ملے۔ اب آگے بڑھنا دشوار ہو گیا ہے اور لیٹے ہی لیٹے ہمیں جڑیں پیدا ہو رہی ہیں۔"

"ہر بینائی والا ہمیں ہاتھ کا پتھر سمجھ کر استعمال کرتا ہے۔" وہ بولا۔ "اس لیے بینائی والوں پر اعتبار نہ کرو۔ انھیں تیسری آنکھ پیدا ہو چکی ہے اور وہ نیلاہٹ کا شکار ہو گئے ہیں۔"

"پھر ہم کس طرح اس دکھائی نہ دینے والے دھوئیں سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔ جو زمین چھوڑتے ہی ہمارے اعضا کو چاٹنے لگتا ہے۔"

"اب یہ ناممکن ہے۔" وہ بولا۔ "نہ ہم دھوئیں کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ وہ ہمیں چھوڑ سکتا ہے۔ کیونکہ اب دونوں میں ایک رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ اور اس رشتے کو توڑنا سنگین جرم ہے۔ اس لیے ہم نہ دھوئیں سے رشتہ منقطع کر سکتے ہیں اور نہ وہ ہم سے الگ ہو سکتا ہے۔ اور پھر ہمارے اعضا اب اُس کو قبول کرنے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ہم برسوں سے بہرے ہیں۔ سیاست گزیدہ ہیں اور بستیوں کو چھوڑ چکے ہیں۔"

"لیکن میرے اعضاء ابھی تک اس سے رشتہ قائم نہیں کر سکے اور میں جب بھی دھوئیں سے رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں، وہ مجھے پوری طرح چاٹ لینا چاہتا ہے۔"

"تم ابھی نئے آئے ہو۔ آہستہ آہستہ عادی بن جاؤ گے۔"

"میرے لیے یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ میرے اعضا دھویں کو کبھی قبول نہیں کر سکتے۔"

"بڑے بڑے مفکر، فلاسفر، دانش ور، ادیب، ٹوٹ چکے ہیں بھائی" وہ بولا۔

"پھر تم اپنے آپ کو کیسے ———— بچا سکتے ہو ———— یہ دھواں ہزاروں امراض کا مرکب ہے ———— اس سے بچنا ناممکن ہے ———— لہٰذا میری مانو۔ اور سمجھوتہ کر لو۔ اب فرار ہونا دشوار ہے۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا ہے۔ اور ہم سب گھٹنوں کے بل بھی بڑی مشکل سے چل سکتے ہیں۔"

"یہ کیسا دھواں ہے؟!" ایک اور وجود نے کہا۔ "جو دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن جب ہم اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں گھیر لیتا ہے۔ اور ہمارے جسموں کو چاٹ لیتا ہے۔"

"غور سے سنو!" وہ بولا۔ "اس دھویں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ہم اُسے دیکھ نہیں سکتے۔ وہ ہمیں دیکھ لیتا ہے۔"

"اس کو روکنے کے لیے کوئی تدبیر سوچو۔ تاکہ آنے والی نسلیں اس سے محفوظ رہ سکیں۔"

"جب ہم خود محفوظ نہیں رہ سکتے تو پھر آنے والی نسلوں کا کیا سوال ہے۔"

"دھواں کہاں سے آرہا ہے۔ اس بات کا اندازہ تو لگایا جا سکتا ہے۔"

"ایک ایسا دھواں جو دکھائی نہ دیتا ہو۔ بھلا وہ کہاں سے آرہا ہے۔ یا کس سمت سے آرہا ہے، کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ یہ باضابطہ ایک ہی مہم چلائی جارہی ہے۔ اور اس مہم میں ان گنت دماغ کام کر رہے ہیں۔ جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ کسی طرح بھی ہم اپنے پیروں پر کھڑے نہ رہ سکیں۔ اور زمین پر لیٹے لیٹے ہی خود رو پودوں کی شکل اختیار کر لیں۔ اور اس کام کے لیے انھوں نے ایک ایسا دھواں ایجاد کیا ہے جو دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اعضا کو چاٹ لیتا ہے۔"

"ان دھنوں کا سراغ لگانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ورنہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں بچ سکے گا۔"

"ہاں! کوشش تو کرنی چاہیے۔" دوسرے نے کہا۔ "مگر ہم میں کوئی ایسا جی دار موجود نہیں ہے کہ وہ ان دھنوں تک پہنچ سکے۔ اور انھیں پکڑ کر منظرِ عام پر لے آئے۔

گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے قریب کرا دیتے ہیں۔"

"ہمارے پاؤں ہمارا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔" پہلی بار سبھوں نے گردنیں اٹھا کر اجنبی لہجے میں کہا۔ "اس لیے تم اٹھ کر معلوم کرو کہ دھواں کہاں سے آرہا ہے۔ پھر ہم سب تمہارا ساتھ دینے کے لیے اپنے پاؤں کو کھالیں گے اور پھر تمہیں اپنے پاؤں پر کھڑا دیکھ کر ہمارے پاؤں کو بھی شرم آئے گی۔"

"ٹھیک کہتے ہو!" وہ تمسخرانہ انداز میں بولا "میں ہی ہمت کرتا ہوں!" — اور پھر دفعتاً وہ اٹھ کر پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا تو سبھوں نے بیٹھے ہی بیٹھے تالیاں بجا بجا کر اُس کی جرأت کی داد دی اور اُسے دنیا کا پہلا اور آخری آدمی قرار دیا۔ اور وہ بڑے مسرورانہ انداز سے آگے بڑھنے لگا تھا کہ معاً دھواں اُس کی ناک کے راستے سے اندر داخل ہو گیا اور وہ بے اختیار کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے وہ لڑکھڑایا اور پھر تحفظ کی خاطر درخت کے ایک تنے کو پکڑنے کے لیے وہ جوں ہی دوڑا۔ اُس کے سینے کے اندر بیٹھا ہوا پرندہ بینائی سے محروم ہو گیا اور وہ دھڑام سے گر کر ساکت ہو گیا تو سبھوں نے تالیاں بجائیں اور اس کی بے وقوفی پر ہنستے ہنستے نڈھال ہو گئے۔

●●

چار کنڑ نظمیں

ایک نظم : کے، وی، ٹپّا
تُلسی : وینوگوپال سُرب
مُبحر : سری کرشنا اَدن ھلی
گواھی : بی، پرکاش

انتخاب اور ترجمہ

حمید الماس

کے۔ وی۔ پٹپّا

ایک نظم

تمھارے جسم کے میدان کا شاطر کھلاڑی ہوں
تمھاری چھاتیوں کی چوٹیوں پر اس طرح رہتا ہوں
جیسے کوئی سادھو ہو تپسیا میں
تمھارا جسم ہے شیر و شکر گویا
ہمیشہ گرسنہ لب چوستے رہتے ہیں شیرینی
بدن سونگھوں تو بوے یاسمیں محسوس ہوتی ہے
سنو
میرے لیے تم سرخ مائل خوبصورت سے کنول کا باطنی حصّہ ہو
اس خاموش وادی میں
کسی موہوم طائر کی طرح
ہر پل
مری پرواز جاری ہے
مگس بن کر
ہمیشہ ساتھ رہتا ہوں
تمھارے جسم کا نشہ مجھے سرشار رکھتا ہے
کہاں جائے گی تم کو چھوڑ کر دیوانگی میری

کے۔وی۔ پٹپّا کلاسیکی شاعر ہیں۔ انھوں نے افسانے، ناول، ڈرامے اور تنقید بھی لکھی ہے۔ اکثر اساطیر کو بنیاد بنا کر نظمیں کہتے ہیں۔ ان کی شعری کتاب [illegible] میں جرأتِ اظہار کے نمونے ملتے ہیں۔ اس کتاب پر انھیں [illegible] ایوارڈ مل چکا ہے۔

وینو گوپال سُرب

لُوسی

بھورے بالوں میں قید ہے چہرہ
پھر بھی روشن ہیں اس کی آنکھوں سے
ناک، رخسار، ہونٹ، پیشانی
صبح میں جیسے شام کا منظر
کب سے بارِ گراں ہے شانوں پر
کوئی اس کا شریکِ رنج نہیں
بیس کی حد سے وہ نہیں آگے
کوئی دیکھے جوان لُوسی کو
وہ کہ
اٹھ میں کہ چھتیس کہ اُس سے کم ہے
اس کو چولی سے یا ساری سے چھپاؤں کیسے
کھو گیا اس کے بدن کا جادو
روپ لیکن پلٹ کے آتا ہے
جام لبریز کی طرح شب کو
جب وہ بزمِ ہوس میں پھرتی ہے
ساز کی دُھن پہ رقص کرتی ہے
پھُول کی نرم پتیوں کی طرح
ٹوٹ کر انگ انگ گرتا ہے

لگ اس کو ٹھوکر دیتے ہیں
ہائے ٹوسی
یتیم
جس کے پتا
کھو گئے ارضِ ویت نام میں

ماں
گم ہوئی وحشت پڑ جوں میں کہیں
کوئی آتا پتا نہیں بنتا
پھر بھی اس کو عزیز ہے بھارت

دیوگوپال مُترپ اکثر اپنی نظموں کے موضوعات کو جنس اور محبت کے رنگوں میں برتتے ہیں البتہ یہ انداز ان کی پہچان بن گیا ہے۔ ٹوسی ان کا شعری مجموعہ ہے۔ ایک قصباتی کالج میں انگریزی کے استاد ہیں۔

سری کرشنا اَرُن ھلّی

صُبح

جب اندھیری شب کی عریاں گود سے سورج نکلتا ہے
اور اُٹھتی ہے قصائی کی دُکاں سے
ابلی کالی بکریوں اور مرغیوں کے گوشت کی مخصوص بُو
تب کہیں اُس گانو میں ہوتی ہے صبح

اوّلیں اخراجِ خوں کے درد سے روتی ہوئی
کنڑ پجاری کی اکیلی بے زباں لڑکی کو سمجھانے کی خاطر
جب ہوا آتی ہے رُکتی ہے
مگر بالوں میں پھر لوٹ جاتی ہے
تب کہیں اُس گانو میں ہوتی ہے صُبح

جب شکاری سُرخ کتّے کی طرح
اپنی اٹھارہ سال کی جلتی زباں لٹکائے
گانو کا پٹیل
پوری شدّت سے ہوس کی سانس لے کر
آگ کی کشتی میں کرتا ہے سفر
تب کہیں اُس گانو میں ہوتی ہے صبح

گندے کپڑوں کی صفائی کے لیے
بہتے دریا کے قریب
جانے والی عورتوں کو دیکھ کر
چونکتی ہے مادرِ خرگوش جب
(یہ وہ خرگوش جس کو سر سے کتّے نے دبوچا تھا کبھی جھاڑی کے پاس)
تب کہیں اُس گاؤں میں ہوتی ہے صبح

جب ندی میں
ساٹھ سالہ گاؤں کا پٹواری
منتر پڑھتے پڑھتے
دیکھتا ہے
عورتوں کے اندرونی جسم کے حصّوں کو
بکھر آتا ہے چاروں اور پھر گندی ہنسی
تب کہیں اُس گاؤں میں ہوتی ہے صبح

سری کرشنا الفت بھی اگرچہ محفلِ شعر میں نووارد ہیں لیکن ان کا اسلوب پختہ ہے اور نئے محسوسات کی پیش کش سے ان
کی رازدارانہ [illegible] کا پتہ چلتا ہے [illegible]

ج۔ پرکاش

گواہی

کون آیا
کس نے میرے جسم کو نوچا
گرایا
کون
بغلوں میں ہوس کی بو بسائے
صبح لوٹا
یہ میرا بستر ہی شاید کہہ سکے گا۔

ج۔ پرکاش نے اپنا شعری سفر ابھی ابھی شروع کیا ہے۔ ان کے لہجے میں احساس اور فکر کی چمک ملتی ہے جو ان کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ وکالت کرتے ہیں۔

۲۴

زُبیر رضوی

کھڑکیاں کھول کے جب صبح کا چہرا دیکھوں
شاخ در شاخ پرندوں کو چہکتا دیکھوں

دھوپ کے جسم پہ بوندوں کو چمکتا دیکھوں
دُور بادل کو پہاڑوں پہ برستا دیکھوں

ٹھنڈے موسم کا بدن آگ کا دریا مانگے
اور میں چار طرف برف کا صحرا دیکھوں

ننگے پیڑوں کو سرِ شام اکیلا پا کر
پھڑپھڑاتا ہوا موسم کا پرندا دیکھوں

دستِ آوارہ کہیں بندِ قبا کھول نہ دے
اس کو سویا ہوا بستر پہ اکیلا دیکھوں

کشتیاں سوئی ہیں سر رکھ کے کناروں پہ زبیر

عتیق اللہ

ہوا سخت ہے سنگین بہت ساعت ہے
مگر یہ جسم کہ ثابت ہے، جاں سلامت ہے

یہ بوند بوند اذیت، نشان و نام ترا
یہ تھر تھر بدن، تجھے ہی عبارت ہے

یہ بین کرتا ہوا شہر، یہ نواحِ زیاں
یہ زندگی، کہ ترے سامنے اکارت ہے

خوش آ سکا نہ اسے ہی کوئی بساطِ کشاد
یہ تنگ حوصلہ دل، جو تری امانت ہے

بس ایک ساعتِ دیر آشنا کی راہیں ہیں
نہ دیکھنے کی نہ کچھ سوچنے کی مہلت ہے

نئی مثال بنا، طرز میں جدا بھی رکھ
پرانے لفظ ہیں وعدہ کوئی نیا بھی رکھ

ہوا و سمت سے خالی نہیں کوئی پیکر
سفر تمام نہ کر، قصد دوسرا بھی رکھ

گریز کرتا ہوا مشت بھر سماں کا نصیب
زباں پہ مشعلیں دھر ہاتھ میں صدا بھی رکھ

ابھی ابھی میں بدل جائیں گے سبھی منظر
مکاں سے دور نہیں کوئی مدعا بھی رکھ

کھلا نہ چھوڑ گریبانِ تہہ آلودہ

سلیم شہزاد

رہا وہ شہر میں جب تک بڑا دبنگ رہا
مگر خود اپنے خلاف آپ محوِ جنگ رہا

فتادگیِ جنوں کو کہیں پنہ نہ ملی
زمین تنگ ہی تھی، آسماں بھی تنگ رہا

ہوئی جو صبح تو بے برگ و بار تھے اشجار
تمام رات ہوا کا عجیب رنگ رہا

انا پسند تھا، بیساکھیوں کو ٹھکرا کے
رہا وہ سرکش و باغی مگر اپنگ رہا

خبر خبر میں اُسے جستجو رہی اپنی
وہ چھوٹے شہر میں بھی صیدِ نام و ننگ رہا

بجز درید و بُرید اور کیا ہے اس کا مآل
وہ پھر بھی ڈور سے ٹوٹی ہوئی پتنگ رہا

سیہ جزیرہ (سمندر میں آفتاب بدست)
زمیں سے ٹوٹ گیا اور زمیں کا انگ رہا

دیا ہے اس نے ہمیں ایک شورِ بے آہنگ
ہزار سال جو دورِ رباب و چنگ رہا

یہ آئینہ رہا خطِ شکست سے محروم
سلیم محوِ غمِ انتظارِ سنگ رہا

حیات لکھنوی

شگفتہ لہجہ بیاں میں رچاؤ کیسا ہے
ترے مزاج میں یہ رکھ رکھاؤ کیسا ہے

نظر نظر ہے اک اٹھتا ہوا دھواں جیسے
نفس نفس یہ سلگتا الاؤ کیسا ہے

تمام شہر کی آنکھوں سے ہو کے پوشیدہ
خود اپنی ذات سے اپنا بچاؤ کیسا ہے

ستاروں سے فضائیں محیط ہیں لیکن
اداسیوں کا دلوں میں پڑاؤ کیسا ہے

اندھیری رات فلک سے یہ پوچھتی ہوگی
حیات نورِ سحر کا بہاؤ کیسا ہے

اظہار سلیم

کوئی خوابوں کے خزانوں کو چرا لے جائے
نیند آنکھوں کے مقدر سے اڑا لے جائے

کب سے ٹھہرا ہوں فضا میں کسی بادل کی طرح
جس طرف چاہے مجھے آج ہوا لے جائے

پھر مرے شہر میں آئے کوئی سورج کی کرن
نوچ کر جسموں سے رنگین قبا لے جائے

دل سمیٹے گا لہو آنکھ سے قطرہ قطرہ
رات اشکوں کے چراغوں کو سجا لے جائے

آگ ہی آگ تو اعصاب میں ہے جانے کب سے
کیا پتا کون سی بستی میں انا لے جائے

اختر بستوی

جب رات کی بانہوں میں تن من کی تھکن جاگی
احساس کے بستر پر دوشیزۂ فن جاگی

ویران حویلی کے سوتے ہوئے گنبد میں
اکثر کوئی انجانی آوازِ کہن جاگی

تنہائی کے سینے میں ٹوٹا ہوا خنجر ہے
وہ لمسِ گنہ جس سے تقدیسِ بدن جاگی

ہر ڈوبتے منظر سے ملتی ہیں سسکتی نظریں
بجھتی ہوئی آنکھوں میں کیسی یہ لگن جاگی

مانا کہ مرا چہرہ مسکن ہے اندھیروں کا
ماتھے پہ تو رہ رہ کر ننھی سی کرن جاگی

کب راحتِ شب کھونا، گھاٹے کا رہا سودا
بے خوابیٔ اختر سے تقدیرِ سخن جاگی

مہندر پرتاپ گڈھی

کیا بات ہے، کیوں درد کا جنگل ہے گھنا لکھ
بے مہریٔ احباب، وفاؤں کا صلہ لکھ

کب پہلے ادھر ملتے تھے خوش رنگ مناظر
اس راہ سے گزرا ہے کوئی آبلہ پا؟ لکھ

میں نے تجھے ٹوٹا ہوا، بکھرا ہوا دیکھا
کیا اب بھی ترے جسم میں زندہ ہے انا؟ لکھ

جو کام بنے اس کو سمجھ فضلِ خدا کا
جو بات بگڑ جائے اسے اپنی خطا لکھ

کیا اب بھی ہے اس شوخ کے وعدوں کا بھروسہ
کیا اب بھی ترے دل کا ہے دروازہ کھلا لکھ

مدت ہوئی اس جنتِ گم گشتہ کو دیکھے
کیسی ہے مرے گاؤں کی اب آب و ہوا لکھ

اک عمر سے آپ اپنے کو میں ڈھونڈ رہا ہوں
معلوم ہو تجھ کو جو کبھی میرا پتا لکھ

شاہد میر

اک سبز رنگ باغ دکھایا گیا مجھے
پھر خشک راستوں پہ چلایا گیا مجھے

چاروں طرف کھچی ہیں اندھیروں کی چادریں
شاید ابھی فضول جگایا گیا مجھے

پہلے تو چھین لی مری آنکھوں کی روشنی
پھر آئینے کے سامنے لایا گیا مجھے

طے ہو چکے تھے آخری سانسوں کے مرحلے
جب مژدۂ حیات سنایا گیا مجھے

طوفان اُگلتے ہوئے کف لوٹ رہے ہیں
خاموش ٹھکانوں کی طرف لوٹ رہے ہیں

بے خوف جو اُترے تھے سمندر کی تہوں میں
ہاتھوں میں لیے آج صدف لوٹ رہے ہیں

برفیلے حصاروں سے ملی جن کو رہائی
موسم وہ بجاتے ہوئے دف لوٹ رہے ہیں

ہر شام چلی آتی ہیں دِل میں تری یادیں
یہ پنچھی بسیرے کی طرف لوٹ رہے ہیں

سلطان شاہد

وسعتِ چرخِ نیلی فام ہے کیا
ہر طرف یہ طلسمِ دام ہے کیا
دشت میں کیوں پنہ گزیں ہیں لوگ
شہر میں کوئی قتلِ عام ہے کیا
سر اُٹھاتی ہے سر پھری خواہش
تیری تلوار بے نیام ہے کیا
برچھیاں سونپ دیں فصیلوں کو
باغیوں کا کہیں یہ کام ہے کیا
زرد پتے ہوا کے آگے کیا
پنچھیوں کا لہو بھی خام ہے کیا
جس میں پریاں ہیں اور شہزادے
اُس کہانی کا اختتام ہے کیا
کون سا رنگ دے گی منظر کو
صبح اپنی نہیں تو شام ہے کیا
مجھ سے مت پوچھ حال پت جھڑ کا
دیکھ، پتّوں پہ تیرا نام ہے کیا
عکس عکس، آنکھ آنکھ ہے ویراں
موسموں کا نیا نظام ہے کیا
بخش دے جسم و جاں کو یارب
سانس سانس (آگ) انتقام ہے کیا
لب پہ شاہد دعا ہے بارش کی
سر چھپانے کا انتظام ہے کیا

محمد کمال پروازی

یہ ناتمام در و بام پار کرنے دے
ہوا کے ساتھ مری پتیاں بکھرنے دے

میں اپنے شہر کا اک معتبر علاقہ ہوں
یہ سانحہ بھی اسی سمت سے گزرنے دے

زختے ٹوٹتے اس بے لباس خطے پر
کبھی تو ابر کی پرچھائیاں اترنے دے

نام شہر میں بے صورتی کا عالم ہے
س آئینے میں کوئی عکس تو ابھرنے دے

میں اپنے آپ زمینوں سے پھوٹ نکلوں گا
مری حدوں میں کوئی قافلہ اترنے دے

جاوید شہبازی

ابھی تو راہ میں باقی ہیں امتحان بہت
ابھی تو دور ہے وہ آخری نشان بہت

میں اپنے ہاتھوں میں آندھی چھپائے بیٹھا ہوں
کہ تیرے شہر میں ہیں ریت کے مکان بہت

خود اپنے پیروں پہ وہ پیڑ جھک گیا اک دن
دکھا رہا تھا جو دنیا کو آن بان بہت

اندھیری رات میں سب کو پناہ دی جس نے
چمکتی صبح میں تنہا تھا وہ مکان بہت

ساجد رشید

پُل

شیشم کی چوڑی چمکدار میز جس کے اطراف بیک وقت پچیس آدمی بیٹھ سکتے ہیں، کی دوسری طرف چربی لدے جسموں والے پانچ سفید پوشوں میں سے ایک نے مرغن غذا کے مسلسل استعمال سے بھاری اپنے گلے دبا کر پائپ کے اسپورٹسٹیڈ تمباکو کے نفیس دھوئیں کو بکھیرتے ہوئے موٹی لجلجی آواز میں اپنے سامنے بیٹھے چوڑے شانے اور تنگ پیشانی والے آدمی کو مخاطب کیا، جو بارود، آگ اور خون کے شہر سے مشینوں اور چابی بھرے کھلونوں کے شہر میں درآمد کیا گیا ہے اور جس نے رات میں بھی سیاہ شیشوں والی عینک پہن رکھی ہے۔

"تم نے بیس ہزار DEMAND کیا ہے ہم تمھیں پچیس ہزار دیں گے۔" اتنا کہہ کر اُس نے اپنے دوسرے چار ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اُن چاروں کی آنکھوں نے تائید میں اپنے اپنے ابروؤں کو خم دیا۔

اُن کی جانب سے مزید پانچ ہزار کے اعلان پر سیاہ شیشوں کے پیچھے" اس "کی بائیں آنکھ پھڑ پھڑائی "میں نے شکار کی اہمیت کو نہ سمجھتے ہوئے شاید کم قیمت لگائی تھی۔" اس نے سوچا

لگتا ہے شکار توقع سے زیادہ خطرناک ہے، مگر اب کیا، کیا جا سکتا ہے۔ قیمت تو ایک ہی بار لگتی
ہے۔" پچھتاوے کے بھاری پن کو "وہ" والا سے ہلکا کرنا چاہتا ہے۔

"یہ رہے تمھارے ADVANCE کے پانچ ہزار۔ باقی کام ہو جانے کے بعد۔" اس
موٹے گلے والے نے ایک موٹا سیاہ لفافہ اُس کی اور میز پر پھینکا جو سن مائیکا پر پھسلتا ہوا
اُس کے ہاتھوں میں آ چکا۔ اُس نے لفافہ کھول کر اطمینان سے نوٹوں کو گنا اور جیب میں رکھنے
کے بعد اپنے کام کی شروعات کا پہلا تفتیشی سوال کیا:

"نام؟"

"بابو ساب دھال" بھاری گلے والے نے دانتوں کو رگڑ کر کسی غیر مرئی شے کو چباتے
ہوئے جواب دیا۔

"عمر؟"

"۳۵ اور ۳۷ ہوگی۔" ایسے کہا ہے جیسے اب اس سے آگے گنتی ہی ختم ہو جائے گی۔

"کام کتنے دنوں میں ہو جائے گا؟" بقیہ چاروں میں سے ایک نے اپنے بھاری جسم کو
کرسی کی گرفت میں کسمساتے ہوئے پوچھا:

"ایک ہفتہ لاگے۔"

"ایک ہفتہ۔" تیسرا آنکھوں کو مچ مچا کر جلدی سے دہرایا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" پہلے نے اپنی موٹی کھال والی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی
گھماتے ہوئے کہا۔ "کام ہوشیاری سے کرنا وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"چاہے جیسا موقع پڑے تم اس سے بات بالکل مت کرنا۔" دوسرے نے کہا۔

"ہوشیار رہنا اُس سے۔" تیسرے نے کہا۔

"اتنا کھوترناک!" سیاہ چشمے کے پیچھے اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اس سے بھی کہیں زیادہ۔" بھاری گلے والے نے دانتوں کو بھینچ کر کہا۔

"ہم نے یہ ایڈوانس دے دیا ہے اب یہ تمھارا فرض ہے کہ اپنی ڈیوٹی کو ایمانداری سے
کرو۔"

"جب ائرکنڈیشنڈ ہال سے نکل کر باہر کی آلودہ فضا میں آتا ہے تب اُس شاندار
ہال کی پہلی ODONIC کی خوشبو اُس کے نتھنوں میں بسی رہتی ہے۔ پتلون کی

جیب میں پانچ ہزار کے نوٹ اُس کے دماغ میں رنگین میں چھوٹی چھوٹی اور نئی قوت کا احساس بھر دیتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے۔ بیس ہزار روپوں کے معنی ہیں کم از کم سال بھر کا عیش، انگریزی کا ادھا، پاس حق بہات، رو پہلو مچھلی کا سالن، ولس کنگز کا فرحت بخش دھواں، ریشمی کوٹوں میں ہر ہفتہ جکلتی، سونا کی بھیک کی دہی سانولی، لمبے سیاہ بالوں والی لڑکیاں، صبح دیر تک سونا، خوب نہانا اور ململ کا کُرتا کناری دار دھوتی جھاڑ کر رکشا پر پُورا بنگالی بابو بن کر رنگ باندھنا! وہ سوچتا ہے اور خوشی کا احساس اُس کی رگوں میں دھیمے دھیمے سُلگتا چلا جاتا ہے۔

"وہ بہت خطرناک آدمی ہے!" جلد تعاقب کرتا ہے۔

وہ غیر شعوری طور پر اپنی ہپ پاکٹ میں استرے کے اُبھار کو محسوس کرتا ہے۔ سیاہ چشمے کے پیچھے اُس کی بھوری آنکھوں میں سوچیں اُگ آتی ہیں۔

"کتنا خطرناک ہوگا وہ؟"

"ہتھیار سے لیس رہتا ہوگا؟"

"جیب میں چاقو اور دستی بم رکھتا ہوگا؟"

"کیا مجھ سے بھی طاقت ور ہوگا؟"

لمبے اونچے، دُبلے موٹے، چوڑے بھدے، خطرناک آدمی کے نہ جانے کتنے ہیولے اُس کی آنکھوں میں بنتے چلے گئے۔

اُس کا اشتیاق صحرا کی پیاس ہوتا چلا گیا۔

وہ دو دنوں سے اُس کا تعاقب کر رہا ہے جس کا نام بابو ساب ڈھال بتایا گیا ہے۔ دُبلا پتلا جسم، جھکے ہوئے کندھے، درمیانہ قد، دھوتی میں ملی پرانی ٹیڑھ، سانپ جیسی کالی چکدار جلد، کشادہ پیشانی، دراوڑوں کی نسل سے تعلق ہونے کی شہادت دیتے ہوئے ہونٹ، چوڑی ناک لوٹے کے گھونسلے ایسے اُلجھے کالے سخت بال اور سائڈ لاکس پر گرتی سفیدی کے چھینٹے۔ یہ تھا سوتی پوش بابو ساب ڈھال!

وہ دو دنوں سے ڈھال کے قدموں کی چاپ بنا ہوا ہے۔ وہ ڈھال کی خطرناک شخصیت کو اپنی تجربہ کار آنکھوں کی چھلنی میں چھانتا رہا ہے۔ ڈھال کے جھکے ہوئے کمزور کندھے پر لٹکا کھادی کا جھولا دو دنوں سے اس کے لیے معمہ بنا ہوا ہے۔

اس میں ضرور ڈینامائٹ ہوگا۔

دستی بم ہوگا۔
چاقو ہوگا۔
یہ خدشے کل سے اس کی آنکھوں میں چبھ رہے ہیں۔ مناسب موقع پاکر وہ پوٹلی جیری سے جھولے میں اپنے خدشے کی تصدیق کے لیے جھانکتا ہے۔
ایک ضخیم کتاب، کچھ کتابچے، پمفلٹ اور مراٹھی کا کوئی اخبار۔
بس یہی سب اور ہتھیار۔۔۔؟
وہ سارے لمبے اونچے، دُبلے موٹے، چوڑے بھدّے خطرناک آدمی "ایک ساتھ آپس میں ٹکرا کر شیشہ شیشہ، کرچی کرچی، پتھر پتھر، ریزہ ریزہ بکھر جاتے ہیں۔
اُس کا اشتیاق، صحرا کی پیاس گہرے پانیوں میں ڈوب جاتا ہے۔
مل سے ڈھال چھ بجے نکلا تھا۔ پریل پُل کی دُوسری جانب واقع ایک آرگنائزیشن کے دفتر میں گھنٹہ بھر پندرہ بیس مدقوق جوانوں میں بیٹھا تھا اور آٹھ بجے وہاں سے کچھ فاصلے پر واقع ایک فری کلاس میں ٹیوشن دینے چلا گیا تھا اور دس بجے فری کلاس سے نکل کر وہ سرکار سے منظور شدہ ایک دیسی شراب خانے میں جا گھسا تھا اور وہ ایک لیمپ پوسٹ سے ٹکا انتظار کی کوفت کو سگریٹ کے دھوئیں میں اُڑا رہا تھا۔
ڈھال اُونچی عمارتوں، لپستہ قد لیمپ پوسٹوں، خستہ چالیوں، بوسیدہ جھونپڑوں شاندار دُوکانوں، مہنگی ہوٹلوں اور چھوٹی بڑی سڑکوں سے نیچے تلے قدموں سے گزرتا پریل اسٹیشن پہونچا اور وہ ڈھال کا سایہ بنا رہا۔ پریل سے وکرولی اور وکرولی سے ڈھال کے گھر تک کا راستہ تیسرے کی چالیوں کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے۔
ڈھال آگے آگے سایہ ساتھ ساتھ! وکرولی بیٹھی چال کا یہ علاقہ ——— اُبلتی ہوئی ——— اور روز کنواں کھود کر پانی پینے والوں کی کھڑکیوں کی سلاخوں سے لپٹ کر نکلتا گیلی لکڑیوں کا گاڑھا دُھواں!
ایک پلستر اُدھڑتے کمرے کے دروازے پر ڈھال نے دستک دی۔
تو کیا یہ اس کبوتر خانے میں رہتا ہے؟ وہ ٹھٹھک کر سوچتا ہے اور میونسپلٹی کے ایمرجنسی واٹر پمپ سے جو ترٹ ٹیک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پتلی گلی کی اوبڑ کھابڑ کچی زمین پر گدلا پانی جاتا ہے۔ گندے پانی اور پیشاب کی تیز اِبو سارے میں بسی ہوئی ہے۔ اگر کنڈلیٹ نند

بال کی ODONIL کی بھینی مہک اُس کے نتھنوں میں کہیں کھو جاتی ہے۔ اُس تیزابی بُو سے دو چار ہوکر وہ بڑی مانوس سی لگتی ہے۔

دستک پر فوراً ایک دبلی پتلی عورت نے کھولا جس کے کندھے سے لگی ایک بچی سو رہی ہے۔ ڈھال جھک کر بچی کی پیشانی چوم لیتا ہے۔ عورت کے نڈھال تھکے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھِل اُٹھتی ہے۔ کمرے میں پہنچ کر ڈھال کھڑکی کھول دیتا ہے۔ "وہ" کھڑکی کے اسکرین سے وہی بیک اینڈ وائٹ منظر دیکھتا ہے جس کا وہ خود بھی ایک کردار ہے۔

ایک چھ سات سال کا لڑکا جو میز پر بیٹھا شاید ہوم ورک کر رہا تھا۔ "بابا آ گئے۔ بابا آ گئے" کہہ کر ڈھال سے لپٹ جاتا ہے۔ ڈھال کی انگلیوں کی پدرانہ شفقت کی حدت لڑکے کے بالوں میں اُترنے لگتی ہے ——— وائپر سے ٹکا وہ دھندلکے میں اُترنے لگتا ہے۔ اونچی عمارتوں اور تنگ سڑکوں والے بے رحم چوراہے پر وہ بتدریج گھٹتا جا رہا ہے گھٹتا جا رہا ہے۔ اتنا کہ اب "وہ" وہ نہیں ایک بچہ ہے خستہ حال بچہ! چوراہے کے سارے سگنل اپنی آنکھوں کا رنگ بدلتے ہیں اور سرخ سرخ آنکھوں سے اُسے گھورنے لگتے ہیں۔ وہ اونچی عمارتوں کے جنگل تنگ سڑکوں کے جال اور غصیلی آنکھوں والے چوراہے سے گھبرا کر بے تحاشہ چیخنے لگتا ہے۔ مگر کوئی ہاتھ اُس کے سر پہ چھتری نہیں بنتا!

"ابھیاس جھالا؟" (ہوم ورک ہوگیا) ڈھال کا اپنے لڑکے سے مراٹھی میں پوچھا گیا سوال اُسے چونکا دیتا ہے۔ "آتاچ سنپلا" (ابھی ختم ہوا ہے) لڑکا بڑے اُتساہ سے جواب دیتا ہے۔

"جر پریکشے مدھے پہلا نمبر آلاس تر تلا ایک سائیکل بخشش دئیل" (اگر تو امتحان میں اوّل نمبر آیا تو میں تجھے ایک سائیکل انعام دوں گا۔) ڈھال لڑکے کی پیٹھ تھپتھپا کر کہتا ہے اور لڑکا جو پچھلے امتحان کے موقع پر بھی یہ وعدہ سُن چکا ہے پھر ایک بھرپور عزم سے کھِل اُٹھتا ہے۔

"سیکرٹ کمپرومائز کے لیے ہم نے اُسے دس ہزار کا آفر دیا تھا ———
BUT THAT BASTURD REFUSED IT اور
پارٹی، کمیونسٹ، بیک ورڈ کلاس، کلاس وار، آئیڈیالوجی، ریولیوشن اور نجانے
کیا کیا بکواس کرنے لگا تھا وہ۔" اُن پانچ سفید پوشوں میں سے ایک کی

آوارگی ہی۔

فرش پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ڈھال کو دیکھتا ہے جس نے اب صرف ایک بنیان اور پاجامہ پہن رکھا ہے۔ اُس کا ننگا جسم شاہ بلوط کے پھل جیسا دکھائی پڑتا ہے۔ مٹھی بھر ہڈیوں کے اس پنجر میں ایسی کون سی قوت ہے جس نے اسے اتنی سرکشی بخشی ہے؟ کیا اس نے خود اپنا یہ ڈربہ نہیں دیکھا جس میں سو واٹ کا پیلا بلب جل رہا ہے۔ کتابیں ٹھیک شیلف پر نہیں کونے پڑے سٹول پر چھائی گئی ہیں۔ چند المونیم کے برتن جو لکڑی کی پرانی الماری پر جھول رہے ہیں۔ پرانے کیل سے لٹکی گٹھڑی میں بندھے ہیں اور دیوار پر جیسے کالی سی جھت جا رہی ہے۔

" ہماری آفر کو ٹھکراتے ہوئے اُس حرامزادے نے کہا تھا۔ مسٹر ہم بھوک کو بھی ریاضت سمجھتے ہیں۔"

" ریاضت!" وہ منہ بسور کر بڑبڑایا۔ اس بوکا جودی کا بچہ جب دن بھرے بازار میں اس سے ٹافی کے لیے سبٹ کو رہے تب بُڑ میں گھس جائے گی آئیڈیالوجی۔"

" ہم بھوکے اہنساوادی" موٹے گلے والے نے کہا تھا۔" ہم نہیں چاہتے کہ ہنسا پھیلے مگر یہ بھنگی کلاس والا اور یونیٹی کا ڈھول بجا کر گولیاں چلوائے گا۔ ویسے چاہے روٹی دال میں خوش ہیں مگر یہ ریولوشن کا چانس دے کر اُن کا بھی دماغ خراب کر رہا ہے۔ ان چاروں نے دو کتابیں کیا پڑھ لی ہیں اپنے آپ کو ایکسٹرا آرڈنری انٹلکچول سمجھنے لگے ہیں۔ ابھی دو چار لوگوں نے پوری چار برادری کا دماغ خراب کر دیا ہے گوبر ٹھونگنے والوں کو ہیرا چکھنے پر اکسا رہے ہیں۔ ارے وہ ایک مسلسل لنگوٹی والا بڈھا تو خوب سر چڑھا کر مر گیا اب سارا ملک ان سرکاری برہمنوں کو کندھے پر لاد کر گھومے!"

اُس نے سر کو جھٹک کر ڈھال کے مٹھی بھر وجود کو اپنی آنکھوں کے ٹیلی اسکوپ کے ہُڈ میں فٹ کیا۔ کراس کا پوائنٹ سینے اور پیٹ ہی پر گھومتا رہا۔ "اس" نے جیب میں رکھے استرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا" بس ایک ہی وار کافی ہوگا اور پھر تو اس کا رام نام ستیہ ہو جائے گا"———" آہاہاہا ہوہوہوہو!!" ڈھال کا قہقہہ جھنجھوڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے لڑکے سے میٹھا باتیں کر رہا ہے۔ بات بات پر ٹھٹھا کر ہنسنے

لگتا ہے اور اس کا مٹھی بھر ٹڈیوں والا سوکھا جسم لرزنے لگتا ہے۔

"وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

یہ ایک ہاتھ کا آدمی اتنا خطرناک کیسے ہو سکتا ہے کہ اُسے پانچ ہزار روپے نذر دیے جا رہے ہیں؟ کون سا خطرہ لیے گھومتا ہے اپنے ساتھ؟ "وہ" اپنی سوچ سے اُس کا ایک ایک عضو ٹٹول ڈالتا ہے۔ محطار وہ ملاقوں کے اشتہار جیسا ڈھال کا وجود اُسے بڑا ناقابلِ فہم نظر آتا ہے۔ "وہ" ڈھال کی دن بھر کی مصروفیات کو نقطہ نقطہ جوڑ کر اس کے مریل وجود کی اُس دہشت کو محسوس کرنا چاہتا ہے جس کا شکار وہ پانچ سفید پوش ہیں، مگر کوئی واضح لکیر نہیں بن پاتی تب وہ اپنے منتشر دماغ اور ٹوٹتے جسم کے بوجھ سے بھاری قدموں سے تنگ گلی میں ناکامی کی تھکن سے ڈگمگاتے ہوئے، اندھیرے میں کھو جاتا ہے۔

۴

ہوٹل کے کمرے کا سناٹا اُس کی رگوں میں بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ آدھی بوتل کا نشہ دماغ میں ہلچل مچاتے خیالات سے ٹکرا کر، پاش پاش ہو چکا ہے سگریٹ کے ٹکڑوں سے ایش ٹرے بھر چکا ہے اور جیب میں رکھے پانچ ہزار کے نوٹ آنے والے لمحوں کا حساب پیش کر رہے ہیں۔ ہپ پاکٹ میں استرے کا وزن ڈھال کے وزن سے بھی زیادہ محسوس ہونے لگتا ہے۔

ایک نہتے کو مارنے کے لیے اتنے حفاظتی منصوبوں کی کیا ضرورت ہے؟ کبھی بھی، کسی بھی گلی، کسی بھی اندھیرے موڑ پر استرے کی ایک ذرا سی جنبش اور۔۔

لیکن کیوں؟

پچیس ہزار، ہزار، ہزار، ہزار!

ایک کمزور نہتے آدمی سے اتنے خوف زدہ کیوں ہیں وہ لوگ؟

جسمانی اور مالی طاقت میں تو وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں!

ایسا کون سا خطرہ ہے یہ اُن کے لیے؟

اس سے پہلے میرے جتنے شکار تھے وہ مجھ سے بھی بڑے قاتل تھے۔ مجھ سے کہیں زیادہ بدمعاش تھے، مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور تھے مگر یہ ——— یہ کیا ہے؟

اسمگلر؟
بلیک مارکیٹیر؟
زانی؟
چور؟
بدمعاش؟
...... !
ملک دشمن؟
قوم دشمن؟
سماج دشمن؟
...... !!

کہیں کوئی جواب نہیں۔ بس مجرم خاموشی ہے چاروں اور۔
کہیں میں اپنے شکار سے ہٹ کر کسی غلط آدمی کا تعاقب تو نہیں کر رہا ہوں؟
نہیں شکار تو یہی ہے۔
تو کیا انھوں نے غلط شکار کا انتخاب کیا ہے؟
خاموشی، جواب ہے۔ خاموشی جو اثبات کی علامت ہے۔

دوسری صبح وہ ڈھال کے ساتھ لوکل ٹرین میں چڑھا تھا۔ ڈھال کو بیٹھنے کو جگہ مل گئی اور وہ کھڑا رہا۔ ڈھال نے اپنی بنچ پر پھیل کر بیٹھے لوگوں کو سمٹ کر بیٹھنے کے لیے کہا اور اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُس نے چاہا کہ انکار کر دے مگر اس نے اپنی عینک کے سیاہ شیشوں کے پیچھے سے صاف دیکھ لیا کہ ڈھال کے موٹے شیشے کی عینک کے پیچھے سے جھانکتی آنکھوں میں صدیوں سے جھیلا گیا ظلم اور محکومی نہیں ہے، حکم ہے ——— حکم! وہ دو آنکھوں سے اپنے سیاہ چشمے کا توازن چہرے پر ٹھیک کرتے ہوئے ڈھال کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"تھینک یو" وہ گھسی پٹی پیٹیوں سے لی زبانی تہذیب کا کیسیٹ بجاتا ہے۔
"اتنی چھوٹی بات کے لیے شکریہ ادا کرنا ضروری تو نہیں ہے۔" ڈھال نے موم بن کر

اُس کی آنکھوں میں اُترتے ہوئے کہا۔

"چاہے جیسا موقع پڑے تم اُس سے بات بالکل مت کرنا۔"

"آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟" نہ چاہتے ہوئے بھی ڈھال کی بات اُس سے کہہ لیتی ہے۔

"اس لیے کہ شکریہ کا مطلب ہے کہ کسی کے CO-OPERATION کو احسان کہا جا رہا ہے۔ جب کہ کوئی کسی پہ احسان نہیں کرتا۔ کیونکہ MORALY ہم پر ایک دوسرے کے لیے کچھ DUTIES ہیں۔ میرا کچھ فرض آپ پر ہوگا اور آپ کا مجھ . . ."

"ہم نے ایڈوانس دے دیا ہے اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اپنی ڈیوٹی ایمانداری سے ادا کرو۔"

آپ کا آکوپیشن؟ نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھتا ہے۔

"وہ بہت خطرناک آدمی ہے!"

"چاہے جیسے موقع پڑے تم اُس سے بات بالکل مت کرنا۔"

"ایک کپڑے کی مل میں ڈیپارٹ منٹل ہیڈ ہوں۔"

"اور ہابیز؟ وہ ٹٹولنا چاہتا ہے۔"

"راج نیتی میں INTEREST ہے۔ اپنی کلاس کے لوگوں کو آرگنائز کرنا۔ اُن میں یہ پیدا کرنا کہ وہ پیٹ کے ساتھ دو ہاتھ بھی رکھتے ہیں۔ اُن کی کھوپڑی میں اُتنی ہی بدھی ہے جتنی دوسروں کی ہے۔ میں انھیں ان کے ہونے کا انوبھو کرانا چاہتا ہوں۔ جس روز انھیں اس کا انوبھو ہو جائے گا اُس روز . . ." ان کے قدموں کے پیچھے پیچھے تیزی سے ڈھول اُٹھاتے ٹپری بدلتے ہیں چنگاریاں پھوٹ کر بکھرتی ہیں اور گڑگڑاہٹ کا شور ڈھال کے بقیہ جملے کو اُڑا لے جاتا ہے۔

"ایک پرسنل کوئسچن آپ سے؟" وہ سیاہ چشمے سے ڈھال کی آنکھوں میں جھانکتا ہے۔

"پوچھو، پوچھو، آج کے آدمی کا کوئی بھی معاملہ پرسنل نہیں ہے۔ پاپولیشن اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب سرکار ہمارے فیملی میٹر میں دلچسپی لینے لگی ہے۔"

"آپ کو تو نخواہ کے علاوہ دوسرے کاموں سے کتنا ملتا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں۔" یہ اُس کے لیے حیرت ہی کی بات ہے۔

تنگ گلی میں ڈربہ نما گھر، اُس کا گھر میرا گھر! میرا گھر اُس کا گھر کتنا انتر؟

دُبلی پتلی عورت

دو بچے

ننگی دیواریں

اُدھڑتا پلستر

اور نہ جانے کیا کچھ اُس کی آنکھوں میں گڈ مڈ ہوتا چلا گیا۔

"پھر کیسے کو آپ اتنا لوال پالے ہو" وہ تعجب سے کہتا ہے۔

"سوال! ہا ہا ہا ہا" ڈھال ہنستا ہے۔ "میری وائف بھی یہی کہتی ہے۔ مگر دوست روپیہ پیسہ ہماری کسی بھی محنت کا پیراشرمک (معاوضہ) نہیں ہو سکتا۔ پھر کچھ کام تو ہیں کرنے ہی ہیں کچھ آپ کو بھی کرنے ہوں گے۔"

"کام ہوشیاری سے کرنا۔"

ڈھال کہتا رہا اور وہ بس آنکھوں سے سنتا رہا۔

"یونٹی، کمیونٹی، بیک ورڈ کلاس، کلاس وار، ریولوشن آئیڈیالوجی۔"

اور نہ جانے کیا بکواس کرنے لگا تھا وہ۔"

ڈھال کہہ رہا تھا اور "وہ" سیاہ چشمے کے پیچھے سے پنکھے کی جالی پر بیٹھی چہچہاتی رنگین پروں والی اُس ننھی چڑیا کو دیکھ رہا تھا جو کسی اسٹیشن پر ڈبے میں چلی آئی تھی۔ بے اختیار اُس کا جی چاہا کہ وہ اپنا سیاہ چشمہ اُتار کر ننگی پتھریلی آنکھوں میں ننھی چڑیا کے پروں کے رنگوں کو جذب کر لے۔

"آپ بنگالی ہیں شاید؟" ڈھال نے اپنی ہی باتوں سے چونک کر اُس سے پوچھا اور اُسے جیسے کرنٹ چھو گیا۔

"ہاں۔ امی بنگالی۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"بمبئی گھومنے آئے ہیں آپ؟"

اُسے لگا جیسے ڈھالا [illegible] ایک آنکھ [illegible] کیا جواب دے؟ گھومنے آیا ہے یا کرنے

کرہ سالا تیرا کو گھوںا سفا آیا ہے!"

"ہوں" صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ جاتا ہے۔

"کلکتہ مجھے بہت پسند ہے" ڈھال اُس کی آنکھوں میں اُترتا ہے۔

اُسے لگتا ہے جیسے ڈھال نے اُس کے ارادے کو چھو لیا ہے مگر اب آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔

"آپ گئے ہیں کولکتہ؟" آواز لرز جاتی ہے۔

"نہیں، مگر آپ جیسے SINCERE لوگوں سے مل کر تو مجھے کلکتہ اچھا لگتا، دیکھیے نا لوگ کہتے ہیں بمبئی بہت فاسٹ ہے کیا بمبئی خود دوڑ رہی ہے؟ —— نہ یہاں کے لوگ فاسٹ ہیں لائف فاسٹ ہے اسی طرح کلکتہ بہت اچھا ہے" وہ کہہ کر ہنسنے لگتا ہے۔

"وہ بہت خطرناک آدمی ہے . . ."

ٹرین دوڑ رہی ہے۔

ڈھال کی باتیں جاری ہیں۔

پہیوں کے نیچے چھوٹے چھوٹے پُل گزرتے جا رہے ہیں۔

پنکھے کی جالی پر پروں والی ننھی چڑیا چہچہا رہی ہے۔

"مجھے بنگلہ کویتا بہت پسند ہے" ڈھال کی باتوں کو وہ ٹکڑوں میں سُنتا ہے۔

"شانتی نکیتن کے بوڑھے درختوں کی چھایا میں ٹھنڈی ہریالی پر لیٹ کر آپ کو بھول جانے کی اچھا ہے میری۔"

"چوک کے رس گلے مل جائیں تو کیا بات ہے۔"

"ہاوڑہ کا فوٹو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ کسی روز اُس کے پُل پر سے نیچے ٹھنڈے پانی میں ٹائیو مارنا چاہیے۔"

وہ ڈھال کی باتوں میں بارود کی بُو، خون کا ذائقہ اور آگ کی تپش کو محسوس کرنے کی کوشش میں کھڑکی سے باہر ڈھلے نیلے آسمان کو تکنے لگتا ہے جہاں اُوپر سفید بادلوں کے قطعے رینگ رہے ہیں

منتشر قطعے سے رشتہ کرکے

"وہ۔۔۔ بہت۔۔۔ آدمی ہے!" بازگشت ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے۔

ٹرین کے پہیے اُن پٹریوں پر دوڑ رہے ہیں جن کے نیچے نہ جانے کتنے چھوٹے چھوٹے پُل ہیں۔ جب بھی کوئی پُل پٹریوں کا رابطہ دُوسری جانب کی زمین سے جوڑتا ہے تو ٹرین کی مخصوص لچک اُسے بڑی مانوس لگتی ہے۔ اوور ہیڈ گراف جب بھی برقی تار سے رگڑ کھا کر چنگاریاں اُڑاتا ہے تو وہ چنگاریاں اسے اپنے مسامات میں کھبتی محسوس ہوتی ہیں۔

"وہ" پریشان ہو کر کھڑکی سے باہر پچھلے اوبڑ کھابڑ میدان کو دیکھنے لگتا ہے۔ نیلے آسمان پہ وہ نقطہ نقطہ کبوتر اب کافی واضح ہو چلے ہیں۔

"یہ رہے تمھارے ایڈوانس کے پانچ ہزار۔"

پتلون کے جیب کی حدت اُسے یاد دلاتی ہے۔

"باقی بیس ہزار کام ہو جانے کے بعد۔"

ہپ پاکٹ میں اُسترے کا اُبھار اُسے اکساتا ہے۔

"روپیہ پیسہ کسی بھی محنت کا پراشرمک نہیں ہو سکتا۔"

دُھمال کی آواز اُس کے وجود کے نہ جانے کتنے خانوں تہہ خانوں میں گونج جاتی ہے۔

"ہم نے دس ہزار کا آفر دیا تھا BUT THAT BASTARD REFUSED IT"

کوئی مکڑی اُس کے دل کے اطراف جالا بنتی چلی جاتی ہے۔ یہ احساس اُسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا آج ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ایک میٹھا میٹھا درد نہیں ہلکی ہلکی سرسراہٹ ہو رہی ہے ناف میں۔ یہ کیسا درد ہے؟ یہ درد تو پہلے کبھی نہیں اُٹھا۔ لیکن یہ درد بھی کہاں ہے۔ درد تو وہ ہوتا جس سے تکلیف کا احساس ہو پھر کیا نام دیا جا سکتا ہے اس احساس کو؟ بس بالکل ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہزاروں سال بوڑھے برگد کی جڑیں ناف میں اندر ہی اندر پھیلتی جا رہی ہوں۔ وہ اپنے ارادے کو کسی فیصلے میں بدلنے اور اُس احساس سے توجہ ہٹانے کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا ہے۔ برقی تار پر اُجلے پروں والے کبوتر ایک قطار میں بیٹھے ہیں اور اندر پنکھے کیبل پر رنگین پروں والی ننھی چڑیا اب بھی چہچہا رہی ہے۔ اُس کا سیاہ چشمہ دُھندلانے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بہت کمزور تھکا ہارا اور شکست خوردہ محسوس کرتا ہے اُسے لگتا ہے جیسے وہ ہزاروں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چڑھ آیا ہو۔ ابھی تو دن کے صرف ساڑھے [illegible]

سڑک گرد آلود ہے اور آسمان مٹیالا ہو رہا ہے۔ عمارتوں کے سائے کسی پینٹنگ کے اڑتے رنگوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

وہ تم اُس سے کسی بھی موقع پر بات نہیں کرو گے۔

مگر ڈھال کی باتیں جاری رہیں۔ وہ صرف آنکھوں سے سن رہا ہے اس کا چہرہ سپاٹ ہے مگر اندر زلزلے کے آثار جاگ رہے ہیں۔ تاریک شیشوں کے پیچھے آنکھیں گرداب جھیل رہی ہیں۔ اس کے دل اور دماغ میں نہ جانے کتنے فیوجی یاما پھوٹتے ہیں۔ اُس کا ہمزاد نہ جانے کتنی بار ایفل ٹاور سے گرتا ہے۔ اس کے وجود پہ نہ جانے کتنی ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگیں ڈھتی ہیں۔ اس کے اندر نہ جانے کتنے طوفانِ نوح برپا ہوتے ہیں۔ وہ کچکچا کر اپنے دونوں جبڑوں کو بھینچ لیتا ہے۔

"بنگالی لٹریچر کتنا RICH ہے۔" ڈھال ہاتھ لیے پھیلاتا ہے۔ جیسے ہم بتا رہا ہو۔ "آپنی بونگلا جانن؟" وہ پوچھ بیٹھتا ہے۔

"ہاں۔"

"سوچ؟" نہ جانے کیوں خوشی کا ایک بے نام احساس اس کے مسامات تک کو بھگو جاتا ہے۔

"امار سونار بانگلا دیش۔" ڈھال ہاتھ لہرا کر ایک مشہور سلوگن کہتا ہے۔

سیاہ چشمے کے پیچھے اس کی آنکھیں پھڑپھڑا کر رہ جاتی ہیں۔

"ارے بندھو یہ میں نے بنگلا میں کہا تھا۔" ڈھال کے شیام رنگ چہرے پر بچوں جیسی شرارت کھیل جاتی ہے۔

ڈھال کے اس معصوم مذاق پہ وہ بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ مکڑی کا جالا ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ وہ ہنستا ہے۔ اندر سے باطن سے اور ناف میں بوڑھے برگد کی جڑیں ہلتی جاتی ہیں۔ برقی تار پر ایک مردہ چمگادڑ لٹکی ہوئی ہے۔ اُجلے پروں والے کبوتروں کا غول کہیں سے اڑ کر پھر تاروں پر ایک قطار میں آبیٹھا ہے۔ پنکھے کی جالی پر رنگین پھولی الی وہ ننھی چڑیا چہچہا رہی ہے اور وہ بدستور ہنس رہا ہے۔ ہنس رہا ہے اور ناف میں بوڑھا برگد اپنی جڑیں کھو رہا ہے۔ وہ ہنس رہا ہے جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہو۔ ہنستے ہنستے اس

ہے اور چھن چھناہٹ کی آواز کے ساتھ ستارے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ وہ ہنستے ہوئے جھک کر ٹوٹے سیاہ شیشوں کو اُٹھا کر کھڑکی سے باہر اُچھال دیتا ہے۔ ٹرین کی وسل گونجتی ہے اور پہیے نیوٹران سے حاصل ہونے والی قوت سے پُل پر سے گزرتے چلے جاتے ہیں!

دُکھ کی پہلی کرن

جن کے ہاں تخلیقی اُپج برائے نام ہوتی ہے ان کے لیے بنے بنائے راستوں پر چلنا بہتر ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ادب کے میدان میں ایسے لوگ فی الفور دوسروں کی توجہ حاصل کر لیتے ہیں اور وقتی طور پر تھوڑی بہت شہرت بھی بٹور لیتے ہیں لیکن جو شخص زرخیز ذہن کا مالک ہو وہ بنے بنائے راستوں پر چلتے ہوئے دیر یا سویر اپنے سفر کے لیے کوئی ایسی پگڈنڈی ضرور بنا لیتا ہے جو اس کی علیحدہ روی کو ظاہر کرتی ہے اور بالآخر اس کے منفرد مزاج کا شناخت نامہ بن جاتی ہے۔

رخسانہ جبیں کشمیر کی ایک نئی شاعرہ ہے۔ اس سے پہلے اس کی کوئی شعری تخلیق میری نظر سے نہیں گزری۔ بہت سوں کی طرح اس نے بھی اپنا شعری سفر غزل سے شروع کیا ہے جس میں اچھے بُرے اظہار کا راستہ سب کے لیے ہمہ وقت کھُلا ہے۔

ان غزلوں کے مطالعے کے بعد فوری طور پر یہ تاثر ہوتا ہے کہ جبیں کو اپنے سچے اور نئے تخلیقی اظہار کی نسبت غزلیہ روایت کی پاسداری زیادہ عزیز ہے جبھی اس کے بیشتر اشعار متعین مفہوم کے اردگرد منڈلاتے نظر آتے ہیں لیکن ان غزلوں کو اگر تھوڑی سی توجہ سے پڑھا جائے تو بعض اشعار اور مصرعوں میں دُکھ کی جو زیریں لہر ہے وہ دل میں سوئی کی چبھن کی طرح محسوس ہوگی۔ مجھے خوشی ہے کہ جبیں کا دل اس دُکھ سے مالا مال ہے جو تخلیقی اظہار کا سرچشمہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جبیں کے اندر بنے بنائے راستے سے ہٹ کر چلنے کی خواہش کب جاگتی ہے لیکن ان غزلوں کے سنجیدہ مطالعے کے بعد میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس طاقِ دل پہ دُکھ کی جو تیز کرن چمک رہی ہے وہ اسے اس پگڈنڈی کا راستہ ضرور سجھا دے گی جہاں نئے اداس منظر اس کا خیر مقدم کریں گے۔

رُخسانہ جبیں

قطرہ قطرہ خوں سے یہ پتھر پہ ٹپکانے لگا
کیا خبر، اس کو یہاں پر کیا نظر آنے لگا

پچھلے جنموں میں کیا ہے جس سے میں نے اجتناب
اس جنم میں بھی وہ میرے سر پہ منڈلانے لگا

ظلمتوں میں نور کا چشمہ بھی ہوتا ہے ضرور
اجنبی اک شخص آ کے مجھ کو سمجھانے لگا

میرے لمسِ آتشیں سے سب سمندر جل گئے
جب بھی اندر کا جہنم آگ برسانے لگا

وحشتوں نے دل کا پیچھا آج تک چھوڑا نہیں
سرخ پھولوں کی رفاقت میں بھی گھبرانے لگا

رخسانہ جبیں

جاں بلب لمحات میں اس کی مسیحائی نہ پوچھ
ہم نے اک اک سانس میں پھر زندگی پائی نہ پوچھ

ظلمتوں کے دشت میں اب کس لیے بھٹکا کروں
مجھ کو میرے خضر نے وہ راہ دکھلائی نہ پوچھ

گھیر لیتی ہیں مجھے تازہ گلوں کی پتیاں
کھل اٹھے پتھر بدن میں برق لہرائی نہ پوچھ

پھوٹتے ہیں آگ کے چشمے گلوں کے لمس سے
ایسے عالم میں بدن کی ناشکیبائی نہ پوچھ

کیا کہیں ہر سمت کالے ناگ کی پھنکار تھی
ہو گئے ہم کیوں اسیرِ رنگِ رعنائی نہ پوچھ

کانپ اٹھا تھا مری آواز سے دشتِ سکوت
کون آ کے کر گیا محرومِ گویائی نہ پوچھ

چاندنی چھائی تو پگھلی کالی پتھریلی زمیں
آگ کا سیلاب اُمڈا، کیسے مانوس تھی زمیں

ہر قدم پر ماہ و انجم ہو رہے ہیں فرشِ راہ
خواب کا منظر ہے یا ہے آسماں جیسی زمیں

اک شرر بھی اُن کے ہاتھوں میں نظر آتا نہیں
آتشیں کیونکر ہوئی جاتی ہے برفیلی زمیں

سوچ لو، اک اور قتلِ عام ہونا ہے ابھی
ہے ہوا خنجر بکف اور خون کی پیاسی زمیں

چھو لیا مَیں نے تو پھولوں کی طرح کھلتی گئی
تیشہ زن پہلے بھی آئے سنگ و آہن تھی زمیں

رُخسانہ جبیں

فلکوں میں آئے گا پھر سے قریں ہو جائے گا
بر محفل گھیرے گا ہم نشیں ہو جائے گا

دسترس سے جب ہٹا لے گا وہ ہر فیلی تہیں
س کا میرا جسم سارا آتشیں ہو جائے گا

نے اپنے قول سے وہ سب کے سب پھر جائیں گے
ہے ہونے کا انھیں جس دم یقیں ہو جائے گا

نہ پھر وہ مسکرایا دیکھ کر خورشید کو
یہ نینا سایہ در سایہ حزیں ہو جائے گا

پھر وہ دونوں ساتھ نکلے توڑ کر دیوارِ سنگ
اور ہر اک منظر دل نشیں ہو جائے گا

نہ انگاروں پہ ہو گا سرخ پھولوں کا گماں
بستے تھے، ایسا دھوکا بھی کہیں ہو جائے گا

بھی بادلوں کے سفینے غرق ہوتے دیکھ لو
کیا جانے دل میں تہہ نشیں ہو جائے گا

کیسے ہیں وہ ناطق پرندے اسیر
سناتے ہیں جو نغمۂ دل پذیر

کہیں وہ سمندر میں ڈوبا نہ ہو
کہ پانی پہ کھینچی ہوئی ہے لکیر

سفر ہے یہ کیسا، بضد ہے کوئی
کہ پرچھائیں کو مان لو راہگیر

درختوں نے موسم کا پیغام دے
اُڑائے ہواؤں میں اپنے سفیر

مرے خوں کے پیاسے یہ کالے حروف
اور ان سے تعلق بھی ہے ناگزیر

م۔ ن۔ خان

خوابوں کے پرندے

"ہائے!" زخمی پرندے نے اپنے پنکھ پھڑپھڑائے . . .
اور مرمریں ہونٹوں کے قوس بکھر گئے۔ جیسے ایک نغمہ چھڑا۔ آواز نے درد کے پیکر تراشے
سلاسل کے تار جھنجھنا اُٹھے۔ آواز کے گھنگھرو ایک بار بج کر خاموش ہو گئے لیکن صدا ے درد خانۂ
کے سینے میں اُتر آئی گئی۔ وادیِ جذب و احساس میں اب تک صدائے بازگشت گونج رہی تھی۔

اور میں تنہا . . . ! سب کے پاس سب سے دور . . . ! اپنے سے بیگانہ اپنی ذات
سے نالاں! اگر کرب پیکر بنتا، مجسم ہوتا، احاطۂ تصور میں سمٹ سکتا۔ حرف و صوت میں سما سکتا تو
بلاشک اس کا روپ اس کی آنکھوں جیسا ہوتا ——— آنکھیں! شفاف آنکھیں جو جہان
کی ساری شعاعیں منسوب ہو چکی تھیں اور یاس بے کراں یاس کی ساری کیفیتیں معکوس تھیں!
ان آنکھوں سے جنم جنم کا درد جھانک رہا تھا۔ درد و الم کی ایک مسلسل تار تاثر
تھی اُن آنکھوں میں!
آنکھیں [illegible] کیونکہ مرمریں ہونٹوں کے قوس بکھر [illegible]

تھے۔ اور جب میں نے ان آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تو . . .

میں ڈوبتا گیا، ڈوبتا گیا . . . وقت رُک گیا تھا . . . زمین و آسمان کے درمیان خلا و معلق تھا یا وہ آنکھیں تھیں جو سوال بھی تھیں، جواب بھی دعوت بھی تھیں، انکار بھی! ان میں التجا بھی تھی اور تحکم بھی . . . !

میں اس وقت اس سمندر سے باہر نکلا جب وہ آنکھیں دُور ہو چکی تھیں۔ زینوں سے دُور ہوتے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ مضمحل قدم، ناامیدی کا مرقع، نامُرادی کی داستان!

میں نے چاہا آواز دے کر روک لوں لیکن آواز کا پنچھی جسم کے پنجرے سے آزاد نہ ہو سکا۔ گھُٹ گھُٹ کر رہ گیا۔ میں بالکونی پر آگیا۔ ایک بار پھر کوشش کی کہ پکاروں لیکن . . . ؟

کس نام سے پکارتا . . . ؟ کس رشتہ سے آواز دیتا . . . ؟

مخاطب کرنے کا کوئی وسیلہ تو ہونا چاہیے تھا۔ نام . . . رشتہ . . . ! چلتے چلتے پانو سیال سڑک پر رُک گئے۔ سامنے دروازہ تھا ——— کانوں میں پھر وہی صدائے بازگشت . . . !

"بابو . . . !!"

ہر شخص کے ذہن میں ایک معیارِ حسن ہوتا ہے، منتہائے حُسن اگر اُسے لفظ و صوت، رنگ و آہنگ میں ظاہر کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ پیکرِ تخیل، رُوپ کی ایسی جیتی جاگتی تصویر کہ بیساختہ زبان پر آجائے۔

رُوپ تیرا ایسا درپن میں نہ سمائے

الفاظ کے درپن، رنگوں کے آئینے حیران تھے۔

بہرحال میں نے چاہا کہ اُس قوسِ قزح کو کینوس کی زینت بناؤں۔ رنگ دوڑنے لگے کہ اُسے قید کرلیں! میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا اور کینوس پر رنگوں کے جال پھیل رہے تھے . . . اور پتہ نہیں کس جذبے کے تحت میرے ہاتھوں نے تانڈو شروع کر دیا۔ بنی بنائی دُنیا اس کی ساری تخلیق تہہ و بالا ہو گئی . . . اور اندھیرا چھا گیا . . . یہ اندھیرا بڑھتے بڑھتے میرے پورے وجود پر مسلط ہو گیا۔ باہر اندھیرا، اندر اندھیرا، دائیں اندھیرا، بائیں اندھیرا . . .

کینوس پر بے معنی سے بے ربط لکیروں کا جال تھا! میں نے کینوس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے . . .

اور فرش پر ہندم توڑتے ہوئے ریزہ ریزہ ٹکڑے کبھی چہرہ بن کر اُبھرتے کبھی ہاتھ کبھی انگلیاں کبھی آنکھیں، کبھی سرخ سرخ ہونٹ جن کی کمان سے نکلی صدا "ہاہو" اب بھی میرے چاروں جانب گونج رہی تھی۔

ماورائے وجود، تخیل سے تجربہ و مشاہدہ کی ساری بساط مہروں سے خالی تھی۔ وہ ماڈل ہوتی . . . کبھی اس کا ٹھکانا ہوتا . . . تو بھلا رسائی کی اُمید ہوتی . . . آوارہ ہوا کو لگام کیسے دی جاسکتی تھی ؟ ؟ وجدان کی کمی کے باوجود میں نے کسب پر بھروسہ کر کے کام از سرِ نو شروع کیا۔ ہاتھ متحرک ہوئے۔ کچھ لکیریں اُبھریں۔ میں جن خطوط کو کر ایک شبیہہ مکمل کرنا چاہتا وہ خطوط مٹتے جاتے۔ اب حال یہ تھا کہ پورے کینوس پر آنکھیں تھیں لیکن چہرہ نہیں، ہتھیلی تھی تو ان سے انگلیاں غائب تھیں۔ میں برش بدل کر انہیں جوڑنا چاہتا اور جہاں لال، پیلے، سفید دھبے نظر آرہے تھے۔

میں سر تھام کر بیٹھ گیا ——— اب لکیریں کیچوے کی طرح میرے جسم پر رینگنے لگیں اور آنکھوں کے سامنے انگلیاں چھپکلی کی طرح اِدھر اُدھر رینگ رہی تھیں! ذہن میں انتشار تھا تخلیق کا کرب رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ سُرمئی دُھند چھٹتی۔ سنگ خارا سے چشمہ اُبلتا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ سب سحر ایسے ختم ہو جاتا۔ برش کی زبان خشک رہ جاتی۔ کینوس بنجر رہتا . . . چند لال، پیلے، سفید دھبے! . . . پھوڑے کی طرح اُبھر آتے اور میری انگلیاں کٹ کٹ کر نیچے گرنے لگتیں!

وہ دبے پاؤں اسٹوڈیو میں آکر بیٹھ جاتی۔ شرمائی شرمائی، گھبرائی سی، میں تصویر مکمل کر لیتا۔ وہ خوش ہو کر میرے سینے سے لگ جاتی، یوں چمٹ جاتی جیسے اب دُنیا کی کوئی طاقت الگ نہیں کر سکتی ہو۔ وہ میرے پاس ہوتی اور میرے خیال نہ جانے کہاں کہاں بھٹکنے لگتے۔ عجیب خلل، عجیب اضطراب! میں کہ پیاس کا صحرا . . . ایک بوند کو ترستا . . . ہوا۔ اس ساگر سے پیاس کیا بجھا جاتا . . . وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر کنگھی کرنا چاہتی . . . انگلیاں میرے سامنے اُگنا چھنے لگتیں۔ خواب ٹوٹے جاتا ——— نہ وہ ہوتی نہ اس کی تصویر! ایزل پر چڑھے کینوس کی کوکھ خالی خالی، ویران رہ جاتی . . . اور اس کی بیٹی آنکھیں کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔

اب میں اس کی تصویر بنانا نہیں چاہتا ہوں۔ اب مجھے اس کی تلاش بھی نہیں ہے

[illegible]

اتفاق ہی کہیے کہ جب بھی اس سڑک سے گزرتی ہے میری نظر ضرور پڑ جاتی ہے۔

میں اپنے کام سے تھک کر چور ہو جاتا ہوں اور سو جاتا ہوں۔ وہ میرے بستر میں گھس آتی ہے اور سوال کرتی ہے "کیا میری تصویر نہیں بناؤ گے؟" میں خاموش اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگتا ہوں۔ وہ پیار سے میری جانب دیکھنے لگتی ہے۔ میرے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر کنگھی کرنے لگتی ہے۔ اس کی انگلیاں ۔ ۔ ۔ ہتھیلی سے جدا ہو کر میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتی ہیں۔ نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ کینوس پر اس کی تصویر بنی ہوتی ہے لیکن ہاتھوں کی انگلیاں میری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں اور پھر وہ بے انگلیوں کا ہاتھ میرے بالوں میں کنگھی کرنے کو بڑھتا ہے اور میں کانپ اٹھتا ہوں۔ میرا سارا وجود لرز اٹھتا ہے۔ اور وہ انگلیاں میرے سارے وجود کو چٹکیوں میں لے لیتی ہیں! میرے خوابوں کے پرندے زخمی ہو جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ !

●●

۵۲

کرشن موہن

مُچھ

اے راجپوت کی مونچھ اب تو جھک جا
کچھ تو سوجھ بوجھ سے کام لے
اب تو پیار دُکھ اسیم ہو گیا ہے
کوئی منتر تنتر ینتر کام نہ آیا
شباب رندِ خراب حال بن بیٹھا ہے
آج کل تو انا میں فنا ہے دُنیا
مگر انا اور سُکھ کا ساتھ نبھتا نہیں
ازدواجی پیار کے آنگن میں بھی
حکمتِ عمل کا پیڑ ٹھنڈی چھاؤں دیتا ہے
اکڑ کا سہانا پن کتنا عارضی ہے
تُو نہیں جانتی، وہ نہیں جانتا

اے ڈاڑھی پونچھ تو ہی میرے آنسو پونچھ
تو ہی میرا حال پوچھ
اکڑی مونچھ اور ٹیڑھی پونچھ میں کیا انتر ہے؟

تیرا ٹیڑھا پن ہے چنتا کی وہ چلمن
جس کے باہر دھند بھی ہے
پرانی کہاوت کو جھٹلا کر
سیدھا پن اپنا کر
اس کو اجیارے میں بدل دے

اے اکڑی مونچھ کے بال
ٹیڑھی پونچھ کے مایا جال
تو جہاں دونوں کا پُل ہے تو ہی انھیں سنبھال
تیرا مستقبل خطرے میں ہے
تو ہی انھیں سنبھال

ظہیرؔ غازیپوری

شاخ، کبوتر اور گیان

نئی شاخ پر
جو کبوتر
ابھی آکے بیٹھا ہے
اس کے پروں پر
اڑانوں کی تفصیل لکھی ہوئی ہے
یہی عہد ہے
جب پروں پر بھی لکھی ہوئی
ساری تحریریں پڑھنی پڑیں گی
ہر اک رنگ کا زائچہ
جب تمھارے لیے
روشنی اور سورج کی مانند ہوگا
تمھیں بھی نئی شاخ کا گیان مل جائے گا
جس پہ بیٹھا ہوا
اک کبوتر
سفر کر چکا ہے ہر اک سمت کا
وہ مسافر نہیں
راہبر ہے

اسلم آزاد

المیہ

ہوائیں
منجمد ہیں
برف کی قاشیں
فضا میں تیرتی ہیں
لہو کا قافلہ بھی
آج
کچھ بدلا ہوا ہے
بدن کی آگ
بوڑھی ہو رہی ہے؟

تبدیلی

لذتوں کی
اک خلیج بیکراں میں
ڈوب کر
مَیں جو اُبھرا
لنگ
سائن بورڈ کا
بدلا ہوا تھا

حمید سہروردی

چار نظمیں: اُس کے لیے

۱

تیری آنکھوں میں جاگتے ہوئے قمقمے
کبھی شبد بن جائیں گے
تو
ذہن کے سارے دریچے وا ہو جائیں گے
اور
ظلمتیں منور ہو جائیں گی

۲

میں جب تجھے آتما کی پُرنور نظروں سے دیکھتا ہوں
ایلورا کی تھرکتی ہوئی مورتیوں کا
اتہاس جاگ اُٹھتا ہے

۳

یہ تیرا بار بار چونک اُٹھنا
بات بات پر بہک جانا
یہ سب کچھ
جدید مصوری کا اختصار ہے

۴

دھوپ نکلی تو
گملوں میں رکھے ہوئے پودے
جی اُٹھے
تیری سانسوں کی خوشبو پاکر

•

شکیب نیازی

اور تھوڑی دیر

اور تھوڑی دیر
منتظر رہو
بدن کسی بھی حال میں
رائیگاں نہیں ہوئے
بدن کو گر سمندروں کی
روندتی ہوئی ہوا نہیں لگی
لہو کے راستے میں
شورِ احتجاج قتل کر دیا گیا
زباں کے سبز دائرے کے
سب بول ہی جلا دیے گئے
فرشتے آسماں کی اور
خون کی غلیظ چادروں میں باندھ کر
سنسنا دیے گئے
دلوں کے پاک صاف تخت پر
اژدہا بٹھا دیا گیا

تو کیا ہوا؟
بدن کسی بھی حال میں رائیگاں نہیں ہوئے
زمیں کی نیند کی طرف سے مطمئن رہو
کہ — نیند میں بھی یہ زمین اپنی کوکھ کی طرف سے
بے خبر نہیں رہی
کہ — عنقریب نیک ساعتیں زمیں کی کوکھ سے
اُبل کے آئیں گی
کرہ کو عصا دکھائیں گی
اور تھوڑی دیر
منتظر رہو

ارمان نجمی

شیل کے لیے
ہنسی کی کلیاں

جب رات کے سناٹے میں

پہلی بار
میرے کمرے کے اندر
تمہاری ہنسی کی کلیاں چٹکیں
میں بالکل ہی چونک گیا
کیا تم اتنی سچائی سے ہنس بھی سکتی ہو؟
لیکن کب تک
کب تک خود کو
باہر کے طوفانوں سے محفوظ رکھو گی
مجھ کو ڈر ہے

جلدی ہی تم
اپنی یہ بیباک ہنسی کھو دوگی

صحرائے تشنگی میں

یہ تم جو
صحرائے تشنگی میں
برس کے ابرِ رواں کی صورت
بکھر گئی ہو
سلگتے سورج کی آگ جھلسائے گی

تو میں
تمھیں لاؤں گا کہاں سے

سلیمان خمار

دو نظمیں

۱

تم مجھے چاہتی ہو : غلط
میں تمھیں پیار کرتا ہوں سب جھوٹ ہے
سچ تو یہ ہے
کہ ہم
اپنی اپنی ضرورت کے پیچھے پڑے ہیں

۲

روز
ایسا ہو
گھٹا گھنگھور ہو جائے

روز
ایسا ہو کہ
بادل ٹوٹ کر برسیں

اور تنہائی کی چادر اوڑھ کر
چوس لوں ـــــ میں
تمھاری چھاتیوں سے [illegible]
اک ایک بوند ـــــــ

سلطان اختر

چمکتا ہوا راستا ہر طرف
منوّر ترے نقشِ پا ہر طرف

مرے روبرو جا بجا ہر طرف
وہ بکھرا ہے صحرا نما ہر طرف

عجب پیش و پس کی فضا ہر طرف
خودی مجھ میں روشن خدا ہر طرف

وہی بے صدا آئینہ ہر طرف
وہی عکسِ حیرت نما ہر طرف

وہی ہانپتے کانپتے روز و شب
وہی سہمی سہمی فضا ہر طرف

وہی سانس میں زہر گھلتا ہوا
وہی قہر آگیں ہوا ہر طرف

وہی ٹوٹتے سے قدم چار سو
وہی ڈوبتی سی صدا ہر طرف

وہی رات دن کا سفر در سفر
وہی سر پھرا راستا ہر طرف

وہی پست ہوتے ہوئے حوصلے
وہی تیز رو فاصلہ ہر طرف

وہی تہہ بہ تہہ خوف کی چادریں
وہی سب لرزتا ہوا ہر طرف

وہی میں وہی میری مجبوریاں
وہی بے مروّت خدا ہر طرف

سلطان اختر

وہی بے سبب سے نشاں ہر طرف
وہی نقشِ صد رائیگاں ہر طرف

وہی بے ارادہ سفر سامنے
وہی منزلوں کا گماں ہر طرف

وہی آگ روشن ہوئی خون میں
وہی خواہشوں کا دھواں ہر طرف

وہی چلچلاتی ہوئی دوپہر
وہی دھوپ کے سائباں ہر طرف

وہی سب کے سب ڈھیر ہوتے ہوئے
وہی تیز آندھی رواں ہر طرف

وہی بے گھری ہر طرف خیمہ زن
وہی ڈھیر سارے مکاں ہر طرف

وہی وقت کی دھوپ ڈھلتی ہوئی
وہی روز و شب کا زیاں ہر طرف

وہی شہر در شہر مصروفیت
وہی فکرِ کارِ جہاں ہر طرف

وہی جلتی بجھتی ہوئی زندگی
وہی کوششِ رائیگاں ہر طرف

وہی دوڑتے بھاگتے آدمی
وہی جانورپن عیاں ہر طرف

وہی بے ضرر سی زمیں چار سو
[illegible]

ڈاکٹر نریش

جب سے اس شہر میں بھیڑ بڑھنے لگی
جو ہوا تھی خنک لُو سی لگنے لگی

اجنبی شاید اک اور آنے کو ہے
چھت پہ ایک اور دیوار اُگنے لگی

شہر سے گاؤں تک آ گئی جب سڑک
آئینوں پر بہت دھول جمنے لگی

پر ہی تولے تھے اڑنے کو میں نے ابھی
پاؤں نیچے سے دھرتی کھسکنے لگی

گاؤں میں جب سے اک مدرسہ کھل گیا
پنگھٹوں پر اداسی برسنے لگی

اے نریش اپنے بھی بال چاندی ہوئے
باڑھ سی وہ ندی بھی اترنے لگی

شمیم فاروقی

روتے روتے تھک گیا تب جا کے نیند آئی تو کیا
اودھی ساعتوں میں رات شرمائی تو کیا

دل سے نقشِ نارسائی ہی کہیں مٹنے کو ہے
آج جی بھر کے ہوئی میری پذیرائی تو کیا

میں زباں بندی کا قائل ہوں مجھے کیا واسطہ
کردہ ناکردہ گناہوں کی ہو شنوائی تو کیا

اک مسلسل عمر ہی کافی ہے خدا قائم رکھے
عزت و ناموس حاصل ہو کر رسوائی تو کیا

میں نے جب سارے دریچے بند کر ڈالے شمیم
اک نئے موسم کی اب مجھ تک خبر آئی تو کیا

تم ہی اک نہیں گھر کا گھر لے گر
کہ سب کو بہا سیلِ سفر لے

بہت دن سے ناراض تھا اس
مجھے آج وہ اپنے گھر لے

یہاں کیا ہے ویرانیوں کے
کہ سب کچھ وہ بوڑھا شجر لے

اُسے بے بصیرت سے تکتی
وہ اک اک بلا اپنے سر لے

میں بیباک اتنا کہاں تھا
کوئی میرے اندر کا ڈر لے

کرشن مُراری

بسنتی موسم کی دلکش راگنی بھرمائے ہے
اک انوکھی آرزو ہونٹوں پہ سجتی جائے ہے

پھر بُلا کر پاس کس انداز سے جھک جائے ہے
وہ نگاہِ دل نشیں جو خود سے بھی شرمائے ہے

وہ ترا پیمانِ فردا، اور دل کی کائنات
ایک اُمیدِ وفا پیہم مچلتی جائے ہے

وہ خلش احساس کی جو تجھ سے وابستہ رہے
دل میں برسوں تلملائے اور غم کھلائے ہے

پھر آوارگی کا نشّہ سے چھایا ہوا
کان بھر خوابوں کی دل افزا نوا بہلائے ہے

یہ ترتیبِ عناصر کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ کہ اس ترتیب کی ہر سانس میں رم جائے ہے

کچھ تو ہے یہ اپنے اندر ہی مچلتا سا ہوا
جو کسی ذاتِ دگر کی کھوج میں کھو جائے ہے

تھا وہاں دلکش فضاؤں کی کئی رنگینیاں
جھلملاتی شام کا منظر جہاں انسائے ہے

وہ کئی سوچوں کا حاصل یا تقاضائے سفر
ایک عکسِ منتشر پیکر میں ڈھلتا جائے ہے

ایستادہ ہوں میں اپنے ہی کھنڈر میں دم بخود
اک عجب احساس پھر ہونے کا ہوتا جائے ہے

ذرہ ذرہ پھر سمٹتا سا لگے ہے بالیقیں
رُکتا رُکتا رات کا منظر کہیں کھو جائے ہے

اُس نیا دلکش سہانا سا سفر ہے سامنے
بیکراں مستی فضا کی دور تک لہرائے ہے

عاشقی کی کامرانی کا بہت ممنون ہوں
موت بھی اب زندگی کا روپ بن کر آئے ہے

وہ جو دیکھے پھر اُسی انداز سے دل کی طرف
دل کی دھڑکن ایک لمحے کو وہیں تھم جائے ہے

حضرتِ جلوہ گستر کون ہے پھر بام پر
روشنی ہی روشنی ہر سُو بکھرتی جائے ہے

اب عنادل کی زد سے ہے محفوظ اپنا راستہ
منزلوں تک خامشی ہی خامشی لہرائے ہے

شاہد کبیر

ہر آئینے میں بدن اپنا بے لباس ہوا
میں اپنے زخم دکھا کر بہت اداس ہوا

جو رنگ بھر دو اسی رنگ میں نظر آئے
یہ زندگی نہ ہوئی کانچ کا گلاس ہوا

میں کوہسار پہ بہتا ہوا وہ جھرنا ہوں
جو آج تک نہ کسی کے لبوں کی پیاس ہوا

قریب ہم ہی نہ جب ہو سکے تو کیا حاصل
مکان دونوں کا ہر چند پاس پاس ہوا

کچھ اس ادا سے ملا آج مجھ سے وہ شاہد
کہ مجھ کو خود پہ کسی اور کا قیاس ہوا

خورشید سحر

دعاؤں کا اپنی اثر ہر طرف
منور ہیں شام و سحر ہر طرف

خوشی اس کے ہمراہ رخصت ہوئی
اداسی گری ٹوٹ کر ہر طرف

جدھر جی میں آیا ادھر چل پڑے
مسافر کا ہوتا ہے گھر ہر طرف

میں اپنی کہانی سناتا رہا
سسکتے رہے بام و در ہر طرف

یونہی اپنی خوشبو اڑا چار سو
ہوا کی طرح تو بکھر ہر طرف

تھکے حوصلے بے صدا راستے
تباہی کا لمبا سفر ہر طرف

اندھیرے سحر تہہ نشیں ہو گئے
[illegible] ہر طرف

سیّد ارشاد حیدر

نقش اُبھرے لبِ دریا کبھی ایسا ہو
ریگِ تنہائی میں لپٹا ہوا چہرا ہو

ڈھونڈتی رہتی ہیں آنکھیں مری جانے کیا
یاد تو یہ بھی نہیں کچھ مرا کھویا ہو

گھورتا ہے رُخِ آئینہ مجھے اب یوں
جیسے بھولا ہوا چہرہ کوئی دیکھا ہو

چھوڑتا جاتا ہوں میں نقشِ قدم اپنے
کون جانے شبِ رہ میں کوئی بھٹکا ہو

جنبی شہر ہے چونک اُٹھتا ہوں ہر لمحہ
شاید آہٹ کوئی آوازِ شناسا ہو

پرتپال سنگھ بیتاب

میں بے ترتیب پھیلا سلسلہ ہوں
سمٹ جاؤں گا اک دن سوچتا ہوں

فقط اپنے اندھیرے کی ضیا ہوں
بس اتنا جانتا ہوں جل رہا ہوں

پڑا ہوں اندھی گہری کھائیوں میں
نہ جانے کس بلندی سے گرا ہوں

نہیں قابو میں رہتے پانو میرے
غموں کی تال پر میں ناچتا ہوں

مجھے تحلیل ہونا تھا فضا میں

عبدالمتین نیاز

کھوج میں ہم جن کی بے گھر ہو گئے
گم نگاہوں سے وہ منظر ہو گئے

حادثے بھی اب تو چونکاتے نہیں
جینے والے جیسے پتھر ہو گئے

لے گئیں نیندیں مری آگہیاں
خواب سارے گھر سے بے گھر ہو گئے

گھر کی قسمت بن گئیں تنہائیاں
جب سے وہ، الا میں برابر ہو گئے

اب اُجڑتے ہیں نہ بستے ہیں نیاز
ہم تو جیسے بے مقدر ہو گئے

ریت کا نقش ہوں آنکھوں میں بسا کے جاؤ
آنکھ والو! مجھے پستی سے اُٹھا لے جاؤ

جانے کب ختم ہو یہ اندھی خلاؤں کا سفر
سانس لینا ہے تو پھر ساتھ ہوا لے جاؤ

یہ مسرت مجھے تنہا تو نہ راس آئے گی
موسمو! اپنی یہ رنگین فضا لے جاؤ

شاخ سے ٹوٹ گرا تو مرا مصرف کیا ہے
آندھیو! مجھ کو کسی سمت اُڑا لے جاؤ

پھینک آنا کسی خاموشی کے جنگل میں نیاز
شہر کی چیختی بے چین صدا لے جاؤ

شاہد کلیم

عجیب خوف و سراسیمگی ترنگ میں ہے
سرور زہر کا میرے ہر ایک انگ میں ہے

ہمیں صدائیں نہ دو آتے جاتے موسم میں
ہر ایک عضو ہمارا لباسِ سنگ میں ہے

کہیں پہاڑ سے گر کر نہ مر گیا ہو مہر
یہ رات رقص کناں کون سی امنگ میں ہے

کوئی نہ آیا ابھی تک تلاش میں اس کی
کئی برس سے مرے جسم کی سرنگ میں ہے

در و دریچہ پہ دیتی ہے دھیرے سے آواز
خنک ہوا ابھی تو مصروف سرد جنگ میں ہے

میں کھو گیا ہوں اندھیروں کے جنگلوں میں کلیم
مرے وجود کا پرتو سیاہ رنگ میں ہے

محمد سعیدی

تمہیں بھی آئے گا جینے کا حوصلہ لوگو
سمیٹ لو مری بکھری ہوئی صداؤں کو

جوان رکھتا ہے احساسِ کم سنی اس کو
کسی حسین سے تم اس کی عمر مت پوچھو

گلوں سے پیار جتانے کا حق ہے ان کو بھی
چمن میں اڑتی ہوئی تتلیوں کو مت پکڑو

غموں کی دھوپ میں جلنا تو عمر بھر کا ہے
خوشی کی چھاؤں ذرا بھی ملے تو اس میں رکو

وہ دیکھو بند ہوا شب کا آخری در بھی
سحر کی پہلی کرن کو خوش آمدید کہو

مرے بدن میں تمازت بھری ہے سورج کی
مجھے بھی سرد ہوا کا لباس پہنا دو

سفر مدام سفر سے میں تھک چکا ہوں سحر
مرے بدن کو سمندر میں جا کے پھینک آؤ

آمنہ ابوالحسن

کرب اور احتجاج کی ایک مثال

جب مجھ سے خواہش کی گئی کہ جناب چندر بھان خیال کے شعری مجموعے[1] کی رسمِ اجرا انجام دوں تو کوشش پر بھی میرے ذہن میں مصنف یا ان کی شاعری کے واضح خدوخال نہ اُبھر سکے۔ میں نے انھیں پڑھا ضرور ہے مگر کم کم، طے یہ پایا کہ مصنف خود آن کر اپنا تعارف کرائیں گے۔ کچھ اُمید بندھی۔ مقررہ دن خیال صاحب تشریف لے آئے۔ لیکن انھیں دیکھ کر میری اُمید دم توڑ گئی کیونکہ وہ مجھے کسی طرح بھی شاعر نہیں لگے۔ سوچا اب کیا کروں۔ تھوڑا سا سوچا۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد میں نے خیال صاحب سے کہا، اپنے کچھ ایسے شعر سنائیے جن سے آپ کی شاعری کی رُوح مجھ تک پہونچ جائے، وہ یقیناً تیار ہو کر ہی آئے تھے۔ فوراً سُنانے لگے۔ شعر عمدہ تھے مگر مجھے چونکا دینے والا اُن کے لہجے کا اعتماد تھا۔ ساری دشواری یکلخت ختم ہو گئی جیسے ہی اُن کا شاعر ہونا تسلیم ہوا میری آمادگی اپنے آپ منازل طے کر گئی۔

سمندر میں اُترنے کے لیے بے شک پیراکی کی مہارت ضروری ٹھہری لیکن سمند

---

[1] 'شعلوں کا شجر'، ناشر: سلور پبلیکیشن، نئی دہلی۔ قیمت: دس روپیے۔

کو خود میں موجود کرنے کے لیے جس ذہنی کشادگی کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ ان کے مشاہدہ
اور اجتہاد سے گزر کر مجھے نظموں میں حاصل ہو گئی۔

نیا لہجہ۔ نئی تراکیب۔ نئی آواز، نئے انداز، نیا سفر اور ہر نیا سفر کتنے گوناگوں
تجربات اور خوش آیندگیوں کا باعث!

سفر پر نکلنا اہم بات نہیں بلکہ اہم ہے سفر کا کامرانی سے طے کرنا۔ جانے مسافر
اپنے ساتھ کیا کیا لے کر مسافت طے کرتے ہیں لیکن جب مسافر کا زادِ راہ اُس کا اپنا
ذہن ہو وہ سمتوں کا تعین آخر کیوں کرے کہ سمتیں تو خود اُسے پکارتی جاتی ہیں۔

خیال صاحب ایسے ہی مسافر ہیں اور میری خواہش ہے کہ جو آگ انھوں نے خود
میں روشن کی ہے اُسے بجھنے نہ دیں کہ مٹی کا ایک معمولی سا برتن تک جب تک آگ
میں رہ کے مضبوط نہیں ہوتا۔ چلا نہیں پاتا۔ ذات کا اُجالا جب تک زماں کے
اُجالے سے نہیں مل جاتا آفاق اور اپنے عہد کی مسکراہٹ نہیں کہلا سکتا۔ شعر کہنا
شاید مشکل نہیں لیکن اچھا شعر کہنا واقعی مشکل ہے۔ اچھی شاعری وہی ہوتی ہے جو
پڑھنے والے کو بھی احساسِ پرواز عطا کرے اور یہ کیفیت خیال صاحب کے سبھی
اشعار میں تو نہیں لیکن منتخب اشعار میں ضرور پائی جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ہرنیوں کی آنکھوں میں محوِ رقص ہے جنگل
اور اُن کی راہوں میں دُور دُور تک دلدل

پھندے زمیں پر
اور ان کا لہو
پیدا کرتا ہے ہواؤں میں . . .

ترقی کی راہ میں مشینیں چاہے جتنا بھی تیز رفتار رول ادا کریں، انسان کو جسمانی طور
پر ہرا دیں لیکن اس کے ذہن سے سبقت نہیں لے جا سکتیں کہ سارے ذہن اُن کی رفتار
سے بھی تیز تر اپنے پورے اردگرد پر حاوی ہوتا ہے شاید اسی لیے اس مشینی دور میں
چند لمحوں کے لیے بھی اپنی ذات میں اُترنا ویسا ہی خوشگوار جیسا کسی اچھے انسان
بہترین دوست سے ملنا۔ حالانکہ ان کی شاعری میں حالات سے بغاوت اور نا[illegible]

کا احساس۔ زندگی کے کسیلے پن کا رنج جگہ جگہ شدت سے محسوس ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ آرزوئے زیست بھی جو حوصلہ نشاط ہوا کرتی ہے اور بوجھ الم سے لاکھ گراں بار سہی مگر عزم سے نہیں چوکتی۔
سنیے وہ کہتے ہیں کہ

عزم سے ہوتے ہیں تعمیر کے امکاں روشن
کاش تم کو بھی کسی عزم کی جرات ہوتی

اور اُن کے عزم کی آب و تاب اگلے دو اشعار میں اور زیادہ خوبصورتی سے ملاحظہ کیجیے کہ :

تیری ان جھیل سی آنکھوں میں نہ ڈوبوں گا ابھی
میرا دامن میرے اشکوں سے ابھی گیلا ہے

شکستگی کی سلگتی گپھا میں بیٹھا ہوا
وہ اپنا ٹوٹتا ہوا جسم جوڑتا ہوگا

ان کی شاعری میں پیش ہے۔ ایک نئی طرح کی گرمجوشی گونج اور ولولہ۔ معصوم الفاظ میں خیالات کی گمبھیرتا۔ سود و زیاں کا اقرار، انکار ——— ارتقا کا وہ سلسلہ جو الم کی ضرب سے پاش پاش سہی مگر کربناک حقایق کے پیچ و خم میں اُلجھ کر بھی اپنی راہ ڈھونڈتا ہوا۔ زندگی کے کھنڈروں کی تاریکیوں، نمناکیوں اور بدبوؤں سے اُبھر کر روشنی جذب کرتا۔ قوت اخذ کرتا، خوشبو پھیلاتا ہوا۔
اسی بات کو ان کے انداز میں سُنیے کہ :

معبدوں کی زنگ آلودہ خموشی سے پرے
رات کے سہمے ہوئے کاندھے پہ اپنا سر دھرے
دیو داسی کی طرح مظلوم سر سے پانو تک
جل رہا تھا وہ اگربتی کی خوشبو کی طرح

تلخ تنہائی کا اک درد بھرے جیون سے

اور

میں اندھیروں کی رفاقت سے نہیں ہوں بیزار . . .

مجموعی تاثر کے لحاظ سے ان کی شاعری کرب اور احتجاج کی شاعری ہے جیسے :

اب تو الفاظ کے چہرے کی خراشیں پڑھ کر
وقت کو ٹال دیا جائے گداگر کی طرح
ورنہ وہ لمس جو شبنم سے سُبک تر تھا کبھی
آج پھر سینے پہ گر جائے گا پتھر کی طرح

یا

کچھ اس طرح ہیں شب و روز گرد آلودہ
ٹنگے ہوں جیسے پُرانے لباس کیلوں پر

لیکن یہی کرب و احتجاج جب اعتماد اور تمنا بنتے ہیں تو وہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ :

زرد سوکھے آم کے پتّوں پہ لکھ کر اپنا نام
بھول جاتا ہے وہ سارے دن کی کڑواہٹ تمام
اوڑھ لیتی ہیں دِشائیں چادریں جب دُھند کی
مشعلیں تھامے نکلتے ہیں جنوں کے کارواں

اور

تاریکیوں کے چہرے سُورج کی روشنی میں
کچھ سُرخ، کچھ سنہرے، کچھ زرد کچھ ہرے ہیں

ادیب عہد ساز اور عہد شکن ہوا ہی کرتے ہیں۔ اچھے ادب کی جڑیں جس طرح اپنی تہذیب اپنے تمدن میں پیوست ہوا کرتی ہیں خیال صاحب کے خیال بھی انفرادیت کے محدود حلقے سے بڑھ کر اجتماعیت کے وسیع گئے ہیں بانھیں مسائل کیے نظر آتے ہیں اگرچہ ان کی شاعری کو ناقابلِ فراموش بننے کے لیے ابھی بہت سنبھلتا شعور کی زمین میں اور اُترنا ہے۔ پھر بھی میں انھیں تہنیت پیش کرتی ہوں کہ خیال کو خوبصورت لباس پہنانا بھی ایک طرح کی مہارت ہے ؎

چند رنجان خیال

لمحوں کا حصار

ٹھٹھرتی سرد راتوں سے
بھیانک گرم لمحے جب
لپٹتے ہیں تو ہر منظر
برہنہ ہو کے راہوں میں
کسی راہی کے استقبال میں سیٹی بجاتا ہے
کوئی تارا اسی پل آسماں پر ٹوٹ جاتا ہے

زمانہ گنگناتا ہے
انھیں لمحوں کی عیاری کے کالے گیت صدیوں تک
نہ جانے کیوں!
طلسموں کے محل ویران ہو کر بھی
مسلسل جگمگاتے ہیں
در و دیوار سے لپٹے ہوئے سائے
سکونِ قلب پاتے ہیں
ہراساں تیرگی کو گھورتا رہتا ہے سناٹا
بدلتے ہی نہیں کروٹ پرندے صبح ہونے تک

ہوائیں کسمساتی ہیں
بدن ہلنے نہیں پاتے
کوئی چہرہ
کسی چہرے پہ آنکھیں رکھ نہیں پاتا
وہ زہر آلودہ پیالہ ان چھپے ہونٹوں کا اسرار
ستم عیار لمحوں کے
کوئی بھی چکھ نہیں پاتا۔

ہتھیلی پہ چپکتا ہے
کسی بے پر پرندے کی طرح جسموں کا مستقبل
کہاں پائے سکونِ دل
کہ ان قدموں کے صحراؤں کا ہر پیاسا زخمی ہے
دہکتی سرخ اینٹوں پر
کسی پیاسے نے اپنی پیاسی آتما بیدار کر دی ہے

محمد ریحان خیال

ڈریگن کے پروں پر

اور ڈریگن کے پروں پر
بیٹھ کر میں جا رہا ہوں دُور
خود سے دُور انجانے سفر پہ

چونک اُٹھا ہوں اچانک
اپنی آواز سُن کر
اک انوکھے ساز کی جھنکار سُن کر
اس خلا کے بے سرے آغاز و بے انجام میں
یہ گونج کیسی؟
میری آمد کی بھلا کس کو خبر تھی؟

اور ڈریگن لے چلا مجھ کو اسی جانب
جدھر ہے دھیان میرا
اک جزیرہ
یوں اچانک پاؤں سے میرے لپٹ جاتا ہے جیسے
راہ چلتے کوئی پتھر

یہ جزیرہ ہے کہ زہرہ
اس کے پتھر ہیں کہ گوہر
گوہروں کے ڈھیر پر تنہا کھڑی عورت
حقیقت ہے کہ سپنا

خواہشوں کا ناگ پھن کاڑھے کھڑا ہے
چھٹپٹاتا ہوں کہ جیسے
وِش اُگلنے کے لیے سر پھوڑتا ہو کوئی وشدھر

لپلپاتی آگ میں دیکھے ہیں مَیں نے
اپنے بچوں کے بہت معصوم چہرے
اپنی بیوی کا دہکتا پاک جوبن

خوف سا طاری ہے مجھ پر
لڑکھڑاتے ہیں حصارِ جسم کے دیوار و در بھی
کانپتے ہیں بحر و بر بھی

کیوں نہ اب مَیں
اس حصارِ جسم سے نکلوں
مگر نیچے اندھیرا غار
مُنہ کھولے ہوئے ہے
اور ڈر یگی چیختا ہے :

اُترنا ہی پڑے گا پربتوں ک
اس جنگل میں تم کو

جنگلوں کی شاہزادی
یعنی وہ وحشت جو ہر جنگل میں
شاہی حکم بن کر گونجتی ہے
اور جس کے تبسم کا افسوں
کئی جادوگروں کی چھاتیوں پر
چھوٹتا ہے تیز خنجر کی طرح سے
اب تمھاری منتظر ہے

تیرگی نے ڈال دی ہے پاؤں میں زنجیر میرے
میں کہ اپنے جسم کے اندر لرزتا، کانپتا ہوں
ڈھونڈتا ہوں:
کوئی دروازہ، کوئی کھڑکی، کوئی روزن
نکل آئے کہیں سے

اپنی بیوی کا تصور ہے
نہ بچوں کا خیال اب
اب تو اپنی ریڑھ کی ہڈی سے بھی
محروم ہوں میں
اس خلائے بے کراں میں
منتظر ہوں ہوم ہُک میں

خالدہ حسین

ایک پرانی کہانی

برہم لوک کا سیدھا انتری ریتی رواج یہ تھا کہ یہاں کے پردھان کا دیہانت ہونے
پر سبھا کے پرانی رشیوں کی ایک بیٹھک بلائی جاتی جو نئے پردھان کا چناؤ کرتی۔ پر تب ایک بار جب
برہم لوک کے پردھان کا دیہانت ہوا تو وہاں کی سبھا کے پرانی رشیوں کو نیا پردھان چننے میں کٹھنائی
ان کی نظر میں کوئی نیتا جچا ہی نہیں۔ راج سنگھاسن خالی رہنے کے کارن جب [illegible] ہونا
تو سبھا کے پرانی رشیوں نے فیصلہ کیا کہ کل صبح برہم لوک کی سرحد کے اندر جو پہلا شخص داخل ہو اسے
راج سنگھاسن پر بٹھا دیا جائے اور اس طرح سبھا کی رہنمائی کا فیصلہ دیش کے راشی پھل
چھوڑ دیا جائے ——— دوسری صبح برہم لوک کی سرحد میں جو پہلا شخص داخل ہوا وہ ایک
سادھو تھا۔ بھگوے رنگ کا کرتہ، کھدر کی ٹوپی اور ململ کی لنگوٹی پہنے اس کے ہاتھ میں چپل کا جوڑا
سبھا کے پرانی رشیوں نے اس کا روایتی انداز سے ہاردک سواگت کیا اور اسے برہم لوک کے
راج سنگھاسن پر بٹھا دیا۔ اور یوں ایک سادھو مہاراج برہم لوک کے نئے پردھان بن گئے
پردھان بنتے ہی انھوں نے اصول بنایا کہ وہ ہر [illegible] دیش پرانی سمجھا [illegible]

ہیں۔ اس لیے وہ دیش کو پھر سے کال کے حقیقی رنگوں میں رنگ دیں گے اور دیش کو ستیم، شیوم، سندرم بنا دیں گے۔ لیکن راج محل میں آتے ہی اُن کے لوبھ کی دھاتو سونے میں تبدیل ہو گئی اور شکتی کی ملمع رشیم ہیں۔ ان کے لہو کا رنگ کالا ہو گیا۔ اُن کے لیے کان بہرے ہو گئے۔ ان کی معنی آنکھیں مُند سی گئیں، ان آنکھوں نے راج محل سے باہر جھانکنا بند کر دیا ——
پرجا کے پرتی ندھی نے پردھان کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ پرجا بہرے پردھان کو دیکھ کر الجھن میں پڑ گئی اور بے چین ہو گئی۔ برہم لوک میں ہاہاکار مچ گئی . . . لیکن ہاہاکار کا شور راج محل کی دیواروں کے ساتھ ٹکرا کر بکھر جاتا۔ کارن یہ تھا کہ راج محل کی دیواریں فولاد کی بنی تھیں اور لوہا بہرے کانوں سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ دیش کی یہ دُردشا دیکھ کر لوگ ننگے، چودھری بن گئے۔ پرجا کی شانتی بھنگ ہو گئی۔ پرنتو سادھو مہاراج کا فرمان تھا شانتی کا راج . . . اہنسا، پریم، دھرما کی مُنہ بولتی تصویر ہے۔

پرجا کی بے چینی اور اُن کے پرتی ندھیوں کی دُکھی حالت کا پتہ جب شترو کو چلا تو اس برہم لوک پر قبضہ کرنے کے لیے ایک بڑی فوج کو لے کر دیش پر حملہ کر دیا۔ شترو کی فوج نے راج محل کی فولادی دیواروں کو اگنی بان توپوں سے اُڑا دیا۔ جب پرجا کے پرتی ندھیوں نے برہم لوک کے پردھان کو حالات سے آگاہ کیا تو انھوں نے اس اور کوئی دھیان نہیں دیا۔ فولادی دیواریں ٹوٹتے ہی جب شترو اپنی فوج کے ساتھ راج محل میں داخل ہوا تو پرجا کے پرتی ندھی پھر اپنے پردھان کے پاس آئے اور تازہ استھتی کی جانکاری دینے لگے۔ لیکن بہرے پردھان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ انھوں نے سب کو ایک ہی جواب دیا کہ بھگوان سب ٹھیک کریں گے۔ جب شترو سادھو مہاراج کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو پرجا کے پرتی ندھی ایک بار پھر ان کے پاس گئے اور شترو کے راج سنگھاسن پر قبضہ کرنے سے متعلق بتانے لگے ——
مہاراج کے بہرے کان ایک دم چونک پڑے اور آوازوں کو سننے لگے۔ ان کی رگوں میں دوڑتا کالا لہو اپنے اصلی رنگ میں آ گیا۔ انھوں نے پرجا کے پرتی ندھیوں سے اپنا لوٹا مانگا کہ جس پر سونے کا رنگ چڑھایا تھا —— انھوں نے اپنا لوٹا اُٹھایا سب کو جھک کر پرنام کیا . . . اور پھر چور دروازے سے بندرابن کی طرف چلے گئے۔

آنند لہر

راستے کا پہاڑ

"دراصل ہم غلط سمجھے تھے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "وہ پہاڑ جسے ہم دیوتا مان
کر پوجتے رہے وہی ہمارا سب سے بڑا دشمن نکلا۔" "وہ پہاڑ جس کو سر کرتے کرتے ہمارے پاؤں
زخمی ہو گئے تھے اور ہم میں سے کئیوں کے جسم برف کی پیاس بجھانے کے کام آئے تھے اور ہم نے
سمجھا تھا کہ دیوتا نے بلی قبول کر لی ہے۔" میں نے سوالیہ لہجے میں بات کی۔

"تپتے صحراؤں کی زبان ہیں۔ جب ہوا چلتی ہے تو یہ تڑپتے ہیں۔ کیونکہ ہوا بول سکتی ہے
مگر لفظ پتھروں نے اپنے اندر جذب کر لیے ہیں اور روشنی کے زخم چاند کے جسم پر نمایاں ہیں"
زخمی نے تڑپتے ہوئے کہا۔ "ساری لڑائی سمجھ کی ہے دوست ورنہ یہ آگ ہی ہے جو ہمیشہ جلا
جلاتی رہتی ہے۔ یہ خاموشی ہی ہے جو آواز کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے" "لیکن تم زخمی کیسے
ہوئے۔ تمہاری شکل تو الف سے ملتی جلتی ہے اور الف تو ہر چیز کی ابتدا ہے" میں نے سوال
کیا۔

"دوست! الف کو الف نہیں رہنے دیا گیا۔ اسے لفظوں کے بیچ اس طرح گرفتار

گیا اس کا وجود ہی بگڑ گیا۔ اس کی انفرادیت ختم ہو گئی اور جب کسی چیز کی انفرادیت ختم
ہو جاتی ہے تو وہ زندہ رہتے ہوئے بھی مر جاتی ہے۔ یہی بات ہے کہ کسی شخص نے آج تک الف
نہیں دیکھا اور تم نے بھی اسی لیے کہا ہے کہ میری شکل الف سے ملتی جلتی ہے۔
" لیکن پھر بھی تم زخمی کیسے ہوئے " س نے پھر اپنے سوال کو دہرایا " بے وجہ جنگ لڑتے
لڑتے۔ لیکن یہی تو سچ ہے کہ جنگ کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ تمھیں شاید معلوم نہیں کہ سامنے محل
کے کھنڈروں کی دیواروں پر کبھی نہ سمجھ میں آنے والی زبان میں پاگل شخص نے لکھا ہے
یہاں پر ایک بار اس لیے سخت جنگ لڑی گئی تھی کہ سامنے پڑی ہوئی انگوٹھی کو کون اپنی انگلی
میں پہنے گا اور اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹ گئیں "
" لیکن تم نے یہ زخم کہاں سے حاصل کیے " ش نے ایک بار پھر سوال کیا " لفظوں
کی جنگ لڑتے لڑتے۔ دراصل لفظ ہمارے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔ اور ہم اپنے آپ کو
لفظوں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر ہماری اور لفظوں کی کشمکش میں
ہم زخمی ہو جاتے ہیں کیونکہ بے جان لفظوں پر اس لڑائی کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ دراصل الف
سے لے کر ے تک ہی تمام لفظوں کا محور ہے۔ سب کا وجود ایک ہی سا ہے۔ ہم مرتے ہیں لیکن لفظ
زندہ رہتے ہیں۔"
" لیکن ہم لفظوں سے پیچھا کیوں نہیں چھڑا لیتے " ش نے ایک بار پھر سوال کیا۔ " سنو
ایک بار ایک شخص نے لفظوں کو پتھروں کے ساتھ باندھ کر سمندر میں پھینک دیا تھا مگر بعد
میں ہوا کہ پتھر ڈوب گئے لیکن لفظ سمندر کے اوپر پھیل گئے اور دھرتی پر لوگوں نے سنا کہ
سمندر گہرا نہیں ہے اس میں چھلانگیں لگا کر ہیرے موتی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ لوگوں
نے سمندر میں چھلانگیں لگائیں اور ڈوب گئے مگر جتنے انسان ڈوبے اتنے ہی لفظ باہر
آ گئے۔"

" لیکن ان سے پیچھا کیسے چھڑایا جا سکتا ہے " س نے پھر سوال کیا " ہم لفظوں کو حرفوں
میں بانٹ دیں۔ کر دوں لفظ کٹ کر چند حرفوں میں بٹ جائیں گے اور ہم انھیں آسانی سے
الگ کر کے اپنے آپ کو آزاد کر سکیں گے " اتنا کہہ کر وہ زخمی شخص گہری نیند سو گیا۔
" تو تم اس پہاڑ کا ذکر کر رہے تھے " ش نے پھر کہا " سنو دوست ہم سمجھتے رہے کہ یہ پہاڑ،
ہماری حفاظت کرتا ہے۔ مگر اس کی پچھلی طرف تو ہمارا کوئی دشمن ہی نہیں ہے بلکہ وہ چشمہ ہے جس کا پانی

معصوم باتوں کا شاعر

اگر آپ ہلکے پھلکے موڈ میں ہیں تو کوئی گہری سنجیدہ کتاب پڑھنے کی بجائے آپ کا جی چاہتا ہے کہ کسی ہم مزاج بے تکلف دوست سے دیر تک بے تکان گفتگو کریں اور اس گفتگو کو کسی بھی منزل پر گہرے مسائل سے بوجھل نہ ہونے دیں۔ بچوں کی بے پرکی میں جو معصومیت اور تازگی ہوتی ہے، اس کی بھی ایک اہمیت ہے اور یہ اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب آپ ان کی باتوں سے لطف اندوز ہونے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔

ساحل احمد کی غزلیں (جو اگلے صفحات میں پیش کی جا رہی ہیں) اگر آپ اسی ہلکے پھلکے موڈ میں پڑھیں تو آپ یقیناً اپنے اندر اس زندگی آمیز معصومیت کو کروٹیں لیتا ہوا محسوس کریں گے جو شاید آپ سے دور جا چکی ہے۔

ساحل کی باتوں میں بچوں کی سی سادگی ہے۔ لیکن اس سادگی اور معصومیت کے پیچھے چھپے ہوئے نوجوان ساحل کی محرومیاں بھی کہیں کہیں جھلک اٹھتی ہیں۔ جو اس کے معاشرے کی دین ہیں لیکن ان محرومیوں کا عکس کہیں بھی گہرا نہیں ہونے پاتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ساحل کی باتیں کسی زمانہ شناس لیکن سٹھیائے بوڑھے کی گفتگو کی طرح بوجھل ہو جاتیں اور اس غزلیہ روایت کا حصہ بن جاتیں جس کی ہمارے دور کو شاید کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ـــــــ [illegible] تابش

چھ غزلیں

ساحل احمد

۱

چاند کا قصہ لکھا ہے
جھوٹا سچا لکھا ہے

نام محمد صلعم کا
اللہ اللہ لکھا ہے

سبز گلابی موسم ہے
کس کا چہرہ لکھا ہے

آنکھ میں سبزہ ساون کا
ہونٹ پہ غنچہ لکھا ہے

ننھے منے بچوں پر
جنت کا نور لکھا ہے

ہم نے ساحل اپنا بھی
ایک قصیدہ لکھا ہے

۲

جگنو کا پر جلتا ہے
دشت بھی اپنا لگتا ہے

بوڑھے زرد درختوں کو
آندھی کا ڈر رہتا ہے

آج بھی دل کی بستی میں
درد کا سکہ چلتا ہے

سبز فرشتے اترے ہیں
جنگل سہما لگتا ہے

گھٹتا بڑھتا سایہ بھی
شہر کی باتیں کرتا ہے

شعر ہمارے سن کر وہ
رنگ بدلنے لگتا ہے

۳

شب کی رہگزر چمکے
جگنوؤں کے سر چمکے

پھلیوں کے چہرے پر
ریت کا سفر چمکے

آنکھوں سے گھر روشن
پلنگوں کے در چمکے

کاغذی مکانوں میں
فاختہ کا پر چمکے

درد کی تمازت سے
لفظ کا ہنر چمکے

۴

تال پہ گڑیا ناچے گی
اچھی بجیا ناچے گی

بھوت نکل کر بھاگیں گے
چاند کی بڑھیا ناچے گی

بوڑھا طوطا بولے گا
قیدی مینا ناچے گی

اونچے زرد مکانوں میں
زہر کی پڑیا ناچے گی

اماں ابا دیکھیں گے
گھر کی بٹیا ناچے گی

۵

پہاڑوں کی بستی ہے
آگ برابر لگتی ہے

گیلی لکڑی خشک سے
اپنا رنگ بدلتی ہے

آنکھ میں اُجلے پانی کی
صاف لکیر چمکتی ہے

اونچی اونچی بلڈنگ سے
دھوپ شکایت کرتی ہے

دانش ور کی بلی بھی
چُپ کا روزہ رکھتی ہے

۶

عکس اگرچہ مبہم ہے
آتا جاتا موسم ہے

فصل کھڑی ہے گیہوں کی
ایک سنہرا موسم ہے

بہت پُرانا مندر بھی
ایک طرح کا البم ہے

چھوٹی موٹی باتوں پر
آنسو تارا شبنم ہے

ساحل جتنا آپ کو بھی
اس نے پوچھا کم کم ہے

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے کتابیں بھجوانا غیر ضروری ہے

وقار کا سوال

سالانہ شعری انتخابات کی اشاعت کوئی نئی بات نہیں ہے اس سے پہلے بھی ہر طرح کے انتخابات شایع ہوتے رہے ہیں۔ ایک برس کی قلیل مدت میں مختلف رسائل میں چھپی اتنی ڈھیری سی عمدہ نظمیں، غزلیں جمع کر لینا کہ اس سے ڈیڑھ سو صد صفحات پر مشتمل کتاب تیار ہو جائے واقعی ایک کارنامہ ہے۔

کتاب میں جو تخلیقات شامل ہیں، انھیں ۱۹۷۷ء میں چھپنے والے کل بارہ ہندوستانی رسائل سے نقل کیا گیا ہے (دو تخلیقات شعری مجموعوں سے لی گئی ہیں جن کی اس انتخاب میں شمولیت کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی) زیادہ تر چیزیں شب خون، معیار، شاعر، تناظر، سطور، تحریک اور الفاظ سے لی گئی ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں عمدہ شعری ادب کتنی وافر تعداد میں تخلیق کیا جاتا ہے۔ تخلیقات کا ادبی معیار کیا ہے یہ بتانے کے لیے ہر تخلیق کا الگ الگ جائزہ لینے کا حوصلہ تو مجھ میں نہیں ہے البتہ چند شعرا کے نام ضرور سن لیجیے ممکن ہے اسی سے ہی آپ کچھ اندازہ کر لیں کہ یہ انتخاب کن ادبی اصولوں کے تحت کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر جہاں ایک طرف نعمان ابن فیضی، نوبہار صابر، نازش پرتاپ گڑھی، ضیا فتح آبادی، عنوان چشتی جیسے روایت پرست شعرا کی نظمیں، غزلیں شامل کتاب ہیں وہاں عادل منصوری جیسے نئی طرز و فکر کے حامل اور بدنام زمانہ شاعروں کی تخلیقات کو بھی مناسب جگہ دی گئی ہے اور ان کے بیچ بین براج کومل بھی ہیں اور محمد علوی بھی، قاضی سلیم بھی ہیں اور شہریار بھی۔ اس سے ساحل کا یہ اعتراف تو سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اس انتخاب میں ہر مکتبۂ خیال کی نمائندہ شخصیتوں کی چیزیں شامل کر کے جدید و قدیم ادب کی بحث

قطع نظر ایک آزادانہ انتخاب پیش کرنا چاہتے تھے لیکن اس سے کسی خاص دور کے شعری مزاج کی پرکھ کر لینے میں بڑی دشواری پیش آسکتی ہے یہ شاید انھوں نے نہیں سوچا۔

ساحل احمد اگر آئندہ بھی اس طرح کے سالانہ انتخابات شایع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ کسی شعری انتخاب کی اشاعت کا مقصد اپنے بہی خواہوں دوستوں اور دوستوں کے دوستوں کی تعداد میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ اپنے پسندیدہ شعرا کے حلقے کو محدود کرنا ہے اور اگر وہ ایسا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں تو انھیں اور ان کے آئندہ چھپنے والے انتخابات کو ادبی وقار حاصل ہو سکتا ہے۔

نام کتاب: ۱۹۷۷ء کا شعری ادب۔ مرتب: ساحل احمد
قیمت: پندرہ روپے۔ ناشر: اردو رائٹرز گلڈ، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

○

پانی کا بہاؤ

جب کسی منہ زور ندی کا باندھ ٹوٹتا ہے تو ندی کا پانی مختلف راستوں میں چھوٹی بڑی لکیریں بناتا ہوا بہنے لگتا ہے۔ اس عمل کو آپ تخریبی عمل بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اس سچائی سے بھی انکار ممکن نہیں کہ فطرت کا ہر عمل تخریبی ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر تخلیق کے جوہر سے مالا مال ہوتا ہے۔

فطرت کسی بھی طرح کے جبر سے آزاد ہے اور اپنی بے کنار وسعتوں میں پل پل ٹوٹتی اور جڑتی رہتی ہے۔ جبکہ انسان جبر کے حصار میں بھی خود کو جی لیتا ہے اور سیاسی اور معاشرتی دباؤ کے تحت اس کا ہر عمل غیر فطری ہوتا ہے یہاں تک کہ اپنے اظہار میں بھی وہ ایسی کٹھور بندشوں میں گھرا رہتا ہے جو اسے زندگی بھر اس کی ذات سے الگ کیے رکھتی ہیں۔

خارجی دباؤ سے آزادگی حاصل کر لینا اور بوڑھے درخت کی سوکھی چھال کو جڑ سے ترخا کر نئی، توانا اور تازہ چھال کی طرح ابھر آنا ایک ایسا فطری عمل ہے جو تخریبی ہوتے ہوئے بھی تخلیقی توانائی سے حاملہ ہے۔ اسی موضوع کی حامل یہ نظم

ملاحظہ کیجیے:

بوڑھا پیپل / حیران حیران / دیکھ رہا ہے ...
اس کے تن پر / سوکھی چھال / جگہ جگہ سے / ترخ گئی ہے
وہ بے چارا / سوچ رہا ہے
شاید کوئی روگ لگا ہے
اور حقیقت / مجھ سے پوچھو
نئی توانا، تازہ چھال / موسم گُل آتے ہی / بے چین ہوئی ہے
زور لگا کر / سوکھی چھال کے ٹکڑے کر کے / اُبھر رہی ہے۔

غیر فطری جبر سے آزادی کی خواہش انسان کی غالباً سب سے پرانی اور عزیز ترین خواہش ہے۔ سیاسی اور سماجی دباؤ اور فطری آزادہ روی کے مختلف مظاہر کو تجربہ دیکھنے کے لیے مشتاق علی شاہد کی نظموں کا مجموعہ 'ریزہ ریزہ اکائیاں' کا مطالعہ دل میں سوئی ہوئی اس خواہش کو جگا دیتا ہے، جس کی تکمیل ہر تخلیق کار کا منصب ہے۔

فطری اور غیر فطری یعنی داخلیت اور خارجیت یا دوسرے لفظوں میں دو حقیقتوں کا ٹکراؤ شاہد کی نظموں کا بنیادی موضوع ہے۔ جگہ جگہ اس تصادم سے پیدا ہونے والے نقش مختلف رنگوں میں نظر آ جاتے ہیں۔ ایک سچائی وہ ہے جو شاعر کے باطن میں روشن ہے اور ایک سچائی وہ ہے جو اس کے خارج کی روشنی کو اس قدر تیرہ کیے ہوئے ہے کہ جس سے اس کی بصارت ختم ہو رہی ہے۔ اور نتیجتاً اسے اپنے گرد و پیش کے سارے مظاہر غیر حقیقی اور غیر فطری نظر آ رہے ہیں۔ یہیں سے شاہد کے ہاں ایک طرح کی دردناکی پیدا ہو گئی ہے اور اس کا لہجہ کہیں کہیں دکھ سے بھرا ہوا لگتا ہے۔

اس تصادم کا ایک نقش اس کی نظم 'دوسرے لمحے کا سچ' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں ایک ہی شخصیت ہے لیکن دو حصوں میں منقسم ہے لہٰذا اسے دو شخصیتوں کے طور پر جانا اور پہچانا جا سکتا ہے۔ مسئلہ یہاں بھی وہی ہے یعنی ایک شخصیت فطری عمل کی پیداوار ہے جبکہ دوسری شخصیت کی تشکیل میں خارجی غیر فطری عوامل شامل ہیں۔

مگر یہ اس مجموعے میں شامل نظمیں اپنے الگ الگ نقوش سے پہچانی جا سکتی ہیں

لیکن ان کا بنیادی رنگ ایک ہی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ موضوعی سطح پر ان میں ایک خوشگوار ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہے جو ان تمام نظموں کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہے شاہد کے ہاں دو شخصیتوں، دو سچائیوں اور دو دلوں کے درمیان تصادم کے نتیجے میں شکست و ریخت کا جو عمل کارفرما ہے اسے ابھی اور شدید ہونا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تب اس کے لہجے کی پژمردگی، گہری آنچ میں بدل جائے گی اور وہ سماجی اور سیاسی جبر کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے اپنے لہجے کو زیادہ نوکیلا اور با اثر بنالیں گے۔

کتاب بجید صاف ستھری چھپی ہے یعنی اتنی خوبصورت کہ اسے چھونے سے پہلے ہاتھوں کو صابن سے صاف کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

نام کتاب: ریزہ ریزہ اکائیاں
قیمت: پندرہ روپے

شاعر: شتاق علی شاہد
ناشر: معیار پبلی کیشنز، سی ۹۱/۲
حوض خاص، نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۶۔

○

پرانی مٹی کی تلاش

کرناٹک کی اپنی ایک الگ تہذیب ہے جو بہت قدیم ہے۔ اس کی مٹی میں اور اس کی فضا میں وہ تہذیبی خوشبو آج بھی رچی بسی ہے جسے دراوڑی عہد سے منسوب کیا جاتا ہے۔ آج بھی ہم اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش میں اسی سرزمین کا رخ کرتے ہیں اور واپسی پر ایک طمانیت بخش موسم کی یادیں سینے میں چھپا لاتے ہیں۔

اسی طرح کنڑ زبان کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے۔ ابتدا میں کنڑ پر سنسکرت نوری حاوی رہی۔ دربار عہد میں شعرا کو قصیدہ گوئی کے لیے مشکل پُرشکوہ الفاظ کی تلاش میں سنسکرت زبان کی طرف رجوع کرنا پڑتا اور نتیجے میں کنڑ شاعری ایک طویل مدت تک عام بول چال کے فطری لہجے سے کسی قدر دور رہی۔ آج بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس زبان کا رشتہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح سنسکرت سے منقطع نہیں ہوا جو اس زبان کی توانائی اور دیرپا زندگی کی علامت ہے۔ لیکن اب مشکل الفاظ کی جو سنسکرت کے

بیٹھے نام شبدوں نے لے لی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عام بول چال کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال ہونے لگے ہیں۔

اُردو اور دوسری زبانوں کے ادب کی طرح کنڑا شعر و ادب میں بھی سماجی حقیقت نگاری کے نام پر سطحی اور اخباری تخلیقات کو ایک عرصہ تک ممتاز حیثیت سے پیش کیا گیا۔ لیکن (۵۰ ۱۹ء میں) ڈاکٹر وی کے گوکاک نے بمبئی میں منعقدہ ایک ادبی اجلاس میں ترقی پسندی کے اس سارے عمل کو غیر فطری قرار دیا اور کنڑا زبان میں لکھنے والوں کو تخلیقی ادب کی طرف متوجہ کیا۔

یہیں سے ترقی پسندی کا زوال شروع ہوا اور جدید ادبی میلانات کی ابتدا ہوئی جس کا سلسلہ کنڑا کے موجودہ شعر و ادب تک چلا آتا ہے۔

شب گرد کنڑا زبان کے نوئے پرانے شعرا کی نظموں کے اُردو تراجم پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں شامل چندر کانت کستورکی ۷ نظمیں بطور خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ کستور کے ہاں اپنی گمشدہ تہذیب کی تلاش کا عمل پوری شدت کے ساتھ کارفرما ہے۔ جگہ جگہ اس تلاش کے نقوش گہرے اور تیکھے نظر آتے ہیں اور دل میں اس سرزمین کے ابتدائی زرعی معاشرے کی یاد تازہ کر دیتے ہیں؛ جو ایک پُرسکون دور میں زندہ اور سرگرم عمل تھا۔ مثال کے طور پر ان کی نظموں کے یہ ٹکڑے ملاحظہ فرمائیں:

میں جب بھی کسی یاد کی دھند میں / کھوتا ہوں صحیح راستے کو
وہ آواز کہتی ہے / میں کچھ نہ پوچھوں /
اسی سحر انگیز آواز کی جستجو میں / اس راستے پر رواں ہوں
جو شاید کہیں ختم ہوتا نہیں ہے

یہ ندی / بہا کر مجھے دور تک لے کے جاتی ہے لیکن
مرا جسم ساحل سے ہٹتا نہیں ہے
یہیں، کل مرے پاؤں چھو کر جو اک لہر واپس ہوئی تھی
وہ اب سیکڑوں میل تک بڑھ گئی ہے
اور اس لہر سے پہلے جو لہر آئی تھی

وہ اور بھی دُور تک سا چکی ہے
شروعات سے آخری باب تک / میرے پُرکھوں کی تاریخ پڑھ کر
کسی بے کراں راستے پر گئی ہے

کسکور کے علاوہ بڑ تا ہنگ میرے، کے یس نثار احمد اور گوپال کرشنا اڈیگا کی نظمیں بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے متاثر کرتی ہیں۔ ان نظموں کا ترجمہ حمید الماس نے براہ راست کنڑا زبان سے کیا ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کنڑا نظموں کا اُردو میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ ایسی کچھ نظموں کا ایک مجموعہ فرمودات کے نام سے غالباً دو تین برس پہلے شایع ہو چکا ہے۔

حمید الماس کا شمار اُردو کے ممتاز جدید شعرا میں ہوتا ہے ان کی ایک نظم 'پیت کیے دُکھ ہوئے' مجھے آج بھی یاد ہے جو اب سے سترہ اٹھارہ برس پہلے ا۔بی دُنیا کے کسی شمارے میں شایع ہوئی تھی اور جس کی اثر انگیزی آج بھی قائم ہے۔ وہ نظم ہندی و سنسکرت شعری اسالیب کی یاد دلاتی تھی۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا۔ کہ وہ کنڑا زبان کے شعر و ادب کے، جو سنسکرت کی ادبی روایات سے مالا مال ہے۔ نبض آشنا ہیں۔ یقیناً کنڑا نظموں کو اُردو میں منتقل کرنے میں انھوں نے پوری دل جمعی سے کام کیا ہوگا ان تراجم کی صحت کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنے کا میں خود کو اہل نہیں سمجھتا کیونکہ میں کنڑا زبان سے قطعی ناواقف ہوں لیکن مصرعوں کی روانی اور اظہار کے ستھرے پن کو ترجمے کی کامیابی کی ضمانت قرار دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نام کتاب: شب گرد (کنڑا نظمیں) مترجم: حمید الماس
قیمت: دس روپے۔ ملنے کا پتہ: حمید الماس، بی ۵۵ ۱۳۔
بلاک ۹، جے نگر، بنگلور۔ ۵۶۰۰۱۱

○

ہندی کا جادو

فارسی کے شعری اسالیب کے غلبے کی وجہ سے اُردو شاعری ہندوستانی مٹی کی

خوشبو سے بڑی حد تک محروم رہی ہے۔ گیت اور دوہا جو اس سرزمین کی پیداوار ہیں اُردو شعرا کو زیادہ راس نہیں آئے۔ گنتی کے چند شعرا نے ان اصنافِ شعر کی طرف توجہ ضرور دی ہے لیکن اس کے باوجود وہ انھیں ادبی اعتبار کا درجہ دلانے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔

اُردو میں سب سے پہلے جمیل الدّین عالی نے دوہے کو رواج دینے کی کوشش کی تھی اور انھوں نے بلاشبہ کامیاب دوہے کہے ہیں۔ ان کے دوہوں میں پنجابی عورت کی بے تکلف گفتگو کا انداز ملتا ہے جس کی مثال اُردو شاعری میں اس سے پہلے کہیں نہیں نظر آتی لیکن ایک تو ان کے دوہے اصل ہندی بحر میں نہیں ہیں دوسرے ان میں وہ سادگی اور تہہ داری کا فقدان ہے جو مثلاً بھگتی دَور کے شعرا کے ہاں نظر آتی ہے۔

اعجاز (بھگوان داس نا گپال) غالباً پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اصل ہندی بحر میں دوہے لکھے ہیں۔ یہ ایسی سادہ اور چھوٹی موٹی بحر ہے جس میں فارسی کی تراکیب کی کھپت ممکن نہیں ہے۔ ہندی کے نرم الفاظ اس بحر میں جو جادو جگاتے ہیں، اعجاز کے دوہے اس کی عمدہ مثال پیش کرتے ہیں۔

"آس نراس کی شام" اُردو میں شائع ہونے والا پہلا مجموعہ ہے جو صرف دوہوں پر مشتمل ہے۔ یہ دوہے حسن و عشق کی جو تصویریں پیش کرتے ہیں ان کی سادگی میں پُرکاری ہے اور شوخی میں بلا کی نرمی جو قاری کو فوراً متوجہ کرتی ہے۔ عصری آگہی سے بھی شاعر بے خبر نہیں ہے۔ اس مجموعے میں جگہ جگہ ایسی مثالیں مل جاتی ہیں جو گرد و پیش کی دُنیا کے منظر پیش کرتی ہیں۔ ان دوہوں کی رنگا رنگی ملاحظہ فرمائیے:

دھیرے دھیرے بڑھ رہے دیواروں کے چھید
گلی گلی میں کھل گئے میرے گھر کے بھید

دن کو ڈھلتے دیکھ کر ٹوٹی من کی آس
آنے والی بھور کا کون کرے وشواس

اس کارن چمکا دے خط پر جگنو سات
پنچھی تیری راہ میں ہے اندھیاری رات

گلشن گلشن اُڑ رہی بھید بھری سی دھول
ایسے میں مانگے سجن مجھ سے مہکے پھول

نیت اس گجراج کی مجھے رہی ہے دیکھ
کھا جائے گا کھیت کی پتلی پتلائی ایکھ

لگا ابھی گر جائے گا آسمان کا تاج
انگڑائی لیتے ہوئے دیکھا ان کو آج

پہلے دن ہم سیج پر جاگے ساری رات
اس نے میری مانگ میں بھرے ستارے سات

روگن بارہ ماس کی برہا دُکھ تڑپائے
آگ گلائے لوہ کو دیمک لکڑی کھائے

اس مجموعے کی اشاعت کے بعد یہ اُمید ہو چلی ہے کہ دوہے کو اُردو میں ادبی اعتبار حاصل ہوگا۔

نام کتاب : آس نراس کی شام
ناشر : سطور پرکاشن، نئی دہلی۔
شاعر : اعجاز
قیمت : ۷ روپے

○

تنوع کا فقدان

ری زندگی میں بہت کم ایسے موقعے آئے ہیں جب میں نے درجن بھر افسانے ایک

ہی نشست میں پڑھ لیے ہوں۔ سستے تفریحی ادب اور جاسوسی ناولوں کی بات الگ ہے جیسے ٹرین یا بس میں طویل سفر کے دوران آدمی چاٹ جاتا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب "آدمی" الیاس احمد گدی کے تیرہ افسانوں پر مشتمل ہے جسے میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا ہے۔ الیاس احمد اس افسانوی روایت سے تعلق رکھتے ہیں جس میں پلاٹ اور کردار کو اولین حیثیت دی جاتی ہے۔ صرف ایک افسانہ "۲۵ مارچ کے بعد کا ایک دن" کو چھوڑ کر بقیہ بارہ افسانے اسی افسانوی روایت کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ کردار اور پلاٹ کے افسانوں کا میں مخالف نہیں ہوں لیکن ان میں تنوع پہلی شرط ہے جس پر یہ افسانے پورے نہیں اترتے۔ پلاٹ اور کرداروں کی حد درجہ یکسانیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ الیاس نے اپنے گردوپیش کو اور معاشرے کے مختلف افراد کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے اور پہچاننے کی قطعی کوشش نہیں کی۔

"سنالی"، "سونا"، "سونا کی موسی"، "عزت آرا"، "عاصمہ"، "رخسانہ" اور "نیلیا مکھرجی" اگرچہ الگ الگ افسانوں کے کردار ہیں لیکن ان کے اعمال ایک دوسرے سے بالکل مختلف نہیں ہیں۔ جیسی جنس زدہ یہ عورتیں ہیں اسی طرح مختلف افسانوں میں مرد کردار ہیں جو مختلف ناموں سے اپنی شہوت پرستی کا ثبوت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ظفر صاحب، عزت آرا کا ہیرو "میں"، شہزاد، غفورا، لیکھ راج اور رائیکل وغیرہ، اسی طرح اگر ایک طرف جوزفائیں، ناظمہ اور انور کی بیوی ہے تو دوسری طرف افضال کے ابا، انور اور دیوان صاحب ہیں جو کسی بھی طرح ایک دوسرے سے الگ نہیں نظر آتے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ الیاس کی کل متاع چار پانچ کردار ہیں جن کو انھوں نے یکساں اعمال میں مصروف رکھا ہوا ہے اور وقتاً فوقتاً وہ ان کرداروں کو مختلف ناموں سے پیش کرتے رہتے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ عام قاری کا حافظہ بیحد کمزور ہوتا ہے اور وہ مختلف رسائل میں چھپے ہوئے افسانے مختلف اوقات میں پڑھ کر ان کی یکسانیت کو بھول جاتا ہے لیکن جب یہ افسانے کتابی صورت میں ایک ساتھ چھپ گئے ہیں تو الیاس کی افسانوی دنیا کا کل اندوختہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ وہ اس جہان سے اتنا سرسری گزر گئے ہیں جس کی توقع ان جیسے پرانے لکھنے والے سے ہرگز نہیں کی جاسکتی۔ اسی تن آسانی کا نتیجہ "آدمی" اور "لیڈر" جیسے افسانے ہیں جو چند سطروں

میں لطیفے کے طور پر لکھے جا سکتے تھے۔ البتہ 'ہارے ہوئے لوگ' اور 'ستین' یہ افسانے کسی قدر مختلف ہیں۔ ان میں بعض کرداروں کے اعمال بڑے فطری ہیں لیکن یہاں بھی عجز بیانی نے اپنے جوہر دکھائے ہیں اور اختتام تک پہنچتے پہنچتے افسانہ غیر تخلیقی رویے کا شکار ہو کر مریل مریل سا نظر آنے لگتا ہے۔ مثلاً 'ہارے ہوئے لوگ' کہانی میں اگر ماریا کی جنس زدگی کو نہ لے کر صرف ماریا کے کرب کو اُبھارا جاتا تو یہ اچھا افسانہ بن سکتا تھا۔ مثال کے طور پر افسانہ نگار کا یہ بیان :

> اس دو کمروں کے چھوٹے سے بوسیدہ گھر میں ہر آدمی خوف زدہ ہے۔ جمیلہ ماریا کی نگاہوں سے خوف کھاتی ہے۔ اس کا باپ جو زیا کی شادی سے خائف رہتا ہے اور ماریا اپنی موت سے ڈرتی ہے اور وقت سہما ہوا، ڈرا ہوا ان کے قریب سے گزرتا ہے جیسے وہ بھی خوف زدہ ہو کر کہیں یہ نازک ترین رشتے ٹوٹ نہ جائیں۔ ایک مشکوک غیر معتبر خاموشی سارے گھر پر چھائی رہتی ہے۔

اور اس کے فوراً بعد یہ بیان :

> (ماریا) کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ مر چکی ہے اور یہ کمرہ دراصل اس کا تابوت ہے۔ ابھی ذرا دیر میں لوگ آئیں گے اور اس تابوت کو اُٹھا کر لے جائیں گے ایک جہنم سے دوسرے جہنم کی طرف۔

اگر افسانے کو صرف اسی جہنم تک محدود رکھا جاتا جو ماریا کا مقدر بن چکا ہے تو اس کی تعبیر ذرا مختلف ہوتی اور یہ افسانہ موجودہ معاشرے میں ڈرے سہمے لوگوں کی حقیقی تصویر پیش کرتا اور ماریا بے بسی کی علامت بن جاتی۔ اسی طرح 'ستین' میں رینو اور ستین کے کرداروں کو عالمانہ اور فلسفیانہ گفتگو سے اگر دور رکھا جاتا تو افسانے کی معنویت اُبھر کر سامنے آسکتی تھی۔

'۲۵ مارچ کے بعد کا ایک دن' اس مجموعے کا عمدہ افسانہ ہے جو الیاس کی تخلیقی رویوں کی جانب پیش قدمی کو، اور اس میں پوشیدہ امکانات کو ظاہر کرتا ہے۔

نام کتاب : آدمی — مصنف : الیاس احمد گدی

ناشر : شب خون کتاب گھر، الہ آباد۔ — قیمت : دس روپے

جدیدیت کا منظر نامہ

ڈگری حاصل کرنے کے لیے جو مقالے تحریر کیے جاتے ہیں ان کا معیار عام طور پر بہت پست ہوتا ہے۔ طالب علم ادھر ادھر سے اقتباسات اکٹھا کر انھیں یکجا کرنے کے عوض میں ادب کے ڈاکٹر کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے اکثر مقالے تو یونیورسٹی لائبریریوں میں ہی دفن ہو جاتے ہیں لیکن کچھ بے شرم قسم کے لوگ لکچرر شپ حاصل کرنے کے لیے انھیں پکی روشنائی میں چھپا بھی لیتے ہیں۔ اس افسوسناک صورتِ حال کے باوجود کبھی کبھار کوئی ایسا تھیسس بھی سامنے آجاتا ہے جس کے اعلیٰ ادبی معیار کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' ایک ایسے ہی تھیسس کا پہلا حصّہ ہے جس پر شمیم حنفی کو ۱۹۷۶ء میں ڈی لٹ کی ڈگری دی گئی تھی۔ (دوسرا حصّہ 'جدید شعری روایت' کے نام سے طبع ہوا ہے، جس پر الگ سے تبصرہ ہوگا) مصنّف نے اپنے طریقِ کار کی وضاحت کرتے ہوئے 'حرفِ آغاز' میں لکھا ہے :

> اس مقالے میں یہ کوشش مقصود نہیں رہی کہ افکار کا ایک خاکہ تیار کر کے جدیدیت کی ترجمان شاعری کو اس میں سمو دیا جائے۔ راقم نے اپنی حقیر جستجو کا آغاز اس شعری سرمایے کے مطالعے سے کیا تھا جس سے ایک نئی تخلیقی اور فکری فضا تعمیر ہوتی ہے اور اس کی تصدیق کے لیے ان علما و مفکرین کی جانب نظر کی جنھیں افکار و اظہار کے نئے زاویوں کے مفسّرین کی حیثیت حاصل ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ شمیم حنفی کا طریقِ کار ان کتنی لوگوں سے کتنا مختلف ہے جو مغربی مفکّرین کے افکار سے ماخوذ نمونے اردو شعر و ادب میں تلاش کر لیتے ہیں۔

عالمی پس منظر میں جدیدیت کو سمجھنے اور پرکھنے کی یہ پہلی کامیاب ترین کوشش ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں انیسویں صدی کے عالمی پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے اور مغرب اور مشرق کے مفکّرین کے افکار کی روشنی میں جدیدیت کے تاریخی تصوّر کو، اس کے فلسفیانہ اور ادبی رویّوں کے پیشِ نظر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں بیسویں صدی کے مفکّرین و علما اور ممتاز ادبا کے نظریات کے حوالے سے عہدِ جدید کے انسانی مسائل کا مکمل منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں

صنعتی معاشرے کی پیدا کردہ نئی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے جدید ادبی اور شعری تصورات کے خاکے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

کتاب کا چوتھا اور آخری باب بڑا اہم ہے جس میں مارکسزم، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے فکری اور ادبی تصورات سے بحث کی گئی ہے اور مصنّف کی طرف سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں ان سے اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے۔ وہ لوگ جو آج بھی جدیدیت کو ترقی پسند تحریک کی توسیع سمجھتے ہیں۔ انھیں کتاب کا یہ باب ضرور پڑھ لینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ شمیم حنفی کے تجزیے کی روشنی میں وہ بھی اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ " اشتراکی حقیقت نگاری اور جدیدیت میں کسی نقطۂ اتصال کی جستجو لا حاصل (نئی شاعری کو ترقی پسند شاعری کی توسیع سمجھنا نئی شاعری کے مزاج اور جدیدیت کے نظام افکار سے بے اعتنائی کی دلیل ہے۔"

جدیدیت پر یہ پہلی مکمّل کتاب ہے جس میں انیسویں اور بیسویں صدی کے مفکرین و علما کے افکار کے حوالوں سے جدیدیت کے صحیح تصوّر کو پیش کیا گیا ہے۔

نام کتاب : جدیدیت کی فلسفیانہ اساس۔ مصنّف : شمیم حنفی
ناشر : مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی۔ قیمت : ۲۵ روپے

○

سطور ۹

دوسرا ایک موضوعی خصوصی شمارہ

جولائی ۱۹۷۹ء میں شایع ہوگا

جلد: ۹ — نمبر ۳ — قیمت:
ستمبر: ۱۹۷۹ء — فی جلد: ۳ روپے
سالانہ: ۱۲ روپے

ترتیب:

کمار پاشی

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:

سطور پرکاشن، ۳۲۳/۱ دہلی گیٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اگلے صفحات میں

پرنٹر پبلشر : درشن کماری ۔ کتابت : جمال گیاوی ۔ طباعت : نعمانی پریس دہلی

پہلا نیک قدم

○ سطور کے پچھلے شمارے میں ہم نے ہندوستان کی تمام صوبائی اُردو اکیڈمیوں سے درخواست کی تھی کہ وہ حکومت سے ملنے والی سالانہ مالی امداد میں سے کچھ رقم سنجیدہ ادبی رسائل کی بقا کے لیے بھی وقف کریں۔ اس سلسلے میں ہم نے یہ تجویز بھی رکھی تھی کہ وہ معقول تعداد میں ادبی رسائل کی جلدیں خرید کر ان کتب خانوں میں تقسیم کر دیا کریں جنھیں اکیڈمیوں کی مالی امداد حاصل ہے۔

○ ہمیں اپنے قارئین کو یہ خبر دیتے ہوئے دلی مسرت ہو رہی ہے کہ ہماری درخواست رائیگاں نہیں گئی۔ کرناٹک اُردو اکیڈمی کے اراکین مبارک باد کے مستحق ہیں جنھوں نے اس سلسلے میں پہلا قدم اُٹھاتے ہوئے چند سنجیدہ ادبی رسائل کی ادبی خدمات کے پیش نظر انھیں کچھ رقم مالی امداد کے طور پر دینے کا اعلان کیا ہے۔ ان رسائل میں سطور بھی شامل ہے۔

○ ہم اپنے قارئین کو ایک بار پھر یاد دلادیں کہ ہماری صوبائی اُردو اکیڈمیوں کو اُردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں لاکھوں روپوں کی رقم ہر سال حکومتِ ہند کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔ کتابوں کی اشاعت، ان کے مصنفین کو انعامات، ضرورت مند اور بوڑھے بیمار ادیبوں کو اور اُردو کتب خانوں کو مالی امداد دیے جانے کے ساتھ ساتھ اگر اس رقم کا کچھ حصہ سنجیدہ ادبی رسائل کی بقا اور ان کی توسیع اشاعت پر خرچ کیا جائے تو ان رسائل کو کم سنی میں مرنے سے بچایا جا سکتا ہے۔

○ کرناٹک اُردو اکیڈمی نے ہماری تجویز پر جو نیک قدم اُٹھایا ہے ہمیں یقین ہے کہ دوسری صوبائی اُردو اکیڈمیاں بھی اس پر عمل پیرا ہوں گی۔

—— کمار پاشی

شاعر افسانہ نگار

اپنے طویل مضمون "نئی افسانوی تقلیب" (جواز شمارہ ۶) میں میں نے ایسے افسانہ نگاروں کو شامل نہیں کیا تھا جو شاعری کرتے ہیں اور بحیثیت شاعر اپنی جگہ پہلے ہی بنا چکے ہیں یا مشہور ہو چکے ہیں۔ چنانچہ یہاں پاس کا یہ اقتباس پیش کرنا بے جا نہ ہوگا۔

جہاں تک بلراج کومل اور کمار پاشی کا تعلق ہے دونوں حضرات بحیثیت شاعر اپنا مقام بنا چکے ہیں اور مشہور ہو چکے ہیں۔ البتہ بحیثیت افسانہ نگار انھیں خاطر خواہ شہرت نہیں ملی ہے چنانچہ ان کے افسانوں پر ایک نئی سطح سے تنقید کی ضرورت ہے تاکہ ان کی جگہ متعین ہو سکے۔ عالمی ادب میں بھی شاذ و نادر ہی کسی فنکار کی گرفت میں شاعری اور افسانہ نگاری کی دو مختلف الجہت صنفیں اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ آئی ہیں۔ یہ تو ضرور دیکھا گیا ہے کہ افسانہ نگاروں نے شاعری اس لیے کی ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ایک لمحے کے لیے پرسکون (RELAX) کر سکیں۔ مگر وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہی رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں یہی بات ان شاعروں کے متعلق

مہدی جعفر

ہوتی ہے جنہوں نے افسانے لکھے ہیں۔ ظاہر ہے اس کی نفی یا اثبات کے لیے
الگ سے تنقید کی ضرورت ہے تاکہ شاعر افسانہ نگاروں کو افسانہ نگاری کی
صنف میں اور افسانہ نگار شاعروں کو شاعری کی صف میں شامل کیا جا سکے۔

مضمون کے اس حصہ کو پڑھنے کے بعد اکثر حضرات کو خیال آیا ہوگا کہ کیا فرق پڑتا اگر یہ
بکھیڑا نہ اٹھایا گیا ہوتا اور براہ راست ان کے افسانوں پر تنقید اسی طرح کرلی گئی ہوتی جیسے
دوسرے فنکاروں پر کی گئی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل درست ہے۔ مگر میرا کہنا یہ ہے کہ
ایسی جلدی بھی کیا پڑی تھی جبکہ فنکار خود بھی اپنے فن کو ایک اچھوتے زاویۂ نظر سے دیکھنے
کی دعوت دے رہا ہے۔ اس طرح وہ بہت سی ایسی بنیادی باتوں کی طرف متوجہ بھی کر رہا ہے جو
شاعری اور افسانہ نگاری کے درمیان پل بناتی ہیں۔

جو فنکار افسانہ نگاری اور شاعری کی دو مختلف صنفوں پر اپنا اختیار ظاہر کرتے ہیں
ان کے سلسلے میں بہت سے سوالات اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً کیا وہ بیک وقت دو کشتیوں
پر سوار نہیں ہیں؟ کیا یہ دونوں کشتیاں مخالف سمتوں میں چل رہی ہیں؟ یا مختلف سمتوں
میں؟ یا ان کی سمت ایک ہی ہے؟ اگر سمتوں کا اختلاف ہے تو یہ کیسے پہچانا جائے؟ پھر دونوں
کشتیوں کی بناوٹ، سائز اور بھاری پن میں کیا فرق ہے؟ اس لیے کہ مزاجاً فنکار کی تخلیقی
قوت ایک کشتی پر زیادہ صرف ہو سکتی ہے اور دوسری پر کم۔ آج کے دور کے ماتھے پر اسپیشلائزیشن
کا لیبل چسپاں ہے۔ لہٰذا یکساں طور پر کیا دو مختلف صنفوں پر دسترس اور عبور حاصل کیا
جا سکتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی فنکار اس طرح کا دعویٰ کرتا ہے تو ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ اس کا
دعویٰ کس حد تک درست ہے۔ اس کا فطری جھکاؤ کدھر ہے اور کس صنف میں اس نے
زیادہ گہرائی، پھیلاؤ اور جدت پیدا کی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ فنکار کے ذہن کے
بٹ جانے کی وجہ سے دونوں کے ساتھ پورا پورا انصاف نہ کر پا رہا ہو۔ کیا شاعری اور
افسانہ ایک ہو سکتے ہیں یا ایک دوسرے پر کسی نہ کسی جگہ منطبق ہو سکتے ہیں؟ اگر ہو سکتے
ہیں تو وہ حصے اور عوامل کون کون سے ہیں؟ کیا افسانہ نگار شاعر انہیں اشیا، کیفیات یا
عوامل کا اظہار کرتے ہیں جو دونوں کی قائم مقامی کا سبب بنتے ہیں؟ یا ان سے دور جا کر اور
مختلف حصوں میں پھیل کر دونوں کا فرق اور امتیاز قائم کرتے ہیں؟ یہ سارے سوالات

اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہم کسی ایسے فنکار کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کی جگہ متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو بیک وقت افسانہ نگار اور شاعر دونوں ہے۔ اس لیے کہ ہم مطمئن نہیں ہوتے کہ کسی شاعر کا افسانہ افسانے کی ان جہتوں کو آشکار کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے جو افسانے سے مخصوص ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شاعر افسانہ نگار کو افسانے کے قاری کا سامنا ہوتا ہے اور اس کے اعتماد کا سوال درپیش ہوتا ہے۔

سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کیا افسانے کا قاری اور شاعری کا قاری ایک ہی ہے، یا دونوں میں کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے۔ ایک فرق تو یہی دیکھا جا سکتا ہے کہ کچھ قارئین طوالت سے اُلجھتے ہیں اور انھیں گھبراہٹ ہوتی ہے مگر ان میں گہری گرفت کی صلاحیت ہوتی ہے ایسے قارئین کو افسانے کے مقابلے میں شاعری سے زیادہ رغبت ہوگی۔ ظاہر ہے ان کے لیے افسانہ اپنی طوالت کی بنا پر پسندیدگی کا حامل نہیں ہوتا۔ قاری کے سلسلے میں یہی سوال اُٹھتا ہے کہ اس کی ذہنی بناوٹ کس قسم کی ہے۔ اس کا ذہنی مزاج خصوصی طور پر شاعرانہ آہنگ کا حامل ہو سکتا ہے۔ برخلاف اس کے ذہنی طور پر وہ ایک نثری مزاج کا نمائندہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے قاری کو شاعری کے مقابلے میں افسانے زیادہ پسند آئیں گے۔

افسانے اور نظم میں بالخصوص بیانیہ کا فرق ہوتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ بیانیہ کا عمل اور ردِ عمل نظم کے سلسلے میں نہیں ہوتا۔ اگر دیکھا جائے تو یہ حقیقت ہے کہ نظم کی اثر انگیزی بیانیہ کی ہی مرہونِ منت ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ یہاں بیانیہ کا حصہ شاعر کے توسط سے شامل نہیں ہوتا۔ وہ تو امکان بھر تفصیلات کے اخراج کی کوشش کرتا ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ بیانیہ قاری کے واسطے سے در آتا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ نظم پڑھنے کے بعد ہر قاری اپنے منفرد اور شخصی ردِ عمل یا اظہار کے ذریعے یعنی اپنے داخلی ادراک یا خارجی بیان کی شکل میں بیانیہ کا عنصر شامل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی نظم ہر قاری کو قدرے مختلف عنوان سے چونکاتی ہے اور متحرک کرتی ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ فنکار نظم کے ذریعہ قاری کو اس کی اپنی استعداد کے مطابق بیان اور اظہار کی دعوت دیتا ہے اور قاری نظم کو سر کرنے لگتا ہے۔ وہ اب اپنے مزاج کے مطابق چاہے تو نظم کو حقیقتوں سے فرار اور تخیلاتی اُڑان کا ہوائی آلہ بنالے یا حقیقتوں کی زمین پر چلنے کا راستہ۔ برخلاف اس کے افسانے میں فنکار اپنے طور پر بیانیہ شامل کر کے قاری کو کافی حد تک پابند کر دیتا ہے۔

پیچیدہ ہوتی صورتِ حال جو افسانہ نگار کے اپنے بیانیہ کے ذریعہ ہوتی ہے قاری کو منفرد مخصوص
اور منفرد کیفیتوں سے گزارتی ہے اور متعین سمتوں میں چلنے کی رہبری کرتی ہے۔ بیانیہ کا منبع
افسانہ نگار کی طرف سے شامل ہو کر قاری کو حقیقت کی زمین پر ہی رکھتا ہے۔ چنانچہ بیانیہ
قاری کو (CONDITIONED) کر دیتا ہے کہ وہ بس اسی حد تک آزاد ہے جس حد
تک خود فنکار آزاد ہے۔ اس طور پر افسانے کا بیانیہ فنکار کے ہاتھوں میں قاری کو اپنے
مخصوص ذہنی سفر اور متعین راستوں پر لے جانے کا ضروری سامان بن جاتا ہے۔ چنانچہ
اسے فنکار کی انفرادیت کی دشواریوں اور اندیشوں وغیرہ کا عرفان فراہم ہوتا ہے اور
بھرپور طریقے سے شمولیت کا موقع ملتا ہے۔ ایک بھرپور افسانے کے قاری کو اس کے سوا کیا
چاہیے کہ اس کی فنکار کے تجربوں میں شمولیت کے لیے افسانے میں مناسب محتاط اور
ضروری حد تک بیانیہ کا امتزاج ہوا ہو۔

آج بھی کئی نقاد روایتی پلاٹ والی کہانیوں اور جدید افسانوں کے فرق کو بیانیہ کے
اخراج سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر وہ پلاٹ اور قصہ پن سے بیانیہ کی مراد لیتے ہیں یا کسی چیز کو
بیان کرنے یا کہنے سے تو یہ بات کافی حد تک درست ہو سکتی ہے۔ حالانکہ پھر بھی
جدید افسانہ اگر تجرباتی نوعیت سے ان میں سے کسی چیز کو استعمال کرتا ہے تو جدید ہی
ہوتا ہے قدیم نہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں جدید افسانہ قدیم کے مقابلہ میں عصری
حسیت کی ان ارتقائی کیفیات کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے جو اس دور
کا خاصہ ہیں اور جو پہلے وجود میں نہیں آئی تھیں۔ اس طرح مختلف پیچیدہ اور انتہائی
صورتِ حال کو بیانیہ کے ذریعہ سمونے میں قدیم یک سطحی پن سے کام نہیں چلتا۔ بیانیہ کے
انتشار، موڑ اور شکست وریخت کے توسط سے ہی یہ بات ممکن ہے۔ بیانیہ کی
بافت میں بھی فرق آنا لازمی ہے۔ جملوں کی تشکیل اور الفاظ کی تراکیب میں بھی تبدیلی
ہونا ایک فطری عمل ہے۔ جس کی وجہ سے جا بجا GAPS کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔
یہ GAPS بیانیہ کے نہیں ہوتے بلکہ آج کی صورتِ حال کے ہوتے ہیں۔ یہ ضروری ہے
کہ نیا افسانہ نگار اپنے بیانیہ کو بدل دے کر اپنی ٹکنیک کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لہٰذا قدیم
اور روایتی افسانوں اور آج کے افسانوں کے درمیان جہاں اور جدیدیات میں ٹکنیک کا
فرق واضح ہو گیا ہے وہیں بیانیہ میں بھی اس کی کارفرمائی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ ان

منفرد تجربہ کا استعارہ خلق ہوتا ہے ۔ یہ افسانہ آخر کار تفصیل کے اخراج کے باعث اپنی مختصر ترین صورتِ حال میں غالب کے اس شعر کے بالکل قریب پہنچ جاتا ہے :

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا جو میری شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

ظاہر ہے افسانہ بیانیہ کے بغیر افسانہ نہیں رہ جاتا بلکہ نظم کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے ۔ بیانیہ سے مکمل رہائی کی کوشش افسانہ کی صنف کے لیے سمِ قاتل ہے ۔ بیانیہ کا ہونا ضروری ہے چاہے وہ تکنیک کے مختلف تجربوں کی شکل میں ہو ۔

بہرکیف یہ شاعرانہ آہنگ بہت گہرائی میں اُترنے کے بعد حاصل ہوتا ہے جس کے ذریعہ شعر اور افسانے کی مماثلت دریافت کی جا سکتی ہے ۔ اُوپر کی دونوں مثالیں اس بات کا ثبوت ہیں لیکن اس طرح کی مماثلت سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُوپر کے افسانے غیر ضروری ہیں ۔ اس لیے کہ ان کے بجائے شاعری موجود ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ ہم افسانے کو بنیادی طور پر صرف ان گہرے محسوسات کے طور پر ہی نہیں پسند کرتے بلکہ اس لیے بھی پسند کرتے ہیں کہ ان محسوسات کو کس عنوان سے برتا گیا ہے ۔ اور انہیں سامنے لانے میں کس طریقِ کار کو اپنایا گیا ہے ۔ لہٰذا بنیادی تخلیقی عمل ایک طرف ہے اور اسے ڈھالنے کے تانے بانے دوسری طرف ۔ ظاہر ہے کہ تخلیقی مواد تکنیک ٹریٹمنٹ اور پراسس سے جب گزرتا ہے تو اپنی شکل مخصوص فنکار کے توسط سے یا تو شاعری میں ڈھالتا ہے یا افسانے میں ۔ چنانچہ ظاہری طور پر یا ہئیتی طور پر کسی فنکار کے افسانوں اور نظموں میں زیادہ فرق نہیں تو اسے صرف ایک ہی صنف کا فنکار سمجھنا مناسب ہوگا ۔ البتہ اگر مماثلت مبہم طور پر ہے اور ہئیتی طور پر نہیں تو اسے دونوں صنفوں پر دسترس رکھنے کا پورا جواز ہے ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر افسانہ نگار کے دو ایک افسانے اور دو ایک نظم ایک دوسرے پر اپنی چھاپ چھوڑتے ہوں مگر مجموعی اعتبار سے اس فنکار کی شاعرانہ تخلیقیں اور افسانوی تخلیقیں مختلف ہوں ۔ ایسی صورت میں ہمیں اس مماثلت کو اتفاقیہ تصور کرنا ہوگا ۔

ہندوستان میں چار ایسے افسانہ نگار فی الحال چُنے جا سکتے ہیں جنہوں

نے شاعری اور افسانہ نگاری کو بیک وقت اپنایا ہے۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً کئی افسانہ نگاروں نے شاعری کی ہے، مثال کے طور پر اقبال متین، آمنہ ابوالحسن، اکرام باگ وغیرہ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ شاعری اپنے ذہنی تعطل کو توڑنے کے لیے کی ہے یا افسانوں کی تیاری میں ذہن کو جلا بخشنے کے طور پر۔ البتہ بلراج کومل، کمار پاشی، حمید سہروردی اور اختر یوسف اس صنف میں مسلسل کاوشیں کرتے رہے ہیں اور شاعری اور افسانہ نگاری میں برابر سے شناخت پیدا کرنے پر آمادہ رہے ہیں۔ ان چاروں افسانہ نگاروں میں ایک چیز اور قابلِ غور ہے کہ عام طور پر یہ نظم کے شاعر ہیں نظم پر ان کی گرفت اور غزل سے نسبتاً بے اعتنائی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انھیں اظہاری حیثیت سے غزل کا کینوس چھوٹا معلوم ہوتا ہے اور وہ نظم یا اس سے بڑے کینوس کے طالب ہیں۔ ظاہر ہے افسانہ اظہار کے اعتبار سے اور نظم کے بالمقابل ایک بڑے کینوس کا حامل ہے۔ اگر کینوس کے لحاظ سے دیکھا جائے تو پہلے غزل کا شعر اس کے بعد نظم یا نثری نظم اور آخر کار افسانہ آتا ہے یہ بات واضح ہے کہ افسانہ اس لیے بڑا ہے کہ اس میں بیانیہ شامل ہے۔

بیانیہ سے تو خیر عمومی طور پر نظم اور افسانے کے درمیان تفریق کی جاتی ہے مگر ایک ہی فنکار کے افسانے اور نظم کی مماثلت فرق اور امتیاز کے پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ان دونوں میں مماثلت کس عنوان سے ہے اور کیا دونوں اپنے اپنے طور پر ممتاز ہیں۔ یا ایک دوسرے کو منسوخ کر رہا ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے بلراج کومل کے دو افسانے 'کنواں' اور 'تصویر' کا تقابل ان کی چند نظموں سے کیا جا سکتا ہے۔ پہلی ہی نظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں مربوط اور مسلسل بیان کے حامل ہیں۔ دونوں میں اکھڑے پن غیر لطیف الفاظ اور احساسات سے گریز ہے۔ دونوں میں مرئی اور غیر مرئی قسم کی شدید مبہم اور موہوم کیفیات کو واضح اور شفاف امیجری عطا کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ بادی النظر میں وقت دونوں جگہ تسلسل کا حامل ہے۔

افسانہ 'کنواں' میں کنویں کے اندر جھانکنے کا عمل اور کنویں کے اوپر سے

پہچاننے کا ہیروڈ کمک عمل زندگی سے متعلق دو مختلف رویے ہیں۔ دونوں رویوں کو عمل میں
لانے والے دو مختلف کردار ہیں جو افسانے کے آخر میں قاری پر انکشاف کرتے ہیں کہ بنیادی
حیثیت سے یہ ایک ہی فرد کے دو روپ ہیں۔ اسی طرح سے افسانہ تصویر میں بھی زندگی کے
دونوں مختلف رویوں کا ٹریٹمنٹ ہے۔ یہاں بھی ذات کا ٹوٹنا ملتا ہے جو منطقی اور غیر منطقی
عوامل کے درمیان کارفرما ہے۔ منطقی عوامل خارج کی ترقی اور مقصد سے متعلق ہو جاتے ہیں
اور غیر منطقی عوامل دوسرے فرد کی تنزلی اور داخلی منفی کیفیات سے متعلق ہوتے ہیں۔ تھوڑے
سے غور و خوض سے قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ دونوں کردار ایک ہی فرد کے دو روپ ہیں۔
ذات کا ٹوٹنا نہ صرف ان دونوں افسانوں میں نظر آتا ہے بلکہ بلراج کومل کے دوسرے
افسانے مثلاً 'تیسرا کتا' اور 'کرچیں' میں بھی تخلیقی رَو کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ
غور ہے کہ ذات کا ٹوٹنا خارج کی مقصدیت سے ایک ردعمل یا ایک احتجاج کی صورت میں
رونما ہوا ہے۔ اب آئیے بلراج کومل کی نظموں کی طرف۔ ایک نظم 'نیم سرگوشی کا منظر ہے'۔
(اظہار ص۲۲) اس نظم میں بھی افسانہ 'کنواں' کی طرح دو کردار ہیں۔ ایک وہ شخص ہے جو
لفظوں کا رسیا ہے اور اس کی ساخت ایک دل نشیں تنظیم سے متعلق ہے۔ یہ تنظیم ترتیب
اور تصورات کی تنظیم ہے۔ تنظیم کی مناسبت سے اس کا کام مثبت انداز کا ہے اور مقصد
کی نمائش کرتا ہے۔ مثلاً گرتے ہوئے کو تھامنا۔ راہ پیما کو خرام ناز کا انداز سکھانا وغیرہ۔
اس کے عمل (رقصِ آہنی) میں ایک لطف و لذت شامل ہے جس میں مثبت قسم کا
جمال ابھر کر آتا ہے۔ (کنواں اور تصویر والے مثبت کردار سے مماثلت) دوسرا شخص وہ ہے جو
نیم سرگوشی کا حامل ہے۔ لفظ کے رسیا کا وہ دشمن بھی نہیں اور شاید ہمزاد بھی نہیں۔ (یہاں
لفظ شاید کا استعمال اس خیال کو شدت سے مہمیز دیتا ہے کہ دونوں شخصیتیں ایک ہی
شخص کے دو روپ ہیں) یہ شخص اجنبی ہے اس لیے کہ وہ لفظوں کے رسیا کی طرح سربازار
خارج کے انبوہ فراواں سے داد لینے کے جتن نہیں کرتا بلکہ داخلیت میں نیم سرگوشی اور
دہشت کا غیر منضبط اور غیر وابستہ منظر نقش کرتا ہے۔ یہ شخص خارج کی دل نشیں ترتیب
سے ماورا ہے۔ چونکہ لوگ خارج کی مناسبت سے ایک تنظیم بناتے ہیں اس لیے وہ اجنبی
انفرادیت اور داخلیت کی بے ترتیب اور وحشی مناظر سے ہراساں ہو جاتے ہیں اور اسے
برداشت نہیں کر پاتے۔ چنانچہ یہ دوسرا شخص افسانہ 'کنواں' کے کنویں پر بیٹھے ہوئے

کردار کے مماثل ہے یا افسانہ 'تصویر' کے اس کردار کے مماثل ہے جو ترقی کرنے والے کردار سے
اس کا کچا خریدتا ہے۔

نظم 'سپید پھول' (اظہار ۶۳) میں بھی تخلیقی رَو کا یہی سلسلہ نظر آتا ہے
جو نظم 'نیم سرگوشی کا منظر' یا افسانے 'کنواں'، 'تصویر' وغیرہ میں ہے۔ یہاں پر آنکھ
اور آفتاب فکری بصارت اور مشاہدے کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس طرح بلندی اور
روشنی سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے انھیں ہم اس کردار کی جگہ رکھ سکتے ہیں جو
خارج سے منسلک ہے اور دونوں افسانوں میں حصول مقصد اور تقدیر بنانے کی کوشش
کرتا ہے۔ برخلاف اس کے 'سپید پھول' آرزو کے آبشار سے گزر کر لڑھکتا تیرتا
جھٹکتا پتھروں کی رہ گزر پر اپنے ستم ظریف اور بے اماں مقدر کو کوستا ہوا چلا جا رہا
ہے۔ لہٰذا آنکھ اور پھول فرازِ کوہسار اور نشیبِ کوہسار کا فرق ظاہر کرتے ہوئے دو
مختلف کردار ہیں اور ایک ہی فرد کے دو روپ ہیں جیسا کہ نظم کے آخری حصے سے ظاہر
ہوتا ہے (مرے خدا مرا مری ہی منزلوں سے فاصلہ)

اس طرح کی استعاراتی اور تخلیقی رَو کی مماثلت کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ نظم اور
افسانے میں ٹکنیک اور پیراسس کا بہت بڑا فرق ہے۔ نظم میں جو کردار نظر آتے ہیں وہ
عطر کی طرح کشید کیے ہوئے ہیں۔ یعنی صرف خواص، محسوسات اور ردِ عمل زیادہ ابھرے
ہیں نہ کہ گوشت و پوست سے تجسیم کیے ہوئے افسانوں کے کردار جنھیں نام بھی دیا گیا ہے۔
نظم میں ماورائیت ہے۔ لطیف اور مبہم کیفیات کی باریک سی پر ایک گرفت ہے اور
ہیئتی طور پر سمٹے ہوئے الفاظ اور ان کی تراکیب ایک مخصوص آہنگ کے ساتھ گردش
کر رہی ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ نظم میں آفاقیت کی کارفرمائی زیادہ ہے۔ برخلاف
اس کے افسانہ 'کنواں' اور 'تصویر' ارضیت کے عکاس ہیں۔ دونوں میں جو استعارے
استعمال ہوئے ہیں ایک ہونے کے باوجود ان کے پھیلاؤ میں فرق ہے۔ یعنی نظم کا استعارہ
زیادہ سمٹا ہوا گہرا یا ارفع ہے جبکہ افسانہ کا استعارہ اپنے پھیل جانے کے باعث
اور افسانے کے چوکھٹے میں فٹ ہو جانے کے باعث DOWN TO EARTH
ہو گیا ہے۔ ایک چیز کا اور اندازہ ہوتا ہے کہ نظم میں بیانیہ کی کمی اور سمٹاؤ کی شدت کی
وجہ سے اس میں جذب کرنے کی طاقت بہت بڑھ گئی ہے اور وہ ایک قسم گونا گوں

کیفیات کو اپنے میں ضم کرنے کے قابل ہے۔ مثلاً پانی کی سیاہی پھول کی سپیدی، آرزو کا
آبشار، فغاں کے مرحلے، بریدگیٔ زخم، سیلِ خوں، صدائے خوں، قرب ولمس، خوابِ مرگ،
صدائے دل، اتفاق، حادثہ، نظر، آنکھ، آفتاب، جلاوطنی، اُداس سلطنت، ستم ظریفیٔ
مقدر، فراز ونشیب وغیرہ وغیرہ۔ یہ مختلف قسم کے انتہائی مجرّد PATTERNS ہیں۔
کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نظم میں الفاظ کا استعمال ایک ایسی ہیئت بناتا ہے جو غیر معمولی
طور پر مجرد ہونے کے باوصف ابہام رفعت اور لطافت کی حامل ہوتی ہے۔ برخلاف اس
کے افسانے میں اس انتہا کو پہنچنا ناممکن نظر آتا ہے۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ افسانے میں
اتنا CENTRIPETAL کھنچاؤ نہیں ہوتا کہ ہر طرح کی کیفیات کو جذب کرنے کا مجاز ہو۔
ظاہر ہے افسانہ چند تہوں کو دور تک پھیلانے کا کام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نظم کی
انتہائی ارفع سطح کو نہیں چھو پاتا۔ البتہ افسانے کی خوبی یہ ضرور ہے کہ وہ جن کیفیات کو اپنے
دامن میں لے کر چلتا ہے نظم کے مقابلے میں انھیں زیادہ بھرپور طریقے سے اور وضاحت
سے پیش کر دیتا ہے۔ نظم میں جو کیفیات ہلکے پھلکے انداز میں اُبھرتی ہیں وہ اگر افسانے کی
گرفت میں آکر ڈھلیں تو زیادہ گہرے اثرات چھوڑتی ہیں۔ اور ان کے ذہنی استعارے
زیادہ محسوس شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک بات بلراج کومل کے یہاں نظر آتی ہے یعنی
وہ مربوط مرتب اور لطیف الفاظ کا استعمال بے دریغ کرتے ہیں اور ان کے یہاں
فارسی الاصل الفاظ کی بہتات ہے۔ یہ چیز ان کی نظم اور افسانے میں مشترک ہے۔
نظموں میں فکری منطق (مثبت اور منفی دونوں ہی طرح کی) اور تضیاتی بیان کا استعمال
نہیں ہوا ہے جبکہ افسانوں میں یہ صفت حاوی نظر آتی ہے۔ افسانوں میں خارجی کیفیات
اور مناظر PHOTO GRAPHIC انداز میں اور حقیقی نظر آتے ہیں جبکہ نظموں میں
یہ کیفیت نہیں ہے۔ افسانوں میں واقعیت زیادہ بھرپور ہے اور نظموں میں صرف اشارے
ہیں۔ افسانوں میں افسانہ پن یا قصہ پن اور اس کے تانے بانے صاف دیکھے جا سکتے
ہیں نظموں میں اس کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ افسانوں میں شعوری کاوش کا عمل دخل
کافی حد تک ہے جبکہ نظموں میں لاشعوری کیفیات زیادہ اُبھری ہیں۔ ایک اور چیز
جو افسانوں میں نہایت خوبصورتی سے در آئی ہے وہ پراسرار کی سمتیں ہیں۔ مثلاً
افسانہ 'کنواں' میں کنویں کے اندر جھانکنے کا عمل اور کنویں پر سے پھاند جانے کا عمل

(جن سے زندگی کے دو مختلف رویے ظاہر ہوتے ہیں) سمتوں کے لحاظ سے زاویہ قائمہ بناتے ہیں یا ایک دوسرے پر PERPENDICULAR ہیں اور افسانہ تصویر میں دو مختلف کرداروں کا الٹی سمتوں میں چلنا سمتوں کا زاویہ مستقیم بناتا ہے۔ یہ کیفیت نظموں میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس طرح سمتوں کو اجاگر کرنے کے لیے بیانیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلراج کومل کے افسانوں اور نظموں کا ایک واضح فرق یہی ہے کہ ان کے افسانے زندگی کے واقعاتی بیان سے تشکیل پاتے ہیں۔ مثلاً زندگی میں ہونے والے کسی ایک واقعہ یا حادثہ کی استعاراتی تصویرکشی۔ جبکہ ان کی نظموں میں زندگی کے واقعات کسی طور PROJECT نہیں ہوتے بلکہ محسوسات کی لمحاتی کیفیتوں کو ارفع ترین اشکال میں پہچاننے کی سعی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظمیں جو شعور ملے میں شایع ہوئی ہیں انھیں دیکھا جا سکتا ہے۔ "چار نظمیں" کے عنوان سے شایع ہونے والی دراصل یہ ایک ہی نظم معلوم ہوتی ہے اس نظم کا میں، اپنی سرشت میں داخلیت کا وہ کردار ہے جو افسانہ "کنواں" میں کنواں جھانکنے کے عمل میں مبتلا ہے یا افسانہ "تصویر" میں کباڑ خرید رہا ہے یا نظم "سپید پھول" کا پھول ہے یا نظم "نیم سرگوشی کا منظر" کا وہ کردار ہے جو نیم سرگوشی کا حامل ہے، مگر اس نظم نے ایک بل کھایا ہے۔ یہ بل ہے اس کردار میں جو باتیں کرتا ہے اور جو خارج کا شخص ہے۔ اس دوسرے شخص کو شاعر نے TWIST دے دیا ہے یعنی یہ کہ اسے تانیث کر دیا ہے۔ یہاں مشکل یہ آپڑی کہ کیسے پہچانیں کہ یہ ایک ہی شخص کے دو روپ ہیں۔ ظاہر ہے جنس کے تضاد کے باوجود ایک والہانہ اپنائیت اور یگانگت جو صدیوں کے عرصہ پر پھیلی ہوئی نظر آتی ہے ایک جان دو قالب کے واسطے سے ایک ہی شخص کے دو روپ ظاہر کرتی ہے۔ خاص چیز جو غور طلب ہے دونوں شخصیتوں کے مابین فاصلہ ہے۔ سارا کرب اسی حدِ فاصل کے اندر جذب ہو گیا ہے۔ داخلیت کا میں جب داخلیت کے پانیوں میں اترتا ہے تو:

سعی روز و شب کے باوجود
تمھیں دل و جان سے نوچ کر الگ نہیں کر سکا
دریدہ بادبانوں کے ہمراہ بہتا ہوا
اجنبی سمندروں میں

تمھیں پکارتا تمھیں تلاش کرتا رہا
لیکن شاید مجھے غرقِ آب ہونا تھا
ایک افسردہ شب گراں کا ہمسفر
میں آخر کار
پابستہ
اپنے زیرِ آب مقدر سے جا ملا

یہاں یونگ کے ANIMA کی نشان دہی ہوتی ہے۔ ANIMA ہر مرد کے داخل میں آرکی ٹائپ کی حیثیت سے ایک عورت کا عکس ہے۔ نظم میں کتنے لطیف طریقے سے اور کتنے ارفع طور پر ذات کے اس ٹکراؤ کا جو عورت اور مرد کے درمیان ہوتا ہے نقشہ ابھر آیا ہے جس میں ایک ماورائی کیفیت ہے۔ برخلاف اس کے افسانوں میں جگہ جگہ بیوی بچوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ مگر افسانہ اتنی لطیف گرفت کا حامل نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ افسانہ میں مقصدیت اور غیر مقصدیت کے درمیان ٹکراؤ نظر آتا ہے اور بیوی بچے مقصدیت کے PATTERN میں فٹ بیٹھتے ہیں۔

بلراج کومل (اور کمار پاشی) کے افسانوں میں نظم کا آہنگ یا براہ راست نظم کے ٹکڑے نظر نہیں آتے۔ ان کے افسانوں میں جملوں کا REPITITION تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ملتا ہے۔ مگر یہ کیفیت ایسے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی ہوتی ہے جنھوں نے شاعری نہیں کی ہے۔ مثلاً انور سجاد یا بلراج مین را۔ لہٰذا جملوں کے دہرانے کا عمل ایک افسانوی اور شعوری کوشش ہے شعری نہیں۔ بلراج کومل کے افسانے انسانی نفسیات کا گہرا تاثر پیش کرتے ہیں۔ افسانوں میں بیان کا تسلسل وقت کے تسلسل کے ساتھ ضم ہو جاتا ہے اور ایک آہنگ سا بنا دیتا ہے۔ یہ آہنگ شعری نہیں بلکہ افسانوی یا نثری آہنگ ہے۔ ایک خوبصورت ادغام ہے۔ الفاظ پر قابو اور بیانیہ پر اعتماد ان کے افسانوں کو ایک ماورائی کیفیت سے مملو کر دیتا ہے۔ چنانچہ بنیادی تخلیقی مماثلت کے باوجود بلراج کومل کا افسانہ کچھ اور چیز ہے اور نظم کچھ اور۔

اب آئیے کمار پاشی کی جانب۔ بلراج کومل کے برخلاف کمار پاشی امکان بھر تفصیلات خلق کرکے (WELL TAILORED) اور چست افسانے

تخلیق کرتے ہیں۔ یہ افسانوں کے ٹریٹمنٹ کا فرق ہے۔ ایسا کرنے سے ان کے افسانے وضاحت کی سرزمین سے نکل کر فوراً ہی ابہام کی صدود میں داخل ہو جاتے ہیں حیرت کی بات یہ ہے کہ جتنا ابہام ان کے افسانوں میں ہے اتنا ہی ان کی نظموں میں ہے۔ ظاہر ہے یہ صورت حال افسانوں میں اس لیے در آئی ہے کہ انھوں نے بیانیہ کا وہ بھرپور امتزاج نہیں کیا ہے جیسا کہ بلراج کومل کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ دوسری بات جو قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ کمار پاشی کے یہاں فکر کی منطق کا امتزاج نہیں کے برابر ہے۔ وہ براہِ راست مشاہدے اور امیجری سے اپنے افسانوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ بلراج کومل اور کمار پاشی کے افسانوں کی ٹکنیک کا امتیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمار پاشی کے افسانے زیادہ گہری نظر رکھنے والے اور داخلی علائق میں گرفتار قاری کی گرفت کے لیے آسان ہوتے ہیں جبکہ بلراج کومل نسبتاً زیادہ وسیع حلقہ میں پھیل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کمار پاشی کے افسانوں میں ہئیت کے کچھ انوکھے تجربے ہیں۔ نئی نئی کیفیات کو امیجز میں بدلنے کی سعی زیادہ ہے۔ انھیں مربوط کرنے کی نئے عنوان سے کوشش ہے۔ یہ ساری کیفیات ان کی نظموں میں بھی کہیں نہ کہیں مل سکتی ہے مگر نظمیں سائز کے اعتبار سے نہ اتنی پھیلتی ہیں اور نہ اتنی گوناگوں ہئیتی تجربوں کی حامل ہیں جتنا کہ افسانے۔ نظم اور افسانے کی مماثلت کو ان کی تخلیقی رَو کی بنیاد پر ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس سے اُبھر کر دیکھنے پر کہیں ٹھوس استعاراتی یکسانیت مل جانا بس اتفاقی بات ہوگی۔ یہاں بھی بلراج کومل مختلف ہیں۔ لہٰذا کمار پاشی کی نظموں اور افسانوں میں ایک طرح سے بُعدالقطبین ہے۔ تخلیقی رو کے اعتبار سے مماثلت کے لیے ہم ان کی نظموں میں [مثلاً سلف پورٹریٹ، تیری مخلوق تجھ سے مخاطب ہے، گواہی کون دے گا، آزاد شہری ایک تعارف (شعور ۱) کاغذوں کی بستیوں میں، اور مبہم طور پر شریف زادوں کے لیے، والی سیریز (سطور) میں] دیکھتے ہیں کہ کمار پاشی کے یہاں (SELF) ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مرکز خود آگہی اور SELF CONCIOUSNESS کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ سلف کانشسنس ایک متحرک اور زندہ کیفیت ہے جو ایک طرف خود آگہی کی داخلی تہوں کو کھنگالنے کا زبردست تحرک فراہم کرتی ہے تو دوسری طرف اپنے اثرات کا

خارج میں عکس تلاش کرتی ہے۔ اس عکس میں مبہم طور پر سماجی اور سیاسی عمل اور اس کے ردِ عمل کا عنصر بھی نظر آتے ہیں۔ ان خارجی عوامل کے اثرات جب سلف کانشنس کی تہوں سے ٹکراتے ہیں اور چھن کر داخل میں سماتے ہیں تو تاریخ کے بحرِ بیکراں اور صدیوں کے پھیلاؤ کا ربط پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح تاریخ کی نیتی اور بگڑتی ہوئی صورتِ حال استعاراتی اشکال اختیار کر لیتی ہے۔ مگر ان سب کے پیچھے خود آگہی اور سلف کانشنس کی کارفرمائی ہے۔

سلف کانشنس جو شاعر کو داخلی اور خارجی مناظر کی شناخت کرنے، دریافت کرنے اور (منعکس) کرنے اور اس سے عمل اور ردِ عمل کا مظاہرہ کرنے پر اکساتا ہے اس کے افسانوں میں بھی تخلیقی رَو کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر کمار پاشی کے افسانے "سینتیس برس پرانا آدمی"، "دوسرا آدمی"، "تنگ اندھیرا زینہ"، "اس کی لاش" وغیرہ ہیں۔

"سینتیس برس پرانا آدمی" میں سلف کانشنس بڑی خوبی سے اُجاگر ہوا ہے۔ افسانہ کا دوسرا پیراگراف اس بات کا ثبوت ہے۔ اس افسانے میں داخل اور خارج کی جہتیں وضاحت سے سامنے آئی ہیں۔ یہ بات کمار پاشی کی اکثر و بیشتر نظموں میں ملتی ہے اور ظاہر ہے ایک عام حیثیت رکھتی ہے۔ ہاں البتہ یہ افسانہ کمار پاشی کی نظموں سے بہت مختلف ہے۔ مثلاً یہ کہ افسانے میں ہیئت کا انوکھا تجربہ ہے۔ وقت کے لحاظ سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ افسانہ زندگی کا ایک وقفہ ہے جو در اصل ایک دائروی تسلسل کا جزو ہے اور جسے آگے بڑھانے کے لیے قاری کی ذہنی کاوشوں اور احساسات پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چھتری والے آدمی کا حلیہ اسے خارج کی زندگی سے منسلک کر دیتا ہے جبکہ میں اور اس کا ساتھی میں داخلیت سے متعلق ہیں۔ افسانہ خارجی زندگی اور مجموعی طور پر اس کی بے معنویت سے شروع ہوتا ہے اور اختتام کی حدود میں پہنچ کر داخل کی گہرائیوں میں سما جاتا ہے۔ وقت کا دائرہ جیسے جیسے خارجی کیفیات کو سمیٹتا ہوا داخل میں سمٹتا ہے۔ اُلجھن، گھبراہٹ، اور موت جیسے منفی احساسات کو سموتا جاتا ہے۔ "میں" کی داخلی صورتِ حال کو خارج کے ردِ عمل کے ذریعہ پیش کرنے میں بڑی واضح اور صاف امیجری کا استعمال ہوا ہے[1]۔ ملاحظہ ہو

تمیو کینفاری صورتِ حال نظم 'سلف پورٹریٹ' میں جس میں ستارے کے ردِ عمل کے واسطے سے ایک منظوم انعکاس ہے) - افسانے میں دو طرح کی امیجری دیکھی جا سکتی ہے - ایک حسّیت اور سماعت کے باہم اتصال سے تشکیل پاتی ہے - مثلاً ——— کھٹ، کھٹ کھٹ، نل سے بوند بوند پانی ٹپکنا، یا ماتم کی صداؤں کا آہنگ - دوسری امیجری بصارت کی ہے - بصارت خصوصاً مکانی کیفیات سے مل کر اپنی امیجری بناتی ہے - مثلاً انگولر ANGULAR VISION سے کی لمبی سڑک کے دونوں سروں سے اور درمیان سے کی تشکیل ہوتی ہے - یہ متضاد فاصلوں اور ان کے درمیان سے بنتی ہوئی امیجری ہے جس کے ذریعہ ایک ایسے شخص کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے جو خارج سے دھیرے دھیرے کٹتا جا رہا ہو - اسے اپنا وجود اس طرح معلّق معلوم ہو رہا ہو جیسے کمرے کی دیواریں دور ہوتی جا رہی ہیں - چھت اوپر ہی اوپر اُڑتی جا رہی ہے اور زمین گویا لفٹ کی طرح منزل در منزل نیچے اُترنے لگی ہو - ایک ایسی لفٹ جس کا کوئی گراؤنڈ فلور نہ ہو -

اس افسانہ کی ہئیت میں اکثر سوالات کے سلسلے میں مدغم ہو گئے ہیں - رات کے سناٹے میں جب بیوی بچے سب سو رہے ہیں تو سوالات ایک میں اور دوسرے میں کی باہمی مطابقت کے ساتھ اس طرح قائم ہوتے ہیں کہ ایک بڑی خوبصورت ہئیت کا ٹکڑا سامنے آتا ہے - خاص توجہ کی بات یہ ہے کہ چھتری والا شخص میں سے ملنا چاہتا ہے اور اسے کہیں لے جانا چاہتا ہے - چھتری والے شخص کی آرزو پوری نہیں ہوتی اس لیے کہ میں ایک انجانے خوف کے باعث اس کا ساتھ حاصل نہیں کر پاتا - ایسا لگتا ہے کہ جس شخص کے ماتم کی آوازیں آ رہی ہیں وہ چھتری والا ہی شخص ہے - اس طرح کی کیفیت کمار پاشی کے اکثر افسانوں میں ملتی ہے جس میں دو افراد کو (یا ذات کے دو حصّوں کو) آپس میں مدغم ہونے کی بیتابی ہوتی ہے - مگر وہ کسی نہ کسی وجہ سے ملنے کی تمنا پوری نہیں کر پاتے اور نتیجہ میں کوئی انجانا اور موہوم سا کام تکمیل کو نہیں پہنچتا - متذکرہ بالا افسانوں میں اس مخصوص کیفیت کی عکاسی ملتی ہے جو بنیادی طور پر تخلیقی رو سے متعلق ہے -

جبکہ مندرجہ بالا افسانوں میں تخلیقی رو بنیادی طور پر پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے - دوسرے افسانوں میں صرف زیریں رو کی یا پس منظری حیثیت رکھتی

ہے۔ مثال کے طور پر کمار پاشی کے افسانے 'پہلے آسمان کا زوال، رات سے گھڑی تک، ٹوٹی ہوئی رات، زندگی کا سمندر، پنچھی، اس کا جنم، صد سطری حکم نامہ، ردِ عمل کی تلاش وغیرہ ہیں۔ ان افسانوں میں دوسری جہتوں تک ٹوٹ کر جانے کی اور تاریخی سماجی اور سیاسی طور پر خارج سے استعارے اور علامت سازی کی زبردست کوشش ملتی ہے۔ 'صد سطری حکم نامہ' اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں بنیادی طور پر تاریخ، کلچر اور مذہبی عناصر کی ماورائی کیفیات سے استعارہ سازی کی گئی ہے۔ نظم میں یہ کیفیات صرف ماورائی ہوتیں مگر افسانے میں انھیں ٹھوس شکل دینے کے لیے کرداروں سے کام لیا گیا ہے۔ اس افسانے میں نہ صرف یہ کہ تاریخ دائروی صورت میں دہراتی ہے بلکہ صدیوں بعد ایک بہتر نظام کی اُمید قائم رہتی ہے حالانکہ افسانے کے اختتام پر ایک سوالیہ نشان سا اس اُمید اور انتظار کے چہرے پر ثبت ہو جاتا ہے۔ اس افسانے کا تقابل کمار پاشی کی نظم 'تیری مخلوق تجھ سے مخاطب ہے'، سے کرنا مناسب ہوگا۔ تاکہ نظم اور افسانے کے بُعد' کا اندازہ ہو سکے۔ تخلیقی رَو کے طور پر نظم میں مَیں کے ٹوٹاؤ کی کیفیت ملتی ہے:

میرے اندر نفاست نہیں
گرد ہی گرد ہے
تم کبھی میری کھڑکی سے جھانکو
تو دیکھو مجھے

میں نہیں یہ
کوئی دوسرا ہے
مرا بھوت ہے

میرے اندر ہے ——— کہیں دندناتا ہوا
اپنے سوکھے سڑے گوشت کے
چیتھڑوں کو اُڑاتا ہوا

نظم کی گونج بھی ہے تو تاریخی عوامل، مذہب اور کلچر کی ماورائی کیفیت اور باہم اتصال کا نقش کھینچ دیتی ہے۔

وہ کہاں کھو گیا؟
آج اس کی لکھی سب کتابوں میں بھی
اس کی تصویر ملتی نہیں
لفظ ہیں : چڑیوں کی طرح
کھو کھلے
بے صدا

اے خدا
تیری مخلوق تجھ سے مخاطب ہے سُن
ان کے ہاتھوں میں
ان کے گناہوں کی فہرست دے
اور صدیوں سے پہلے کا لکھا ہوا
فیصلہ
آج ان کو سُنا
اے خدا ———

کوئی ہے ——— ؟
جو اندھیروں کے انبار میں
میرے کھوئے ہوئے نقش کو
ڈھونڈ کر دے سکے ——— ؟

نظم کے اس حصہ کا تقابل افسانے " صد سطری حکم نامہ " سے کرنے پر یہی احساس ہوتا ہے کہ افسانے میں یہ سارا کا سارا منظر نامے کی صورت میں ہے جبکہ نظم میں ایک ماورائی احساس ہے اور دعائیہ کلمات ہیں۔ حالانکہ دونوں میں امید و بیم، تاریخ ساز لمحوں کی، انتظار اور اس سے متعلق مایوسی پوری طرح سے موجود ہے۔ افسانے میں بیانیہ داخل ہو کر ساری کیفیات کو بھرپور وضاحت بخش دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

افسانے میں استعارہ شامل ہونے کے ساتھ ساتھ دُور تک پھیل سکتا ہے اور بڑھ سکتا ہے جبکہ نظم میں صرف ماورائی صورت حال کی نمائندگی کرتا ہے۔ ' صد سطری حکم نامہ ' اور اُس کا جنم، پس منظری طور پر نظم ' گندے دنوں کا قصہ ' سے شامل ہے جس میں تاریخی شعور اور ادراک ملتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نظم خود اس بات کی غمازی ہے کہ کمار پاشی نظری اور لاشعوری طور پر افسانوی کینوس کے متلاشی رہے ہیں۔ اس لیے کہ یہ نظم افسانے کی طرح سے طویل ہے اور تاریخی بیان کو بیانیہ کی صورت میں سامنے لاتی ہے۔ تاریخی کیفیات کو نظم کے آہنگ میں استعاراتی سُبک خرامی کے ساتھ داخل کر دیا گیا ہے۔ یہی اس نظم کی خوبی بھی ہے۔

کمار پاشی جیسے داخلیت کے حامل فنکار کے قلم سے ' ردِ عمل کی تلاش ' جیسا افسانہ وجود میں آئے تو بڑا عجیب تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ افسانہ داخلیت سے دور ہٹ کر اپنا سارا تانا بانا خارج کی سطح پر بنتا ہے۔ شاید یہ افسانے کی بدلتی ہوئی صورتِ حال ہے۔ شاید فنکار نے داخلیت کو جی بھر کر کھنگال ڈالا ہے اور اب وہ سطحِ آب پر نظر آتا ہے۔ یہ افسانہ وضاحت اور شفافیت کا افسانہ ہے۔ اس میں بیانیہ کا استغراق نسبتاً زیادہ ہے اور بیانیہ کی ٹکنیک کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے افسانے کی یہ صورت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ افسانے کا واسطہ نظم سے دُور دُور کا نہیں۔ ساتھ یہ افسانہ پر کمار پاشی کی دسترس کا بیّن ثبوت ہے۔ اس افسانے میں قصہ پن موجود ہے۔ ہیئت میں بھی تجربہ ملتا ہے جو بصری نوعیت کا ہے یعنی ' عمل ' اور ' ردِ عمل ' اور پھر ' عمل ' کو مکالماتی طور پر قوسین کے ذریعہ الگ کر دیا گیا ہے اور اسے عنوان دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اگر یہ افسانہ سُنایا جا رہا ہے تو سُنانے والے کو اپنے طور پر سمجھانے میں دقت پیش آئے گی اور وہ لامحالہ افسانے کے اس حصہ کو دکھلا دینا زیادہ پسند کرے گا۔ چنانچہ اس بات کو تقویت پہونچتی ہے کہ افسانہ کو اپنے آپ پڑھنا اور سمجھنا زیادہ معنی خیز ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں افسانے کی ہیئت مکالماتی ہے۔ سیاسی ایکٹ پس منظری حیثیت رکھتے ہیں اور قاری کے ذہن میں تشکیل پاتی ہے۔ افسانہ صرف اشارے کرتا ہے اور الف کو سیاسی صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانے والے نمائندے کی

حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ احتجاج کی صورت افسانے میں نہیں تھی۔ بلکہ ایک زیادہ پھیلا ہوا اور تہہ در تہہ محسوس کیا جانے والا عمل اور ردِ عمل نظر آتا ہے اس کے مثبت اور منفی پہلو دیکھے جا سکتے ہیں۔ بہرحال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ افسانہ بیانیہ، مکالمہ، پلاٹ، کردار، ہیئتی تشکیل جیسے اجزا کی بنا پر نظم سے قطعی مختلف ہے۔ کماریاشی کے افسانوں میں ایک بات ممتاز حیثیت سے دیکھی جا سکتی ہے وہ یہ کہ ان میں سسپنس کی ٹکنیک کا بڑا خوبصورت استعمال ہے۔

حمید سہروردی اور اختر یوسف نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو براج کومل اور کماریاشی کے بعد سامنے آئی ہے۔ حالانکہ ساحل احمد نے ان کی ایک نظم ۷۷ ۱۹ء کے انتخاب میں شامل کر لی ہے تاہم ابھی مجھے حمید سہروردی کو شاعر کی حیثیت سے قبول کرنے میں تامل ہے۔ ان کی نظموں کے سلسلے میں بہرحال چند باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو اکثر نظموں میں الفاظ اور مصرعوں کی مہمل یا ایبسرڈ تراکیب کے ساتھ کہیں کہیں معنویت کی جھلک۔ دوسرے عموماً ایک ہی نظم میں نثر کے آہنگ اور نظم کے آہنگ کا ادغام۔ تیسرے ان کی اکثر نظمیں ہیئت کے اعتبار سے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں مثلاً ۷۴ ۱۹ء کی آخری دم توڑتی ہوئی رات کی تخلیق ہے (غبارِ خاطر ص ۳۸) جس کی ہیئت کا ایک حصہ اس طرح ہے

ہوائیں ہوائیں ہوائیں

یوں

یوں یوں

بدلتی بدلتی بدلتی

ہیں ہیں ہیں

ہوائیں یوں بدلتی ہیں

ہوائیں کیوں بدلتی ہیں

یہ ہیئتی تجربہ ہے جو حمید سہروردی کی اکثر نظموں اور بیشتر افسانوں میں مشترک ہے۔ اس نظم کا تقابل ان کے ایک افسانے 'کشتیاں' سے کیا جائے تو ہیئتی تجربہ کی انفرادیت دیکھی جا سکتی ہے۔

مگرمچھ

مگرمچھ اپنے نزدیک طے کر چکے ہیں کہ انہیں
صرف یہیں، اسی کشتی میں جانا ہے /
کیونکہ مگرمچھ کبھی محسوس نہیں کرتے کہ
ان کی بھوک ختم ہو چکی ہے /
انھیں ڈر ہے کہ مچھلیاں ان کا حق نہ
چھین لیں /
(خوف)

مچھلیاں

مچھلیاں سمندر میں رہنا پسند کرتی ہیں /
انھیں ہر دو کشتیوں میں کوئی دلچسپی نہیں /
کیوں کہ بھوک کو صرف ضرورت کی حد تک
اہمیت دیتی ہیں / انھیں اپنے حق پر
اطمینان تھا . . .
(سے!)

حق کی بات تو علیحدہ ہے

اس افسانے میں بھی ۱۹۸۴ء کی مندرجہ بالا نظم والی صورتِ حال ہے۔ یہاں ہم ان کے افسانے 'رات' کے آخری حصہ سے مماثلت پاتے ہیں۔ اسی طرح سے ان کا افسانہ 'ندی اور وہ' اور 'دشت ہو کی صدائیں' میں نثری نظم کے ٹکڑے افسانوں سے جا نکلتے نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے حمید سہروردی نے ہیئت کے تجربوں میں بڑی سُرعت سے کام لیا ہے اور افسانے کو نظم کے ساتھ مدغم کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

حمید سہروردی نے اینٹی اسٹوری اور پلاٹ لیس افسانے تخلیق کیے ہیں اور ظاہر ہے ایسی صورت میں ان کے یہاں شعر و نثر کے ادغام کے علاوہ اور دوسری باتیں بھی مل جاتی ہیں۔ مثلاً فلسفیانہ فکر اور حسیاتی اور محسوساتی کیفیات کا باہم اتصال۔ جس کی اچھی مثال ان کے افسانے 'سمندر'، 'سفید کوا'، 'بے چہرگی'، 'نہیں کا سلسلہ ہاں سے'، وغیرہ ہیں۔ 'دل شکن'، ایک ایسا افسانہ ہے جس میں خارجی طور پر گفتگو کا سلسلہ ہے اور اس کے ساتھ قوسین میں بھٹکتے ہوئے خیالات کو مقید کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ خیالات مربوط ہیں مگر منفرد تفرد سے خود کو آشنا کرتے ہیں۔ ساخت کے اعتبار

سے بھٹکے ہوئے خیالات دو افراد کے درمیان مکالمے کے ساتھ پیوست ہیں اور اس طرح عصری حسّیت کی غمازی کرتے ہیں۔ اس افسانے میں پرانے اقوال، مقولوں اور محاوروں کے ساتھ نئے ذہن کا ٹکراؤ پیش کیا گیا ہے۔ مکالماتی لحاظ سے حمید سہروردی کا ایک افسانہ "مکالموں کے درمیان" توجہ چاہتا ہے۔ اس میں بھی کہانی پن سے گریز ہے اور افسانوی ساخت کا تجربہ ملتا ہے۔ حمید سہروردی کے یہاں افسانوی میڈیم بنانے کا عمل دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً افسانے "سفید کوّا" میں شگون اور بدشگونی کا میڈیم ہے۔ افسانے "نہیں" کا سلسلہ یہاں سے میں نحوست کا میڈیم ملتا ہے۔ مثلاً انگیٹھی کا ٹوٹ جانا، ۱۳ کا ہندسہ، بہو کا نحوست آمیز خواب دیکھنا، چاند کا بے نور ہوجانا، آتش فشاں کا پھٹنا اور تباہ کاری، الّو کا کھڑکی پر آبیٹھنا وغیرہ وغیرہ۔ حمید سہروردی کے افسانوں میں ORIGINALITY کی جھلک ہے۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں مگر اپنی تخلیقی تیز گامی کی وجہ سے افسانوں میں اتنی شدید قوت نہیں لا پاتے جس کا تقاضا ان کے افسانے کرتے ہیں۔ میں نے اپنے مضمون "نئی افسانوی تقلیب" میں حمید سہروردی کے افسانوں کے داخلی کوائف پر لکھا ہے۔ علاوہ ازیں اکثر وہ زبان کے سلسلے میں بھی محتاط نظر نہیں آتے۔

اختر یوسف کے افسانے کلی طور پر کم مگر جملوں کی تشکیل میں زیادہ استعاراتی عمل رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پلاٹ ہوتا ہے مگر یہ پلاٹ سیدھا سادا ہلکا پھلکا اور روز مرہ کی زندگی کا اکثر معمولی سا واقعہ ہوتا ہے۔ اسے پیش کرنے میں استعاراتی جملوں کا استعمال، ایک معیاری بھرم اور تجملک کیفیت سے مملو کردیتا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ان کے افسانے اپنے خارجی استعاراتی نظام میں ان کی نظموں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے یہاں استعاروں کا جستہ جستہ استعمال ہے نہ کہ کلی طور پر ایک استعارے کی بنیادی صورتِ حال۔ مثال کے طور پر افسانہ "خالی ہاتھیں" کا یہ جملہ ہے "ان گنت بدرُوحیں اور لہولہان دانتوں والی چڑیلیں اس کے آگے اور بہت آگے تک اپنے قہقہوں سے گندے اور مکروہ خون کے چھینٹے اڑاتی

تھیں ——— اس کی مماثلت نظم 'جہاں ریت ہی ریت ہے' سے کیجیے ——— 'چڑیلوں کی ہونٹوں کی مسکان ہونٹوں پہ اپنے لگائے خباثت کی جادوئی آنکھوں کو ہر زاویے سے ذلالت کے اسباق کا گیان دیتے' ——— یا نظم 'آنکھ تھی رات تھی' کے الفاظ ——— 'ڈائنیں رقص میں قہقہے پھونکتی ہیں' سے بہت زیادہ مماثل ہیں۔ اسی طرح افسانہ 'راکھ رنگ سفر' کے جملے ——— مرگھٹ کی راکھ اور راکھ چاروں طرف اُڑ رہی تھی ——— سب کچھ راکھ ہو رہا تھا ——— بات مگر حیرت کی یہ بھی تھی کہ کہیں کوئی چنگاری نہیں تھی ——— کی مماثلت نظم 'کہروں کا عذاب' کی ان سطروں سے ——— 'قبرستانوں اور مرگھٹ کا اب دور دُور تک نشان نہیں ہے ——— کس کو فرصت بنا لگائے انگارہ پھینکے' ——— غور طلب ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نظم کی تقریباً ساری کی ساری استعاراتی لفظیات جوں کی توں مجموعی طور پر افسانوں میں موجود ہے اور دونوں میں بیانیہ کے فرق کے ساتھ اور شعری آہنگ سے قطع نظر ایک ہی اسلوب کارفرما ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں میں تو یہی کہوں گا کہ نظموں کی کوئی ضرورت نہ تھی جبکہ افسانے ساری سچویشن کو بعینہٖ اسی طرح سامنے لاتے ہیں۔ علاوہ ازیں افسانوں میں بھی وہی ماورائی کیفیات موجود ہیں جو نظم کی سطح پر ہیں۔ اس پر افسانے کی مزید خصوصیتیں مثلاً بیانیہ پلاٹ کردار وغیرہ استعاراتی حجم مظہر کو زیادہ واضح اشکال دے رہے ہیں۔

افسانوں کی حیثیت سے اختر یوسف اپنا ایک منفرد آہنگ رکھتے ہیں۔ داخلیت کے اظہار میں بھی گہرائی ہے۔ افسانوں میں مثبت اور منفی امیج نظر آتے ہیں جیسے آسمان اور سمندر، اندھیرا اور اُجالا، راکشس اور دیوتا وغیرہ۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک مسابقت (COMPETITION) کے طور پر مثبت اور منفی امیجز ایک دوسرے پر حاوی ہونے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے سمندر کی لہروں کا ایک دوسرے پر چڑھ جانا۔ پائل کی آوازوں یا دوسری آوازوں کا ایک دوسرے پر حاوی ہو جانا یا گھڑی کی بڑی اور چھوٹی سوئیوں کی ایک دوسرے پر پیش قدمی کی کوشش وغیرہ۔ افسانوں میں مکانوں کا استعمال سپاٹ پن اور یکسانیت کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ زیادہ تر افسانے فرد کی تنہائی کی عکاسی کرتے ہیں۔

اختر یوسف کے افسانوں کی زبان خوبصورت ہے اور انھیں اپنے اظہار پر کسی حد تک گرفت حاصل ہے۔

ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ چاروں افسانہ نگاروں میں ایک بات مشترک ہے یعنی یہ کہ ان کی شاعری اور افسانہ نگاری کسی نہ کسی طور پر ایسے مرکز پر کھنچتی ہے جہاں سے مماثلت قائم کرنا آسان ہوتا ہے۔ مثلاً بلراج کومل کے یہاں کلی طور پر یا جزوی طور پر استعاروں کی مماثلت عموماً سارے افسانوں اور ساری نظموں میں ملتی ہے۔ کمار پاشی کے یہاں فضا کی مماثلت کچھ افسانوں اور کچھ نظموں میں دیکھی جا سکتی ہے اور کہیں کہیں جزوی طور پر نظموں اور افسانوں میں استعاراتی مماثلت بھی ہے۔ حمید سہروردی کے یہاں اکثر افسانوی ساخت یا فارم یا ہئیت کی مماثلت ملتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے حمید سہروردی کا یہی تخلیقی میلان ہو۔ اختر یوسف لفظیاتی استعارہ سازی کے جملوں کے ذریعہ اپنے افسانوں، اور نظموں میں مماثلت پیدا کر دیتے ہیں۔

ظاہر ہے ایک ہی فنکار کی شاعری اور افسانہ نگاری میں کسی طرح کی مماثلت لطف کو کم کر دیتی ہے۔ اس لیے کہ ایک صنف کا دوسری صنف میں دہرانا، تکرار یا جزوی طور پر مماثل ہونا قاری کے ذہن پر اچھا اثر نہیں چھوڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی فنکار کا دو صنفوں پر کامیابی سے دسترس حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یعنی اگر فنکار ایک ہی صنف پر اپنا سارا زور صرف کرے تو دہرانے کا اتفاق یونہی آدھا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے سامنے بس اس صنف میں تکرار سے بچنے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر افسانہ نگار پر دہرا STRAIN پڑتا ہے۔ یہاں پر T. S. ELIOT کی اس بات کو گرہ میں رکھنا ضروری اور مفید ہے کہ فن پارے میں فنکار کی شمولیت کا کوئی جذباتی نہیں رہنا چاہیے۔

ایک بات ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اگر ہم ان فنکاروں کے افسانے کے حدود میں رہتے ہوئے سوچیں تو ان کے افسانے افسانہ نگاری کی صنف میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ یعنی ان چاروں افسانہ نگاروں کے ایک یا دو یا بیشتر افسانے افسانوی لوازمات سے بھرپور ہیں جس پر بحث اوپر کی جا چکی ہے۔ لہٰذا ان کے فنی کی سطحوں کا تعین

کرنے میں الگ سے کوئی قباحت نہیں ہے۔

جہاں تک شاعری اور افسانہ نگاری پر ایک ہی فنکار کی الگ الگ سطحوں کا تعلق ہے اور اس پر امتیاز حاصل کرنے کا سوال ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ افسانوں میں ٹھوس ارضیت اور زندگی کے عوامل پر اُتر کر فن کو پیش کرنے کی سعی چاروں افسانہ نگاروں میں نظر آتی ہے۔ مگر اس سلسلے میں بلراج کومل اور کمار پاشی (میرے خیال میں صرف 'پچھلے آسمان کا زوال' میں شاعرانہ ماورائیت اور ارفع کیفیت زیادہ ہے) بہت ممتاز ہیں۔ حمید سہروردی کے چند افسانے (وہ افسانے نہیں جن میں انھوں نے نثری شاعری کے ٹکڑوں کا ادغام کر دیا ہے) بھی افسانوی ارضیت کے حامل ہیں۔ البتہ ایسا لگتا ہے کہ اختر یوسف افسانہ لکھتے وقت اپنے شاعرانہ مزاج کو یکسر فراموش کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کر پاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے لفظیاتی استعاروں کی ساخت کے باعث اور دوسری افسانوی لوازمات سے مل کر افسانے کی جہت کو گرفت میں لے تو لیتے ہیں مگر ماُئل کیفیات اور استعاراتی اژدہام کی وجہ سے ان کی شاعری ایک منفی صورت میں متاثر ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے بال برابر بھی اگر فرق پڑ جائے تو یہ ایسا فرق ہوتا ہے جو شاعری جیسی انتہائی لطیف اور نازک شے کے لیے سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے افسانہ کے لیے نہیں۔ اس لیے کہ افسانہ زیادہ وزنی زیادہ وسیع اور زیادہ ارضی ہوتا ہے۔ اس میں شاعری کے لوازم کے داخل ہونے سے افسانہ نگار کی فنکاری پر زیادہ حرف نہیں آتا۔

○○

○ ممتاز افسانہ نگار جناب قمر احسن بھوپال سے دہلی منتقل ہو گئے ہیں ان سے مندرجہ ذیل پتا پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے:

قمر احسن، آفس آف دی ائی نارڈی کیشن، لودھی اسٹیٹ، نئی دہلی۔

○ سطور کے خوشنویس جناب جمال گیاوی کا نیا پتا درج ذیل ہے:

جمال گیاوی، مکان نمبر ایچ 1/15، نیو سیلم پور، دہلی-۱۱۰۱۵۳-

بسمل کرشن اشک

خدا سے متعلق
پانچ نظمیں

مجھے اداس کو
ہزار قرنوں سے وصل دونوں کو اک چھپیاں کھلا رہا ہے
میں اپنی آنکھوں پہ باندھ کر زندگی کی چُنری
اسے اندھیرے کی سلوٹوں میں تلاشتا ہوں
وہ مجھ سے کچھ فاصلے پہ لہروں کی آڑ لے کر
کنول کے پھولوں سے مسکراہٹ تراشتا ہے
میں جانتا ہوں کہ فاصلہ ایک دو قدم ہے
مگر نئے سال کے لبادے کی رسمساہٹ
حیا کے پیروں کو روکتی ہے۔
(نئے لبادے پہ نقشِ کیچڑ کے دیکھ کر وہ پلٹ گیا تو)

ہزار قرنوں سے وصل کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر
جنوں کی ہمت بندھا رہا ہے
کہ عشقِ صادق بُلا رہا ہے
نئے لبادے سے لاتعلق بُلا رہا ہے

کہ جن لبادوں پہ نقشِ کیچڑ بنا گیا ہے
ہیں وہ لبادے عزیز اُس کو
مگر مجھے سال کے لبادے نئے لبادے کی رسمساہٹ
عزیز تر ہے
اور اُس کا لہروں کے اُس طرف پُرسکون گھر ہے

میں وصل کی رات کا مسافر
سہاگ کی گتھیوں میں گم ہوں
. . . دکھائی دے گا
نہ جانے کب وہ دکھائی دے گا؟
نہ جانے کب وصل کی رات ہوگی؟
نہ جانے کب تک یہ اک چھپیاں کا کھیل ہے
نہ جانے کب تک؟

۲:

فلک پہ سورج کی پہلی پہلی کرن کھلی تو
وہ ایک کاغذ شکستہ خط میں لکھا ہوا سا
کہ جس پہ اک اجنبی زباں کی بشارتیں تھیں
مجھے تھما کر نہ جانے کس سمت کو سدھارا
میں 'بچپنے' کی زبان سے اُس کو پڑھ رہا تھا
سمجھ میں آتا تھا اس طرف سے کچھ اس طرف سے
مگر جوانی نے اُس سمجھ کا وقار کھویا
میں پچھلے پچپن برس اسی مسئلے کا حل ڈھونڈتا رہا ہوں
مگر کوئی راستہ نہیں ہے۔
فقیر سرگوشیوں میں کہتا ہے "ہاں کوئی راستہ نہیں ہے"
میں اُس کی تحریر کل دبڑ سے مٹا رہا تھا
فقیر بولا: شروع صدیوں میں کچھ بزرگوں نے جان دے کر
یہ سعی کی تھی
تجھے خبر ہو کہ تیرے کاغذ پہ تیری قسمت کی طرح جو حرف ہے امٹ ہے
میں سوچتا ہوں وہ آخرش مجھ سے منسلک ہے
میں اس کو باہر کہ اپنے اندر تلاش کر لوں

فقیر کہتا ہے: ایک کاغذ شکستہ خط میں لکھا ہوا سا
وہ مجھ کو دے کر چلا گیا تھا
الا آج تک لوٹ کر نہ آیا
میں سوچتا تھا کہ اُس کو باہر کہ اپنے اندر تلاش کر لوں
وہ آخرش مجھ سے منسلک ہے،
مگر مری جان تلاش اُس کی فضول ہوگی
جو دے گیا ہے قبول کر لو
کہ اپنی تحریر کا بدلنا بھی اُس کے مقدور میں نہیں ہے

۳:

یقین تھا وہ اگر کہیں ہے تو گھر میں ہوگا
وہ گھر جہاں ننھے منے کلکاری مارتے ہیں
وہ گھر بہن بھائی جس جگہ پیار جیتتے، پیار
ہارتے ہیں
وہ گھر جہاں ماں پرات میں پیار گوندھتی ہے
وہ گھر جہاں سانس سانس ہر آس پیار کا ہار
گوندھتی ہے

مگر یہ گھر جس کے چپے چپے سے سنگِ تفریق
اُگ رہا ہے
مگر یہ گھر جس کے ہر قدم پہ ہزار دیوار اٹھ رہی ہے
یہ نیلی چھت کے تلے کی چھت جا بجا جس کا خطہ ٹھہرا
جو تفرقہ کی کتاب کا پہلا باب ٹھہرا

وہ گھر کے دالان میں نہیں تھا
وہ پلاسٹک سے سجائے گل دان میں نہیں تھا
وہ پلاسٹک جو وفا کے پھولوں کی جگہ دل میں
پنپ کے ہم لوگ جی رہے ہیں

وہ جانے کس وقت کس طرف کو کدھر گیا تھا
پڑوسیوں نے کہا جو دیوار درمیاں ہے بلند ہے
ہمیں خبر ہو تو کس طرح ہو کدھر گیا وہ

سڑک پہ کتنے ہی لوگ اُجلے لباس پہنے رواں دواں
وہ ہنس کے کہتے تھے کس کے بارے میں پوچھتے ہو
میں جس کے بارے میں پوچھتا تھا وہ اُن کے نزدیک
اجنبی تھا
سڑک سے کچھ دور جھونپڑوں سے میں پوچھتا کہ
کہ صاف دل کا مکین میلے لباس میں کس طرح
میں آج تک جھونپڑوں کے اس پار اشک اُس کی
تلاش میں ہوں
نہ جانے وہ کس لباس میں کس جگہ ملے گا
مگر وہ ملتے تو کہاں ملے گا

۴:

وہ مجھ سے کہتی ہے پہلے مٹی میں گھٹا میٹھا دہی ملاتے ہیں
تاکہ مٹی کو نرم کرلیں
خمیر اٹھانے کو قطرہ قطرہ چھڑکتے ہیں دودھ شیرنی کا
پھر اُس کو مدرا سے مٹھ کے سانچے میں ڈھالتے ہیں
پھر اُس پہ قوسِ قزح کے رنگوں سے اس کے بوٹے نکالتے ہیں
پھر اُس میں یوں رُوح پھونکتے ہیں کہ پندرہ سولہ برس گزرنے
جو بھی انسان دیکھتا ہے

وہ اللہ اللہ پکارتا ہے
وہ ہے وہ ہے کہ کے جسم اور جان ہارتا ہے

وہ مجھ سے کہتی ہے میں اگر ہوں
وہ مجھ سے کہتی ہے تم اگر مجھ پہ جان دیتے ہو اُس کے ہونے کا
اس سے بڑھ کر ثبوت کوئی نہ مل سکا ہے
نہ مل سکے گا

۵ :

فقیر کہتا ہے لوگ کہتے ہیں اُس سے کچھ بھی چھپا نہیں ہے
اگرچہ وہ خود چھپا ہوا ہے
فقیر کہتا ہے لوگ کہتے ہیں ہر جگہ ہے وہ لیکن اُس کا
سُنا ہے قیدِ مکاں سے کچھ واسطہ نہیں ہے
فقیر کہتا ہے لوگ کہتے ہیں ہر سمے ہے وہ لیکن اُس کا
سُنا ہے قیدِ زماں سے کچھ واسطہ نہیں ہے
فقیر کہتا ہے میں نے کچھ بھی کہا نہیں ہے اور اتنا کہہ کر
وہ کھلکھلاتا ہے اور کہتا ہے سوچتا ہوں :
بس اس قدر سوچتا ہوں کمبخت کتنا بے شرم بے حیا ہے

کوڑھ

غیاث احمد گدی

اس نے چندھی چندھی آنکھیں کھولیں جو روشنی کا بوجھ برداشت نہیں کر پا رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ کا چھجا سا بنا کر اسے پیچھے کو لیا۔ بانس کی پوری دیوار والی کھڑکی سے پرے تا حدِ نگاہ پھیلے آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا سیاہ فام لڑکی کا چہرہ بھی چمک رہا تھا۔ عمر کا آفتاب اس کے چہرے پر نصف النہار پر تھا۔ بڑے بڑے کان سرکنڈے کے ڈنٹھل کے باعث زیادہ خوبصورت دِکھ رہے تھے۔ کچے سیب کے کھٹے میٹھے رس میں بھیگے ہوئے ہونٹوں پہ جہاں تہاں ملگجا پن جھلک آیا تھا۔ تراشیدہ ٹھوڑی، موم بتی کے سانچے کی طرح خوبصورت دِکھ رہی تھی۔ وہ مسکرایا اور برش کو سبز رنگ کی پیالی میں ڈبو دیا۔ پھر پلیٹ پر سُرخ رنگ والی جگہ پہ زور زور سے گھسنے لگا۔ جب رنگ سیاہی مائل سُرخ اور قدرے ناگوار ہو گیا تو بانس کی دیوار پر، نا مکمل پورٹریٹ کے چہرے والی بڑی سی آنکھ کے کنارے پر ایک موٹا، بھدا خط کھینچنے لگا۔ مسکراہٹ اس کے لبوں پر اس لڑکی کی طرح بدستور ٹھہری ہوئی تھی،

"تم مجھے چھوڑ کر چلی کیوں نہیں جاتیں۔؟"

اس نے پلٹ کر سیاہ فام لڑکی کی طرف دیکھا پھر تصویر میں محو ہو گیا۔

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مٹی کے برتن میں اُبلتے ہوئے آلوؤں کو اسی طرح دیکھتی

رہی اس کا جوان چہرہ افسردگی سے یک لخت ڈھلکا سا ہو گیا۔ جب دوسری بار اس کے کانوں نے وہی الفاظ سنے تو جھنجھلا کر اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اضطراب والی کنکری کو، جس سے وہ آنسوؤں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی اٹھا کر زور سے پھینکا جو سیدھی اس کی پیشانی پر لگی۔

"الّو . . . ؟"

وہ ہنسنے لگا —— مگر مجھے تمہارا جواب پسند آیا ——"

سامنے والی دیوار پر جو اس نے ابھی کچھ دیر پہلے بڑی سی آنکھ بنائی تھی، اس میں اس نے کئی سفید خط ڈال دیے۔ آنکھ میں اندھیرا، اجالا غلطاں نظر آنے لگا۔ لیکن جس جذبے کو وہ بیان کرنا چاہتا تھا ہنوز اس کے اظہار سے معذور تھا۔ اس نے برش سبز رنگ کی پیالی میں ڈال دیا۔

جانتی ہو یہ کس کی تصویر ہے —— ؟"

" میں جاننا بھی نہیں چاہتی ——" لڑکی ابھی تک ناراض تھی۔ وہ بدستور ابلتے ہوئے آنسوؤں پر جھکی رہی۔

"اگر تم جان جاؤ" وہ رکا، اس کی طرف دیکھا، مسکرایا، پھر دھیرے سے بولا۔

"تو میرے منہ پر تھوک دو"

وہ میں کئی بار کر چکی ہوں"

وہ یکایک ہنس پڑی۔ سیاہ فام چہرے پر اس کے سفید دانت چھوٹی چھوٹی سچائیوں کی طرح چمکنے لگے۔ چہرے کا آفتاب پھر نصف النہار پر پہنچ گیا۔

مخمود اشارے کو سمجھ کر ہنسنے لگا ——" وہ تو محبت کی بات ہے۔"

" تم نے کسی سے محبت کی ہے —— ؟" سیاہ فام لڑکی کے تخیل میں وہ مرد ابھرا، بہت دن پہلے جس نے اپنی محبوبہ کے لیے اونچی چٹان سے کود کر جان دے دی تھی۔ یہ اس کے سامنے کی بات ہے۔ ابھی جب وہ مشکل سے دس ایک برس کی ہوگی مگر اسے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔ ندی کے پتھر پر کئی دن تک اس کا لہو چمکتا رہا۔ پھر دھوپ جھلس کر پپڑی بن کر ہواؤں کے ساتھ جزیرے کی فضا میں کھو گیا۔ وہ پھر اداس ہو گئی۔ برش جو انگلیوں اور ہتھیلی سے بندھا ہوا تھا، ڈھیلا ہو کر ایک طرف جھک گیا تھا۔

"تم ذرا میری مدد کرو۔"

لڑکی خاموشی سے اٹھی۔ الکوحل سے بھرے کپڑے کو پٹی کی طرح باندھنے لگی۔ گلے کی انگلی پکڑتے ہوئے گرہ دینے کے لیے کھینچا تو انگلی والے زخم سے سیاہی مائل لہو بہہ آیا۔

اس کے منہ سے "سی" کی آواز نکل گئی۔

سیاہ فام لڑکی نے ترحم سے اس کی جانب دیکھا۔ چہرے پر ایک اور چکتہ ابھر آیا تھا۔ جو بہت سرخ تھا اور جس میں سے کوئی رطوبت رس رہی تھی۔ چہرہ پہلے سے کچھ اور بھیانک ہو گیا تھا۔

"اس کا علاج کیوں نہیں کرواتے۔؟"

"اس کا کوئی علاج نہیں ہے ——— وہ آدمی رکا لڑکی کی طرف پیار سے دیکھ کر مسکرایا۔ "جیسے تمہارا نہیں ہے ———"

"مجھے کیا ہوا ہے۔؟"

"وہی ——— وہی جو مجھے ہوا ہے۔"

ہش، وہ ہنسی اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے، چہرے کو آگے کر دیا ——— دیکھو مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔"

"سب باہر ہے۔" وہ پھر ہنسا، تمہارے اندر ہے۔ دماغ میں، جبھی تو میرے جیسے اجنبی، بدمعاش . . .

" . . . وہ بھی تمہارے ہی ہے ——— " لڑکی ڈسٹر سے ہاتھ صاف کرنے لگی۔ "جسم میں بھی دماغ میں بھی اور . . .

گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے لڑکی کے چہرے پر اس نامکمل جملے کو پڑھنا چاہا۔ "اور کیا ؟"

"اور روح میں بھی . . . " لڑکی نے قدرے چڑ کر کہا۔

وہ چونکا۔ اس کے چہرے پر ایک سایہ سا منڈلانے لگا۔ خاموشی، ذرا دیر تک الوؤں کی طرح اندھیرے میں آنکھیں چمکتی رہیں۔ ہوا کا ایک بے قرار جھونکا کوٹھری میں اندر پھیل گیا۔ باکس کی دیواروں پر اس کی بنائی ہوئی تصویروں کو چوم کر جنوبی کھڑکی سے

باہر نامعلوم کی پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔

اس نے بانس کی دیوار والی نامکمل تصویر کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک خاموشی اور گہرائی سے گھورتا رہا پھر ٹھہر ٹھہر کے بولا:

"اس عورت نے بھی یہی کہا تھا ——— اس نے یاد کرتے ہوئے کہا ———

"تمہاری روح میں کوڑھ ہے . . . یہ اس دن کی بات ہے جب میں اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ پہلے وہ بہت روئی، گڑگڑائی، گھنٹوں منتیں کرتی رہی!"

وہ چپ ہوگیا۔ بانس کی دیوار پر اس گندی سوورپ نظریں گاڑ دیں جو ایک نہایت حسین عورت کی گود میں سر نہوڑے بیٹھی تھی۔ اور جیسے عورت حیرت سے اپنی پھٹی پھٹی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔

اسی حیرت زدہ بڑی بڑی آنکھ بنانے میں وہ کبھی کبھی دنوں غرق ہو جاتا۔ جو بن ہی نہیں پا رہی تھی۔ اس کو الجھائے ہوئے تھیں، کوئی رنگ جو اس آنکھ کی بے قرار کیفیت کو ظاہر کر سکے . . . جس کیفیت کو کبھی اس نے فرانس کی اس عورت کی آنکھوں میں دیکھا تھا جو اب بھی اس کے ذہن میں، اس کی رگ رگ میں، حساس پوروں میں موجود تھی۔ خارش کی طرح دھیرے دھیرے، اس انداز سے تدریجی طور پر ظاہر ہوتی کہ اس کی ہستی کے ذرے ذرے کو لتھیڑ دیتی۔ کبھی مدھم ہوتے ہوتے یوں معلوم ہونے لگتی کہ اس کی گرفت میں نہ آتی۔

"تم نے اسے چھوڑ کیوں دیا ——— ؟" متا نے لاپرواہی سے پوچھا۔ "تمہیں اتنا چاہتی تھی . . ."

اس نے رنگوں سے لتھڑا ہوا برش میز پر رکھ دیا۔ اپنے آپ کو قریب والی ایزی چیئر کے سپرد کر کے آنکھیں بند کر لیں، خاموشی، سیاہی مائل سرخ رنگ کی طرح ساری کوٹھری میں بکھری ہوئی تھی، اس نے آنکھیں کھولیں۔

میں خود سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے چھوڑ کیوں رہا ہوں جس نے میری زندگی میں رنگ ہی رنگ بکھیر دیے تھے، نور ہی نور بھر دیا تھا۔ چنانچہ جب اس نے یہی سوال کیا جو تم آج پوچھ رہی ہو، تم مجھے کیوں چھوڑ رہے ہو۔ کیا نقص ہے، کیا عیب ہے مجھ میں . . . تو میں جواب نہیں دے پایا۔ میں سوالوں کے کانٹے دار باڑھ میں

لیکن وہ اس کے رکتے ہوئے بولی "لیکن آنکھیں خالی نہیں تھیں —— " وہ
تھک ایک بار اس کی گدلی گدلی بیمار آنکھوں کی طرف دیکھا اور کھوئے ہوئے سے لہجے
میں بولی —— "مجھے لگتا تھا اس میں خواب چھپے ہوئے ہیں . . ."

"تاہیتی کے اس ہوٹل کے قریب اور ساحل سے لگا ہوا ایک ہوٹل تھا جسے
سیب اور آلو چھپے جانے والے جہازیوں اور ملاحوں نے آباد کر رکھا تھا۔ قسم قسم
کے لوگ آتے، شراب پیتے، تھوڑے پیتے زیادہ، آپس میں زور زور سے باتیں کرتے، لڑتے جھگڑتے
روتے، ہنستے قہقہے لگاتے، دوست کے وقت گزار دیتے۔ انہی بستیوں سے الگ
وہ تراشیدہ چوبی کرسی پر بیٹھا سامنے والی میز پر خالی گلاس رکھے چپ چاپ
نیلے آسمان اور گہرے نیلے بہتے ہوئے سمندر کو تکتا رہتا۔

تبھی وہ لڑکی، وہ سترہ سالہ جوان لڑکی اپنی آنکھوں سے چھپا کر سفید شراب اس
کے گلاس میں انڈیل دیتی۔ کبھی سیب کے تلے ہوئے ٹکڑے، کبھی بھنی ہوئی چھوٹی
چھوٹی سمندری مچھلیوں سے بھری پلیٹ لا کر رکھ دیتی۔ اور اس کی آنکھوں میں
جھانکنے لگتی۔

وہ چونکتا۔ اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتا۔ کبھی کبھی اس کے بھرے
بھرے گال کو تھپتھپا دیتا وہ ذرا سہم کر، ذرا خوش ہو کر الگ کھڑی ہو جاتی۔ وہ پھر بڑبڑاتا
اور پوچھتا۔

"کیوں —— وہاں کیا دیکھا؟"

"کہاں" —— لڑکی حیرت سے پوچھتی۔

"یہاں ——!" وہ اپنی دونوں آنکھوں کی طرف اشارہ کرتا۔ "ان گڑھوں
میں . . ."

"مجھے نہیں ——" وہ ذرا اور حیرت زدہ سا جواب دیتی۔ "مجھے نہیں
معلوم . . ."

"تم نے دیکھا ——؟"

"ہاں ——!"

"خوبصورت . . ."

"تمھاری آنکھیں ہیں؟" لڑکی کی آنکھیں چمکیں۔

"ہاں! دو موٹی موٹی بھدی جنگلی سوریں . . ."

"ہش" یہ لڑکی کہہ کر ہنس دیتی۔

تب وہ اک ذرا چونک کر تعجب سے اس کی ہنسی کو دیکھتا۔ اس کو چٹکی میں پکڑ کر سوچتا، اس کا اس تتلی کی طرح معصوم ہنسی کا رنگ کیا ہو سکتا ہے، وہ جب کبھی اس کی تصویر بنانے کے لیے بیٹھے گا تو کون سا رنگ استعمال کرے گا۔ کیسا خط، کون سا زاویہ، آڑی ترچھی، مستطیل، متوازی لکیریں بے ربط مگر آپس میں جڑے جڑے گھلے ملے ہوئے ہزاروں رنگوں میں سے کون سا رنگ۔ کیسا رنگ . . .

وہ خطوں، زاویوں اور رنگوں کی دنیا میں بھٹک جاتا۔ بہت دیر تک واپس نہ لوٹتا تو وہ لڑکی پوچھتی:

"تم پھر کہاں چلے گئے" ——— چپکے سے گلاس میں شراب ڈھالتے ہوئے مسکرائی۔ "یہ بیٹھے بیٹھے تم کہاں چلے جاتے ہو؟"

کہتے کہتے وہ ہنستی اور ہنستے ہنستے یکایک جیسے ہر طرف دنیا بھر کے سارے رنگوں کے سارے پورٹریٹ، لینڈ اسکیپ سے مختلف، ممتاز، منفرد بھڑک چمک بے پناہ ہو جانے والی ہنسی۔ جیسے کوئی پرندہ پھڑپھڑا کر اڑے اور اچھل کر فضا میں جا کر دم بھر میں گم ہو جائے . . . اس کی ہنسی جس کی کوئی صورت نہیں۔ جذبے کی طرح، احساس کی طرح، خدا کی طرح . . .

پھر وہ چونک کر لوٹتا اور پوچھتا۔ "لڑکی تمھارا نام؟"

"تم روز پوچھتے ہو ———" وہ زور سے ہنستی۔

"ہاں! اور روز بھول جاتا ہوں . . . !" وہ شراب کا گلاس ہونٹوں سے لگاتا اور ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر کے آستین سے منہ پونچھتا . . .

"آج پھر بتاؤ۔"

"شا ———" وہ دھیرے سے کہتی۔

"شا ———" وہ دہراتا۔ "اس کا مطلب؟ [illegible] میں اس [illegible] کا کیا مطلب ہے؟"

"پتہ نہیں!"

"میں بتاؤں۔؟"

وہ اثبات میں گردن ہلاتی۔

"گوریا ___"

"___ گوریا ___؟"

"ایک چھوٹی سی چڑیا، تمھارے یہاں نہیں ہوتی ___!"

. . . .

میں نے جیسے ہی اس کے گھر میں، اس کے کمرے میں قدم رکھا، روشن دان میں سے ایک گوریا پھڑپھڑاتی ہوئی تیزی سے نکلی جیسے وہاں آگ لگ گئی ہو۔ اور چیں چیں کرتی سارے کمرے میں بے قرارانہ گشت لگانے لگی۔"

"ایلس کے گھر میں ___؟" پلٹ کر مَتا نے پوچھا، اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی جو بھبس کو سوچ کر بے حد ڈراؤنا ہو گیا تھا۔ جذام تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا کہ اب اس کے ہونٹ بھی پھٹنے لگے تھے اور آنکھوں میں ہر وقت زرد رطوبت رسنے لگی تھی۔

"یہ جوسٹن کے یہاں ___؟"

"بس اس کو اب آرٹسٹ کے گھر میں ___!" اس نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ درد پانی کے قطرے آنسوؤں کے جذام زدہ چہرے پر پھیل گئے۔

خوبصورت، دل نواز شہر پیرس سے دور، شمال مغربی جزیرے تاہیتی کی سرد رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ پاس والے گاؤں سے دور اس تنہا جھونپڑی میں، گوریا صفت بیوی مَتا کے پہلو میں لیٹا چپ چاپ وہ یادوں کی خاردار جھاڑیوں میں اتر گیا۔

وہ چپ ہو گیا اور یادوں کی خاردار جھاڑیوں میں اتر گیا: . . . آگے بڑھتا جاتا اور لہو لہان ہوتا جاتا۔ سارا جسم چھلنی ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں، پشت، چھاتی، چہرہ، سارے جسم پر خراشیں ہی خراشیں تھیں۔ چہرہ پھٹ پھٹ گیا تھا۔ جیتا جیتا لہو، بہہ بہہ کر خاردار جھاڑیوں کو، فرش کو رنگے جا رہا تھا۔

اُس دن . . . اس دن . . .

اس دن سرائے کے بدبودار گندے کمرے میں بے حد غلیظ بستر پر، لاوارث پڑا بخار سے تپ رہا تھا ابھی ابھی بوڑھی لینڈ لیڈی سینکڑوں گالیاں دے کر گئی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی زور سے چلائی۔ اسے لگا میں مر چکا ہوں۔ پھر اس نے موٹے پیر سے جس کے سہارے وہ چلا کرتی تھی۔ مجھے ہلا ڈلا کر دیکھا تو اسے ذرا اطمینان ہوا لیکن گالیاں بدستور جاری رہیں، اچھا ہوتا اگر تو بھی مر گیا ہوتا، غلاظت کی پوٹ سے کمرے کو تو نجات ملتی۔ پھر میرے وہ ایک سو چھتیس روبل، وہ تو گئے۔ حرامزادے کو موت کب آئے گی . . .

شاید اس نے اس کو خبر دی تھی۔ یا ہو سکتا ہے کسی اور نے بتایا ہو یا وہ آپ سے آگیا ہو۔

وہ دیوار والی بڑی سی آنکھ کو دیکھنے لگا جس پر دریچے سے تاہیٹی کے سلیٹی آسمان والے پورے چاند کی روشنی پڑ رہی تھی۔ جہاں اندھیرے اجالے نے مل کر ایک عجیب سی ترحم پسندانہ کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔

"پھر . . . !"

پھر مجھے بخار میں اس طرح بے ہوش دیکھا تو سارا غصہ، ذلت، اور وہ سارا تذلیل آمیز احساس جو میرے ہاتھوں اسے اٹھانا پڑا تھا، سب کچھ بھول گیا۔ اور بے قرار ہو گیا۔ غشی کے باوجود مجھے لگا وہ رو رہا ہے۔

ذرا دیر بعد اس نے میری گردن میں بانہیں ڈال کر اٹھایا۔ رال سے لتھڑے ہوئے چہرے کو صاف کیا۔ بالوں اور داڑھی میں سے روٹی کے ٹکڑے اور تنکے چنتے پانی پلایا۔ مجھے یاد ہے، بہت سا پانی جب خالی پیٹ میں چلا گیا تو اندر سے ابکائی آئی اور سارا پانی گرم گرم رال، اناج کے ریزوں کے ساتھ باہر آ گیا جس سے وہ اور میں نہا گئے۔

یہ دیکھ کر وہ چیخ کر رونے لگا۔ اور روتا ہوا اسی عالم میں باہر ڈاکٹر کو لانے چلا گیا . . . اسی نے مجھ کو بتایا تھا۔ مجھے ہوش ہی نہیں اس کے بعد کیا ہوا۔

اس نے کم سن عتا کے موٹے موٹے سفید ہونٹوں پر جذام زدہ انگلیاں پھیرتی پاس پھر رک گیا۔ ہاتھ [illegible] قریب رکھے مدھم روشنی میں انگلیوں کو دیکھا جو تقریباً جھڑ چکی تھیں۔ صرف [illegible] ٹھنٹھ سے رہ گئے تھے جو بجھے سرخ تھے۔

عتا اسی طرح چپ چاپ [illegible] چہرے کو گھور رہی تھی۔ اس کی دونوں تندرست سیاہ فام

چھاتیاں دودھ کی مست مٹروروں کی طرح تنومند اور پر اُٹھائے ہوئی تھیں۔

وہ بچے جیسا نہ وہ ہاتھ اس پر پھیرنے لگا —— "تم نے گویا تھکی ہے ——؟"

ستارا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پلٹ کر ٹھیک گوریا کی طرح سر ٹیڑھا کیے تکنے لگی۔

اس نے تقریباً بے خودی میں اُس کا اشارہ کیا تھا۔ خلا میں میرا سارا جسم سنسنا رہا تھا اور پاؤں ابھی طرح سے پتہ نہیں چل رہے تھے۔ کسی طرح اس کے گھر میں داخل ہوا۔ گوریا جو جانے کون سے کونے میں چھپی ہوئی تھی۔ اُڑی اور سارے کمرے میں [illegible] چلاّ چلاّ کر "چیں چیں" کرتی جاتی تھی، پھڑ پھڑاتی، پاگلوں کی طرح بھاگتی پھرتی۔ ماحول میں تلاطم ڈال دیا اس نے میں اور وہ دونوں نے چونک کر دیکھا اور حیرت سے دیکھتے رہے۔

ٹھیک اسی وقت دوسرے کمرے سے اس کی بیوی آئی جو شاید میرے نام سے ہی نفرت کرتی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ چلاّنے لگی، چیخنے لگی، انگلیاں پٹک پٹک کر، ہاتھوں کو جھٹک جھٹک کر۔ شدید نفرت اور کراہیت سے وہ پاگل ہو رہی تھی۔ مجھے کوستے کوستے تھک گئی تو اپنے شوہر کو گالیاں دینے لگی۔

کیسے بے شرم، اس کی گندگی کی پوٹ، اس کمینے ذلیل آدمی کے پیچھے پڑ گیا [illegible] لگا ہوا ہے، دیکھتے نہیں کتنا غلیظ ہے یہ، ہٹاؤ ہٹاؤ اسے یہاں سے، سارے گھر میں تعفن بھر گیا ہے۔ مجھے ابکائیاں آ رہی ہیں۔

میں نے خلا میں دہکتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور میں نے دیکھا اور محسوس کیا وہ عورت جو میرے سامنے کھڑی ہے۔ نفرت اور کراہیت کا اظہار کر رہی ہے وہ . . .

وہ بہت خوبصورت ہے۔ بہت حسین، بالکل جھوٹ کی طرح۔

"جھوٹ کی طرح" یکایک ستارا چونکی اس نے پلٹ کر پوچھا —— "جھوٹ خوبصورت ہوتا ہے!"

ہاں! اس نے دھیرے سے کہا "اس عورت کی طرح"

وہ چُپ ہو گیا۔ اندھیرے میں ڈوبا ہوا وقت بھاری قدموں سے گزرنے لگا آہستہ آہستہ دونوں کے بیچ [illegible]۔ گہری رات، [illegible] کی طرح [illegible]۔ باہر [illegible] میں [illegible] سیار کی [illegible] سنائی دی۔ [illegible] میں [illegible] سیاہ پہاڑیوں سے [illegible]

"پھر . . ."

پھر وہ عورت چیختے چلاتے، ایڑیاں پٹکتے تھک گئی اداس کا شوہر تیں کرتے نہیں تھکا تو اچانک وہ میرے پہ ہاتھ رکھ کر رونے لگی ـــــــ "تم نہیں جانتے، تم نہیں جانتے دُنیا والو، اس جہان میں سورج بھی ہوتی ہیں۔"

"سورج"

"سورج بھی ہوتی ہیں؟" عتا نے پلٹ کر وضاحت طلب نظروں سے دیکھا، پھر دھیرے سے بولی "مطلب؟"

"مطلب مجھے معلوم نہیں ـــــــ! اور عتا تم جان کر بھی کیا کروگی؟ لیکن بھدر کی کہانی عجیب ہے، میرے کوڑھ کی طرح جو میرے جسم میں ہے اور شاید دُور وح میں بھی . . ." وہ رُکا کچھ دیر چپ رہا، پھر بولا۔ "اور تمھارے جذبے کی طرح، ہونٹوں کی طرح، جو کسی پر مہربان ہو جائے تو زندگی اس پر اپنے اسرار کھول دیتی ہے!"

وہ خاموش ہوگیا۔ کسی جوہڑ کے گدلے کیچڑ آلود پانی کی طرح آنکھوں میں افسردگی خیمہ زن تھی۔ وقت بدستور بے مروت دوست کی طرح گزرتا رہا۔ اور رات دشمن کی سپاہ کی طرح ٹھیری رہی . . . اس نے پلٹ کر دیکھا عتا سچ کہتی تھی۔ اس کے ننگے جسم سے سٹا اس کا بچہ بھی سو رہا تھا۔ چاند جو کچھ دیر پہلے مشرقی دریچے پر ٹھیرا ہوا تھا، شفتالو کی گھنی شاخ میں اٹک کر اوجھل ہو چکا تھا۔ اور جبو نیڑی کی دیواروں پر جن پر اس کی تصویریں جاگ رہی تھیں اندھیرے میں کھو گئی تھیں۔

اس نے اندھیرے میں اپنے آپ کو چھو کر محسوس کرنا چاہا، سارا جسم جذام کے باعث سڑ گیا تھا۔ ہاتھوں سے، پاؤں کی بیوائیوں سے پیپ بہہ رہی تھی، بھچے پیچے ہونٹوں سے بھی خون آلود زردی مائل سُرخ پیپ رس رہی تھی۔ تعفن سے ساری کوٹھری بھبکی پڑ رہی تھی۔ گھن اور نفرت سے دُور عتا صندل کی شاخ کی صورت اس کی زندگی کی متعلق ہو گئی ہوئی تھی۔ اس نے کبھی کراہت محسوس نہیں کی۔ پچپن برس کے ادھیڑ اور سڑے جسم کو اپنی پچیس سالہ عمر کی آگ سے زندہ اور گرم رکھا۔ مرہم دیہات کی طرح، دستِ حنا آلود کی طرح۔

اس نے بے تابی سے کروٹ بدلی۔ دریچے سے باہر دیکھا اُوپر تا بیچ کا

آسمان گدلا گدلا تھا۔ ابھی صبح ہونے میں دیر تھی۔ فضا پر گہری دھند کی چادر سی تنی ہوئی تھی۔ اُجالا کہیں تھا تو کہیں نہیں تھا۔ اندھیرا کہیں نہیں تھا تو کہیں تھا۔ خلط ملط غلط ان و پہچان۔ آپس میں اُلجھا ہوا سا۔ دُور وہ گاؤں جہاں سے لوگوں نے اس کو اور اس کی بیوی عتا اور بچے کو بھگا دیا تھا، اس کے جھوٹ کے مرض کی وجہ سے دُھند لکے میں چھوٹی چھوت کی بیماری کی طرح دکھلائی دے رہا تھا۔

پھر اس نے سیب کے اس پیڑ کو دیکھنے کی کوشش کی جس کے نیچے اس کا نہیں عتا کا بڑا بیٹا سو رہا تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آنکھ کی طرح روشن بچہ۔ ۔ ۔ عین اس کے پہلو میں خود اس کی قبر منہ کھولے منتظر ہے۔ اس کی وصیت کے مطابق عتا نے وہ قبر کھود ڈالی۔ بائیس دنوں مسلسل محنت سے وہ گہری تاریک قبر، جیسے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچا ۔ ۔ ۔ وہ آنکھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کئی دنوں کی لگاتار محنت سے، پیار سے، چاہت سے؛ بالآخر وہ آنکھ مکمل ہو گئی تھی جس کے لیے وہ پچھلے کئی ہفتوں سے سرگرداں تھا۔ اس کے ذہن میں، شعور میں، رگ رگ میں جو کچھ تھا سب کچھ اس کے ہاتھوں سے نکل گیا، اس تصویر نے، ان تصویروں نے آخر کار اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا۔ اس کا اپنا بھی پیرس کی اس عورت کا عطا کیا ہوا بھی۔ عتا کی بخشی ہوئی بے شمار دولت بھی۔

اس نے پھولے پھولے دو ہاتھوں کی طرف دیکھا جو ایکدم سے خالی تھے۔ ۔ ۔

وہ کتنا کنگال ہو چکا ہے۔ اس کے پاس اب کچھ بھی نہیں۔ جس دن وہ لندن سے چلا تھا تو نگر تھا۔ اس کے احساس کی جیبیں ٹھسا ٹھس بھری ہوئی تھیں۔ برسوں وہ پیرس میں اپنی بیش بہا دولت لٹاتا رہا۔ دونوں ہاتھوں سے لٹاتا رہا۔ جب بھی کمی نہ آئی۔ ایسا کا تخیل اسی طرح سرسبز و شاداب تھا۔ اسے محسوس ہوتا اس کا کچھ خرچ ہی نہیں ہو رہا۔

--- اس جزیرے میں بتائی کے اس ساحلی گاؤں اور گاؤں سے دُور اپنی تنہا جھونپڑی کی دیواروں پر بالآخر اس نے دل کھول کر خرچ کیے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے، مٹھی بھر اناج کے لیے دن بھر سیب سے بھری ٹوکریاں ڈھو کر، جہاز پر لدوائی کر کے جہاز کے عرشے کی صفائی کر کے اور رات بھر زیتون کے روغن کی مدھم سی روشنی میں بانس

کی جھونپڑی کی دیواروں پر اپنی بیش بہا دولت لٹاتا دونوں ہاتھوں سے لٹاتا۔

اس نے پھر اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔ اس کے پاس اب کچھ نہیں، جو کچھ دس سال کی عمر سے بیالیس سال کی عمر تک جمع کرتا رہا وہ سب کچھ خرچ ہو گیا۔ وہ تہی دست، تہی داماں، اس کے خزانے میں ایک لمحہ بھی نہیں جس میں وہ کھل کر سانس لے سکے۔ پل بھر کے لیے بھی زندگی کر سکے۔

کل جب وہ مر چکا ہو گا عتا اس کی ساری دولت کو آگ لگا دے گی۔ اس کی وصیت کے مطابق دیوار کے ایک ایک نقش کو جلا کر راکھ کر دے گی۔

اُجالا کہیں تھا تو کہیں نہیں تھا۔ جہاں نہیں تھا وہاں وہ جذام کی آگ میں سُلگتا تڑپ رہا تھا۔ جہاں تھا وہاں . . . وہاں . . .

اس نے غور سے دیکھا۔ عتا، وہ سیاہ فام لڑکی سو رہی تھی وہاں اس کے پہلو میں اس کا دُوسرا بچّہ، اس کی عتا کا بچہ سو رہا تھا۔ جس کے انگ انگ میں وہ خود چھپا بیٹھا تھا۔ کل کی دُنیا میں وہی ہو گا۔

کل کی خوبصورت دُنیا میں کہیں کوڑھ نہیں ہوگا، جذام نہیں ہو گا۔ مگر وہ ہو گی۔ وہ رُکا اس کی آنکھوں سے گرم گرم پانی اس کے رخساروں کے زخم میں پھیل گیا۔ اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر محسوس کیا۔ ہاں! ایک چیز ہو گئی ——— اس نے سوچا اس کے مُردہ تخیل کی سرزمین میں دھول ہی دھول اُڑ رہی تھی ۔ کوشش . . . اس نے بہت کوشش کی، اس کو چٹکی میں پکڑ لے، اس چیز کو اس کے تصوّر کی بُوڑھی انگلیاں تھرتھرا کر رہ گئیں اس کو گرفت میں لے ہی نہیں سکیں۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ پھر بند کر لیں۔ مضمحل سماعت نے پھڑپھڑاہٹ کی آواز سُنی، لیوترے سر والے چرندے کے قدموں کی چاپ، اور ذرا دیر بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر کچھ بھی نہیں تھا . . سیاہ رات ٹوٹ ٹوٹ کر، ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھر رہی تھی اور تاہیٹی کے سنسان آسمان میں کوئی چیز اُڑتی چلی جا رہی تھی۔

شاید وہ . . . نہیں شاید وہ . . .

OO

باقر مہدی

رباعیاں

(وارث علوی کی نذر)

اک حرفِ ملامت بھی نہ لکھا اس نے
اتنا بھی حقارت میں نہ سمجھا اس نے
اب کس سے شکایت کی توقع رکھیے
منہ پھیر لیا دیکھ کے اچھا اس نے

○

ناشاد ہیں کیا تم سے شکایت کرتے
بس چلتا تو دیواروں سے ٹکرا مرتے
خالی ہیں کہاں راہبروں سے راہیں
پھر موت سے ہر موڑ پہ کیسے ڈرتے

○

ویران سی آنکھوں میں نہاں تھا پانی
زخموں کو کریدا یہ کہاں تھا پانی
سوکھے ہوئے چشمے کا نشاں تک نہ ملا
اک راکھ سی اڑتی تھی جہاں تھا پانی

فضا ابنِ فیضی

وہ ہے نکتہ سنج کتنا، کچھ تو اندازہ لگاؤں
چپ رہوں کیوں، میں بھی کوئی برمحل فقرہ لگاؤں

ہٹ کہاں اتنے دنوں سے، کچھ پتہ اپنا لگاؤں
گھر کی دیواروں پہ اس کے شہر کا نقشہ لگاؤں

یہ فسوں کیسا کہ سب کے جسم پتھر ہو گئے ہیں
سوچتا ہوں، اب خود اپنے آپ پر تیشہ لگاؤں

ہے دلیلِ خوش نگاہی، نت نئے بہروپ بھرنا
میں بھی اب چہرے پہ اپنے، دوسرا چہرا لگاؤں

ڈس نہ لے یہ رات مجھ کو، ہائے تنہا گھر کے اندر
خواب تو باہر کھڑے ہیں، کیسے دروازہ لگاؤں

نذر میں کیا چیز دوں گا، آنے والے موسموں کو
آنسوؤں کے تخم بوؤں، درد کا پودا لگاؤں

ہے زبوں کا علم مکتب کی، یہ منطق بھی عجب سی
حرف چاندی سا لکھوں، اُس پر سیہ نقطہ لگاؤں

کیا روایت کے ہنر سے، انحراف آساں ہے یارو!
زاویہ لفظوں کا بدلوں تو نئے معنی لگاؤں

کوئی سایہ، چپکے چپکے رفتہ اُترجاتا ہے مجھ میں
اب حویلی پر بدن کے، دھوپ کا پہرا لگاؤں

میری کوشش، ہو کہیں مدھم نہ لہجے کا ترنم
تیری خواہش، میں غزل میں نثر کا ٹکڑا لگاؤں

وقت کے آشوب کا ہے اک مرقع ذات میری
اس مرقع پہ فضا عنوان اب کیسا لگاؤں

فضا ابنِ فیضی

بارشِ سنگ رُکی شیشہ گری میں بھی کہاں
اب اماں، دائرۂ خوش ہنری میں بھی کہاں

جب تلک جان کے پیچھے ہے یہ آشوبِ وجود
چین گھر میں بھی کہاں، دربدری میں بھی کہاں

تھی ہر اک سانس یہاں خود شکنی کا تیشہ
میں شکستوں سے بچا، خودنگری میں بھی کہاں

اپنے وجدان کے پتھر ہی سے ٹھوکر کھائی
پانو پھسلے ہیں، رہِ دیدہ وری میں بھی کہاں

کیسے روشن کروں آخر نئی صبحوں کے الاؤ
آگ، فانوسِ چراغِ سحری میں بھی کہاں

دھند پھیلے گی، تو کیا ہوگا مرے اہلِ نظر
گم ہو تم دیر سے، اس باخبری میں بھی کہاں

میری سنجیدہ نگاہی کا جو تیور ٹھہرا
وہ اثاثہ، دقت کی تمکیں نظری میں بھی کہاں

سر سے ہوں پانو تلک، شعلہ لبی کا دریا
اب وہ آسودگی آنکھوں کی تری میں بھی کہاں

شمعِ جادہ ہیں، مری گم شدگی کے لمحے
میں رُکا ہوں، سفرِ بے بصری میں بھی کہاں

دھوپ برسائے گی شعلے جو رُکیں گے پتھر
اے فضا تجھ کو سکوں، بے خبری میں بھی کہاں

سلطان اختر

تمام دن رات پر شکستہ
سبھی کے حالات پر شکستہ

یقین چاروں طرف منوّر
سیاہ شبہات پر شکستہ

مری دعائیں اثر سے خالی
تری کرامات پر شکستہ

بدن میں خواہش کی آگ روشن
لہو کی برسات پر شکستہ

ہر ایک طوفان سر بہ زانو
تمام جذبات پر شکستہ

تھا ہر اک حرف حرفِ آخر
مری ہر اک بات پر شکستہ

مجھے بھی پرواز کی تمنّا
مگر مری ذات پر شکستہ

جھکی تو شاخِ ثمر بہت ہے
مگر مرے ہات پر شکستہ

رے حصارِ ہنر میں سب کچھ
رے کمالات پہ شکستہ

ناجِ جاں میں وہ خیمہ زن ہے
گر ملاقات پہ شکستہ

روز و شب مائلِ سفر ہوں میں
پھر بھی منزل سے دور تر ہوں میں

ڈھو رہا ہوں میں بے گھری کا عذاب
یعنی سچ ہے کہ اپنے گھر ہوں میں

لمحے لمحے کی ہے خبر مجھ کو
اک ذرا خود سے بے خبر ہوں میں

کوئی آہٹ کہیں نہ کوئی صدا
ایک سنسان رہگذر ہوں میں

ہر طرف گونجتا ہے سناٹا
وقت کا آخری پہر ہوں میں

سن سکو گے نہ پڑھ سکو گے مجھے
یعنی افسانۂ دگر ہوں میں

میرے چاروں طرف دھوئیں کی فصیل
ایک جلتا ہوا نگر ہوں میں

جانے کب جسم و جاں بکھر جائیں
جلتے لمحوں کے وار پر ہوں میں

قدر افزائیِ ہنر معلوم
لاکھ شائستۂ ہنر ہوں، میں

سرشار بلند شہری

گندم کی فریاد پہ مر جاؤں
دریا کے سینے میں اتر جاؤں

شجر سایہ دار قریب آیا
پل دو پل کے لیے ٹھہر جاؤں

خالی ہاتھ سفر پہ جانا ہے
لاؤ سب کے دامن بھر جاؤں

پلکوں سے بکھرے کانٹے چن کے
ہنستا گاتا ہوا گزر جاؤں

ایسا آیا ہے شوق گدائی کا
تخت و تاج کو ٹھکرا کر جاؤں

بے معرف اس رینگتے سورج کو
مستقبل کے در پہ دھر جاؤں

تو شب کی دہلیز پہ جا بیٹھوں
سورج کے زینے سے اتر جاؤں

گاؤں سے بھاگ کر دلی میں آیا تھا
اب یادوں سے گاؤں تک پہنچ جاؤں

گلتارے کے اجلے کپڑے پہنوں
پھر اپنے گھر سے باہر جاؤں

خوشبو خوشبو اڑا خدا
ذرہ ذرہ ہنسا خدا

پتہ پتہ ہوا چلی
غنچہ غنچہ کھلا خدا

منظر منظر رنگ رچے
پیکر پیکر جچا خدا

سبزہ سبزہ دھنک ہنسی
ہنسی ہنسی میں ملا خدا

پتھر پتھر شہر بسے
دریا دریا بہا خدا

دروازے دروازے پہ
بھیس بدل کر ملا خدا

مٹی، آگ، ہوا، پانی
سب کے اندر ملا خدا

قیصر قلندر

کس بستی میں سورج اترا، میں کیا جانوں
درد کا چاند کہاں سے اُبھرا میں کیا جانوں

پیرہنوں کے رنگ ہوا میں لہرائے ہیں
کس نے دیکھا رنگ ہوا کا میں کیا جانوں

وقت نے ایک اور سال کا موتی نگل لیا ہے
سالگرہ کا جشن یہ کیسا میں کیا جانوں

جستہ جستہ دھیان کے آنگن پر چھایا ہے
ایک سنہرے رُوپ کا نشہ میں کیا جانوں

سانس کے کومل پردے میں ارمانوں کے قریے
جانے کب گر جائے یہ پردا میں کیا جانوں

روپ کی بارش میں بھیگے تھے مدت گزری
شعروں میں ہے پر تو کس کا، میں کیا جانوں

اُس کا پُرانا شیوہ ٹھہرا روز کی سج دھج
دل کو کیا رہتا ہے کھٹکا، میں کیا جانوں

کس کے نام سدا آتے ہیں پیار کے نامے
کون نبھائے عمر کا وعدہ، میں کیا جانوں

گُل بدنوں نے رنگ اُچھالے ساری فضا پہ
کس کے دل سے کون سا اُبھرا میں کیا جانوں

اپنوں، بیگانوں کے دُکھڑے کوہ برابر!
کون اُٹھائے بوجھ یہ سارا میں کیا جانوں

لمحوں کے پتے جھڑتے ہیں چپکے چپکے
کس کس کو احساس ہے اس کا میں کیا جانوں

صدیوں کے کس سمت سے آئی دل میں بیٹھی
گیتوں میں ہے کس کا سراپا، میں کیا جانوں

آنکھوں میں مسکان تھی تیری کلیوں جیسی
کون سا من میں پھول کھلا تھا میں کیا جانوں

ہونٹوں سے جاری تھا میٹھا میٹھا جھرنا
آنکھوں سے امرت کا دریا، میں کیا جانوں

شوخ ہوا لے آئی خوشبو تیرے بدن کی
دھیان میں یہ کہرام ہے کیسا میں کیا جانوں

کندن رُوپ کے گن گاتے ہیں بستی والے
شہر نوا کا اب کیا ہوگا میں کیا جانوں

دھیرے دھیرے من کی بات کہی نغلوں نے
کب پھوٹا تھا پیار کا نغمہ، میں کیا جانوں

اُس کا دوشالہ اوڑھے ہے پھول سی صورت
کب اُترے دُوری کا لبادہ میں کیا جانوں

الفت کے پہلو میں ارمان کا دن سویا ہے
دل میں یہ کیسا ہنگامہ میں کیا جانوں

کس کے پیار کی خوشبو پھیلی نگری نگری
کس نے دیکھا خواب سہانا میں کیا جانوں

دھیان میں ہے جلوے کا وہ دوشیزہ منظر
قیصر کا ہے جو سرمایہ میں کیا جانوں!

ظفر صہبائی

ہمارے ہی خون سے ہے تر دلی
یوں ہے جینے کو ہے سما گھر دلی
ہولیاں کھیل کر بھی ہے بے داغ
عقل مندوں کا ہے نگر دلی
خار و خس جب بھی متحد ہوں گے
پھینک دے گی کوئی شرر دلی
بھول کر اپنی آنکھ کا شہتیر
اور سب سے ہے باخبر دلی
دیکھو منظر اور پس منظر
سازشوں میں ہے نام ور دلی
جو ہوا کے خلاف اڑتے ہیں
کاٹ دیتی ہے ان کے پر دلی
کیوں ظفر چوکتے ہو کہنے میں
چھوڑتی جب نہیں کسر دلی

رام پرکاش راہی

اتر کے دل میں دریچہ کوئی جو وا کرتے
نظر کا فرض تو چہرے کا حق ادا کرتے
وہ چہرے روٹھ گئے کیوں نہ آبگینوں سے
وہ ماورا تھے تو ہر شے کو ماسوا کرتے
چبھے تھے زہر حقائق میں یاس کے نشتر
خوشی سے زخم نہ کھاتے تو اور کیا کرتے
خدا نہیں تھے تو پھر ناخدا ہی کہلاتے
کہ ڈوبتے تو جو انبا خدا خدا کرتے
نہ دستکیں ہیں نہ آہٹ نہ دھڑکنیں دل کی
کوئی صدا جو پہنچتی تو در کھلا کرتے
بھنور دکھوں کے ہیں شرطوں کے آئینے راہی
اسیر آپ تھے کچھ تنگیٔ ہوا کرتے

فاروق شفق

ایسی خواہش کی دل کو ضرورت نہ ہو
دھوپ ہو لیکن اس میں تمازت نہ ہو

ان چھتوں کی سروں کو ضرورت ہی کیا
گھر کے لوگوں کی جن سے حفاظت نہ ہو

ایسی باتیں نصابوں میں محفوظ ہیں
سب سے ملیے مگر کچھ ضرورت نہ ہو

آج کی بھی ملاقات ادھوری نہ ہو
آج بھی اس کے گھر کوئی دعوت نہ ہو

جیسے پھل کی دکاں میں ہوں چھلکے سجے
جیسے چابی کی گڑیا ہو عورت نہ ہو

سارا منظر سمٹ آئے آنکھوں میں یوں
سامنے دن کی لمبی مسافت نہ ہو

دھوپ دہلیز پر رکھ گئی ہے ہوا
دن نہ نکلے تو دن کی شکایت نہ ہو

وقار ناصری

آفت سے بچائے گی سدا ساتھ رہے گی
نکلے ہو سفر پر تو دعا ساتھ رہے گی

رک جائے گی رستے کے کسی موڑ پہ تھک کر
کچھ دور درختوں کی ہوا ساتھ رہے گی

کہتے ہیں کہ برسے گی کہیں اور نہ جا کر
سنتے ہیں کہ اس بار گھٹا ساتھ رہے گی

گھبرائیں گے تنہائی کے جنگل میں اکیلے
مجھ کو تری یاد سدا ساتھ رہے گی

مرنے کے لیے کوئی بہانہ تو رہے گا
ہر گام پہ جینے کی سزا ساتھ رہے گی

نصیر پرواز

تصویر ہے دھندلی مری موہوم ہے خاکہ مرا
صحرائے احساسات میں گم ہو گیا ذرّہ مرا

تحریرِ باطل بن گئی اجلے صحیفوں کی زباں
لکھا در و دیوار پر جب وقت نے چہرہ مرا

جلتی ہوئی سانسوں کو یقیں امن و اماں کی خواہشیں
خورشید سے ٹکرا گیا اس دھوپ میں سایہ مرا

میں بے یقین ذات کی محدود تر دُنیا میں تھا
ٹوٹا جو میری روح سے ٹکرا کے اندیشہ مرا

موسم نے میری خاکِ دل دستِ صبا کو سونپ دی
مٹی رہی ہستی مری بڑھتا رہا رتبہ مرا

جو کچھ ہوں اپنے آپ میں ہوں ایک شاعر بے خبر
کوئی بھی ان حالات میں کہتا نہیں نغمہ مرا

ہر آنکھ فکرِ خواب میں ہر جسم گہری سوچ میں
اب کوئی بھی تکتا نہیں اس شہر میں رستہ مرا

دو چار چھ الفاظ تک جس کی رسائی ہے ابھی
کرتا ہے اپنے ذہن کی وسعت سے اندازہ مرا

سب کو وہ میداں بجر و بے روح بے آواز ہے
جس دن حدودِ فکر میں بیدار تھا لمحہ مرا

ڈرتا ہوں اپنے آپ سے خود منحرف ہو جاؤں گا
اے کاش کوئی توڑ دے بے نور آئینہ مرا

میں بے اماں و بے یقیں پرواز خود کی زد میں تھا
بنتا تھا آنسو مجھے پیاسا تھا آئینہ مرا

آمنہ صدیقی

عکس بے موسم کا آنکھوں میں اُترتا جائے گا
لمحہ لمحہ زہر شریانوں میں بھرتا جائے گا
روشنی کی سب لکیریں دھند میں کھو جائیں گی
ایک طیارہ پہاڑوں سے گزرتا جائے گا
بے خطر قہرِ ہوا کی آزمائش سے گزر
اب یونہی شیرازۂ ہستی بکھرتا جائے گا
خواہشیں بن جائیں گی لاسمت زینے کی تلاش
رفتہ رفتہ جسم دلدل میں اُترتا جائے گا
دھوپ میں رکھ اسے اب بند کو صندوق میں
شبنمی احساس ہر صورت میں مرتا جائے گا
تول مت چالاک بنیے کی ترازو میں اسے
ورنہ دل ہر صاف گوئی سے مکرتا جائے گا
فکر کے جنگل میں ہے آمر حو لمحہ سرگراں
پیش گوئی شہرِ آئندہ کی کرتا جائے گا

سحر سعیدی

کیا روز و شب تھے کیسا وہ عہدِ شباب تھا
اس کی گلی کا سنگ بھی تازہ گلاب تھا
اُس حُسنِ بے مثال کی تعریف کیا کریں
آنکھیں حسین جمیل تھیں چہرہ کتاب تھا
ہر سوچ سُرخیوں میں بھٹکتی رہی مگر
ہم جس کے تھے اسیر وہ پلکوں کا خواب تھا
خلوت میں جو اُڑی تھی مشامِ ہوس رہی
مہکا تھا جو بدن میں لہو کا گلاب تھا
کیوں آج اس کو سب نے فراموش کر دیا
کل تک وہ ایک شخص جو عزت مآب تھا
ہر روز یوں بکھرتا رہا ہوں ورق ورق
میرا وجود جیسے پرانی کتاب تھا
جب تک نہ مجھ سے اُس نے سحر کھل کے بات کی
کیسے بتاؤں ذہن میں کیا اضطراب تھا

سید ارشاد حیدر

مٹا مٹا سا پُر اسرار نقش کس کا ہے
غبارِ فکر کے اس پار نقش کس کا ہے
چھپے جو دھند میں دیکھوں دریچے سے
پسِ نظارہ شرربار نقش کس کا ہے
کٹے ہیں ہاتھ لبوں پر ہے مہرِ خاموشی
بتائیں کیسے کہ شہکار نقش کس کا ہے
مکاں میں گونج رہی ہے یہ سرد سرگوشی
کھنڈر میں ہے در و دیوار نقش کس کا ہے
یہ لمحہ لمحہ اترتے سفید منظر میں
بتا اے چشمِ گرفتار نقش کس کا ہے

عبدالحمید

مجھے چلتے چلتے گماں سا ہوا
سرِ دشت کوئی عیاں سا ہوا
بسائی گئیں مجھ کو تنہائیاں
کھنڈر بنتے بنتے مکاں سا ہوا
کسی بات پر قہقہہ مارتے
یکایک شعورِ زیاں سا ہوا
چٹانوں کے نیچے وہ دبتا گیا
صدا در صدا رائیگاں سا ہوا
کوئی موڑ آئے، کوئی موت ہو
یہ قصہ تو اب داستاں سا ہوا

دیوِندر گوتم

جسے کھویا اسی کو پا رہا ہوں
گزشتہ وقت کو دہرا رہا ہوں
امیدوں کے گھروندے پھر بنا کر
میں اپنے آپ کو بہلا رہا ہوں
درختوں کا کہیں سایہ تو ہوگا
بہت لمبے سفر سے آ رہا ہوں
کسی کی بددعاؤں کا اثر ہے
ہر اک رستے پہ ٹھوکر کھا رہا ہوں
چھپائے دل میں اپنی تشنگی کو
سمندر کی طرح لہرا رہا ہوں
طلسماتِ تصوّر دیکھ کو تم
خیالوں میں الجھتا جا رہا ہوں

پروین کمار اشک

وہ کیوں پیدا ہوا؟ سوچا نہیں ہے
کہ زندہ ہے مگر زندہ نہیں ہے
ہوس کے جال میں پھنس تو گئے ہو
نکلنے کا کوئی رستہ نہیں ہے
سُنا ہے ساتھ رہتا ہے وہ میرے
مگر میں نے اسے دیکھا نہیں ہے
مروّت کی تجوری بند رکھنا
یہ سکہ شہر میں چلتا نہیں ہے
جو دانہ ڈھونڈنے نکلا تھا گھر سے
وہ پنچھی آج تک لوٹا نہیں ہے
وہ اُس کا آخری بار اشک ملنا
وہ منظر آج تک بھولا نہیں ہے

روف گیاوی

رات خاموش ہے تو گونگے سب
ایک ہی شاخ پہ پرندے سب
ربط بہتا ہے پانیوں کی طرح!
خون ہوتے نہیں ہیں گاڑھے سب
رُخ ہواؤں کا کون پھیرے گا
کیوں بدلتے ہیں گھر کے نقشے سب
ذائقہ لب کو چھو سکا بھی نہیں
پیٹ میں گھُل رہے ہیں لقمے سب
آئینہ آپ سے نہیں کہتا
آپ سچے ہیں اور جھوٹے سب
تھی ہوا کی سبک روی ایسی
سر جھکائے تھے پیڑ پودے سب
پیٹھ پہ! اشتہار لکھتے تھے
پڑھ رہے ہیں ہمارے چہرے سب

کمار پاشی

پل ہی پل میں زیست کے سارے نشاں گم ہو گئے
ہر طرف اُجڑے مکیں ہیں اور مکاں گم ہو گئے
ظلمتوں کے ہم سفر ہیں صبح کے پیغام سب
رات کے پچھلے پہر دے کر اذاں گم ہو گئے
زیست کا لمبا سفر ہے اور تنہائی کی رات
ہم قدم تھے جو نہ جانے وہ کہاں گم ہو گئے
بھول جا اب ان کو جو تاریکیوں میں رہے
آ انھیں ڈھونڈیں جو زیرِ کہکشاں گم ہو گئے
دھرتیوں پر اب نہیں محفوظ سا گوشہ کوئی
سر پہ جو سایہ فگن تھے آسماں گم ہو گئے
وہ کہ آنا تھا جنھیں پاشی ظفرمندی کے ساتھ
وہ جو گزرے تھے اِدھر سے کارواں گم ہو گئے

سب ٹھیک ہے

شرون کمار ورما

میں لان میں کھڑا ہوں۔

باہر کی تمام بتیاں بند ہیں۔ سڑک پر جامن کے پیڑ کے پیچھے کارپوریشن کی ٹیوب جل بجھ رہی ہے ایسا تقریباً ڈھائی سال سے ہو رہا ہے۔ کلب میں اس کا ذکر میں نے شہر کے چیف الیکٹریکل انجینئر سے کیا تھا۔ اُس نے مسکرا کر ساری ذمہ داری نچلے عملے پر ڈال دی اور مسز شرما کی طرف بڑھ گیا، جس کے بدن کی وولٹیج اُس شام کچھ زیادہ ہی تھی۔

جسم کا بوجھ ایک سے دوسرے پانو پر بدلتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ کیا کروں، یوں تو کرنے کو بہت کچھ ہے، یعنی اندر جا کر ٹیلی ویژن پر کوئی پروگرام دیکھا جا سکتا ہے، کلب جا کر وسکی پی جا سکتی ہے، رمی کھیلی جا سکتی ہے، بیوی بچوں کے ساتھ جا کر آئس کریم کھائی جا سکتی ہے یا منسٹروں کے وہ بیان پڑھے جا سکتے ہیں، جو وہ اپنی رعایا کو بیوقوف بنانے کے لیے دیتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ سب بہُت عامیا سی معلوم ہوتا ہے، لگتا ہے اپنے آپ سے جھوٹ بول رہا ہوں، خود کو دھوکہ دے رہا ہوں، ان سب باتوں میں من نہیں لگتا بس اوپر اوپر سے شریک ہوتا ہوں، جیسے کسی دور کے رشتہ دار کے جنازے میں شامل ہوں۔

کچھ فاصلے پر، املا کے پیڑ کے پاس کرسی پڑی ہے۔ اگر میں یہ فاصلہ طے کر لوں تو آرام سے بیٹھ سکتا ہوں، لیکن جسم کا بوجھ اٹھانے سے

نہ سکتی ہیں، لیکن لگتا ہے مجھ سے یہ فاصلہ طے نہیں ہوگا۔ ابھی کچھ دن ہوئے میں اپنے دفتر میں اکیلا بیٹھا تھا۔ میری نظر ٹیبل کلنڈر پر پڑی، دیکھا تاریخ نہیں بدلی گئی تھی، میں پریشان سا دیکھتا رہا، سوچتا رہا، ہاتھ بڑھا کر تاریخ نہیں بدل سکا، یہی سوچتا رہا کہ یہ کام مجھ سے ہوگا نہیں جب بھی میں کچھ کرنا چاہتا ہوں تو کر نہیں پاتا، جیسے سب کچھ میرے اختیار سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔

میری بیوی کلپنا ٹیلی فون پر کسی سے باتیں کر رہی ہے وہ خوش نظر آتی ہے شاید کسی پارٹی یا ویلفیر سوسائٹی کی میٹنگ کی بات ہو رہی ہے، وہ ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو مدعو کرنا چاہتی ہے، حالانکہ وہ مجھے کئی بار کہہ چکی ہے کہ مسز ڈپٹی کمشنر بیہودہ عورت ہے، لیکن اب وہ اسے ملنے پر زور دے رہی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے منع کر دوں کہ کبھی تو اپنے آپ سے بھی سچ بولا کرو، لیکن ایسا کر نہیں پاتا۔

کچھ برسوں سے ایسا ہو گیا ہے کہ وہ ایک دم سوشل ہو گئی ہے اس میں اُن روپوں کا بھی ہاتھ ہے جو میں ہر شام لا کر اس کے ہاتھ پر رکھتا ہوں، منبرو کی رقم میں نبھا چاہتا ہوں کہ رشوت کے روپے نہ لوں لیکن لے لیتا ہوں، لینے پڑتے ہیں، انکم ٹیکس افسر لگتا ہے، بیوپاری دینا چاہتا ہے، اور وہ دونوں میرے بس کے نہیں، میرے پاس اس طرح وقت اور پیسے دونوں کی بہتات ہو گئی ہے، میں فاضل پیسے سے فاضل وقت میں وہسکی پیتا ہوں اور دوسروں کی بیویوں کے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہوں اور کلپنا وہی مجبوراً سوشل ہو گئی ہے، اور کرے بھی کیا بیچاری۔ ہمارے دونوں بچے انل اور انجنا بڑے ہو چکے ہیں، ان کی دیکھ ریکھ ختم ہوئی، گھر کے کام کے لیے مائی، نوکر اور سوئیا ان سب سہولتوں کے ہوتے ہوئے ہم اگر سوشل نہ ہوں تو اور کیا کریں۔

ہمارے نوکر رام دین کے کوارٹر سے ڈھولک اور مجیرے پر لہک لہک کر آلھا اودل گانے کی آواز آ رہی ہے، میں سوچتا ہوں کہ اندھیرے میں کھڑے کھڑے میں گانے لگوں۔ لیکن میں من مار لیتا ہوں، میرے دونوں بچے ہنستے ہیں، کہتے ہیں "ڈیڈی، یہ اتنا پرانا گیت مت گایا کریں۔"

مجھے دکھ ہوتا ہے، لیکن میں ہنس کر کہتا ہوں "بیٹے یہ گیت نہیں ہے، ایک عظیم نظم ہے اور عظیم چیزیں کبھی پرانی نہیں ہوتیں، انل اونچی آواز میں ہنسنے لگتا ہے اور انجنا

اگاتھا کرسٹی کا ناول لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ 'ڈیم اِٹ ڈیڈی' اور میں اسے کیا اپنے آپ کو بھی 'ڈیم' کر دیتا ہوں، میری بیٹی بتاتی ہے کہ اگاتھا کرسٹی عظیم فن کار ہے۔

میری بیٹی انجنا غصے میں بھری باہر آ گئی ہے۔

"ڈیڈی، رام دھن کو منع کیجیے، کیا شور مچا رکھا ہے ان لوگوں نے۔"

میں رام دھن کے کوارٹر کی طرف دیکھتا ہوں۔ آخر ایک ترکیب سمجھ میں آتی ہے۔

"ایسا کرو، تم اُسے بازار بھیج دو، ذرا دُور بھیجنا۔"

یہ نکتہ انجنا کی سمجھ میں آ گیا ہے کہ وہ ایک دم خوش ہو گئی ہے۔

رام دھن کی ڈھولک اندھیرے خاموش ہو گئے ہیں۔ آلا اودل اپنے تمام تر کارناموں کے ساتھ سناٹے کے سمندر میں ڈوب گئے ہیں۔ زور سے کار کی بریک لگنے گولی چلنے اور ایک خوف زدہ عورت کی چیخ کی آواز آتی ہے۔ ٹیلی ویژن پر کوئی امریکی سیریل چل رہا ہے۔

ٹی۔ وی، ہمارے گھر میں اس لیے نہیں آیا کہ اس کے بغیر جینا ناممکن ہو گیا تھا، ٹھوس وجہ یہ ہے کہ آس پاس کے تمام بنگلوں پر جب اینٹینا کھڑے ہو گئے تو انل اور انجنا کو اپنی چھت خالی اور سونی سی لگنے لگی اور کلپنا کو اپنی ملنے جلنے والیوں کو منہ دکھانا مشکل ہو گیا۔ کلپنا نے ٹی۔ وی پسند کیا، میں نے بل ادا کر دیا۔ برسوں سے ایسا ہی ہوتا آ رہا ہے۔ بچّے یا کلپنا چیز پسند کر کے لے آتے ہیں، میں بل ادا کر دیتا ہوں، یوں بھی شادی کے بیس برسوں کے بعد رشتہ اور رہ بھی کیا جاتا ہے۔

"ساب، بتّی جلا دوں؟" رام دھن کو میرا اندھیرے میں کھڑے ہونا شاید اچھا نہیں لگا ہے۔

"نہیں۔"

جاتے جاتے وہ کرسی میرے قریب رکھ گیا ہے اور میں یوں بیٹھ گیا ہوں جیسے اور کوئی چارہ نہ ہو۔ انل کے کمرے سے شور اٹھ رہا ہے۔ اس کے کچھ دوست آئے ہوئے ہیں، ہاہا، دھپ دھپ، سی سی، قسم کی آوازیں نکالتے کو وہ انجوائے کرنا کہتے ہیں اور اس وقت وہ انجوائے کر رہے ہیں۔ ایک بار میں نے انل سے کہا "انل،

تم بجائے یہ بھیڑ اکٹھی کرنے کے، اکیلے بیٹھ کر گٹار بجایا کرو، تم جس تنہائی کو اس شور شرابے سے بھرنے کی کوشش کرتے ہو، وہی تنہائی کا احساس تمہارے نغموں میں جان ڈال دے گا۔ کبھی کبھی تنہائی اور اُداسی بھی فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔"

"اسے بھی دیوداس بنا دو، کسی پارو کے چکر میں ڈال دو۔" کلپنا ڈریسنگ ٹیبل سے بولی تھی۔ وہ کلب کے لیے تیار ہو رہی تھی اور آئینے میں انڈوں پر بیٹھی مرغی کی طرح نظر آ رہی تھی۔

"اب پارو نہیں ہوتی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"ڈیڈی یو آر گیٹنگ اولڈ۔" انل نے ہنس کر کہا تھا اور ماں سے پیسے لے کر فلم دیکھنے چلا گیا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ پہلی رات کو میں نے کلپنا سے کچھ دل کی باتیں کی تھیں۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ بہت پہلے میں نے ایک لڑکی کو چاہا تھا لیکن میری چاہت گرمیوں کی جھلستی دوپہروں میں کو کتے پپیہے کی جھلس گئی اور وہ لڑکی مجھ سے بات کیے بنا سُسرال چلی گئی اور جب میں نے اُسے دوبارہ دیکھا تو اس کی گود میں بچہ تھا اور وہ مکمل عورت بن چکی تھی۔ تب تو کلپنا صرف مسکرا دی تھی، لیکن جب اُس کا گھونگھٹ پوری طرح اُٹھ گیا اور لال چوڑیاں اُتر گئیں تو اس نے اس بات کو ہتھیار بنا کر میرے ہی خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔ پہلے پہلے تو میں احتجاجاً اُٹھ کر چلا جاتا تھا، دھیرے دھیرے مسکرانا سیکھ لیا اور اب تو شراب پینے لگتا ہوں۔

"ساب میز لگا دوں؟" رام دھن پھر آ گیا ہے۔

"لگا دو۔" میز لگانے کا مطلب ہے، بوتل، گلاس، برف اور کچھ نمکین۔

دیر تک فون پر ہنسنے اور باتیں کرنے کے بعد کلپنا باہر آ گئی ہے۔ آتے ہی اس نے برآمدے اور لان کی تمام بتیاں روشن کر دی ہیں۔

"مجھے اندھیرا اچھا نہیں لگتا۔"

وہ اکثر ایسا ہی کرتی ہے، جو اسے اچھا لگتا ہے۔ مجھ پر لادنے کی کوشش کرتی ہے۔ میری رائے بعد میں لیتی ہے، جیسے کوئی رسم پوری کر رہی ہو، میں اب ان باتوں کا بُرا نہیں مانتا، یہ سب بہت چھوٹی اور معمولی باتیں ہیں، ایڈجسٹمنٹ

بھی تو کوئی چیز ہے۔

مام دعن ٹرالی میں بوتل، گلاس، برف، نمکین لے آیا ہے۔

"اب تو تم کہیں جاؤ گے نہیں،" کلپنا منہ بنا کر کہتی ہے۔

"تھوڑا سا پنیر تل کر بھیج دو۔"

"تم مجھے یہاں سے اٹھانا چاہتے ہو۔"

شاید میں نے لاشعور میں یہی سوچا ہو، لیکن میں مسکرا کر اس کے برعکس کہتا ہوں۔ ویسے یہ مان لینے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ اپنے اور صرف اپنے ساتھ اور یہ خوبصورت لمحے مجھے صرف اس وقت میسر ہوتے ہیں جب میں تنہا بیٹھ کر وہسکی پیتا ہوں یا پڑھتا ہوں، وہ کتابیں جو میں نے ایک ایک کر کے اکٹھی کی ہیں کتابوں کے ساتھ مجھے اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے ورنہ میں، کہاں ہوتا ہوں، مسٹر کپور، ڈیڈی یا صاب ہوتا ہوں۔ ایک ایسا خود غرض، جھوٹا، بے ایمان اور گھٹیا شخص، جس سے مل کر تو اکثر خود مجھے دکھ ہوتا ہے، لیکن کیا کروں، یہ شخص بھی میرے لیے اتنا ہی ضروری ہو چکا ہے جتنا وہ جسے میں نے کتابوں کے ساتھ الماری میں کبھی کا بند کر دیا ہے۔ اور جس پر گرد جم گئی ہے۔ اس کی بات میں کسی سے نہیں کر سکتا، کوئی سمجھتا ہی نہیں، نہ کلپنا نے اسے سمجھا اور نہ انل اور انجنا نے۔ کلب کے ساتھی تو اسے قطعی نہیں جانتے۔ میں اگر اس کا تعارف اُن لوگوں سے کراؤں تو وہ مجھے پاگل کہنے لگیں گے۔ رہ گیا ایک میں تو جب فائلوں، مؤکلوں اور بلوں سے فارغ ہوتا ہوں تو اسے نکال کر جھاڑ پونچھ لیتا ہوں اور سامنے بٹھا کر باتیں کرتا رہتا ہوں اور وہ تمام وقت ہنستا رہتا ہے۔ مجھے اس کی یہی ادا پسند نہیں اور میں اسے پھر کتابوں کے ساتھ الماری کی گرد کے حوالے کر دیتا ہوں اور خود کلپنا کے ساتھ کلب چلا جاتا ہوں اور وہسکی اور رقص میں ڈوب جاتا ہوں۔

کلپنا کار میں میرے ساتھ بیٹھی فخر سے کہتی ہے، میں نہ کہتی تھی زیادہ دیر اکیلے نہیں رہ سکو گے، اور میں اُس کے پھیلے، ڈھلکتے جسم کو دیکھتا ہوں اور چپ رہتا ہوں۔ کلب میں وہ عورتوں کی ٹیبل پر چلی جاتی ہے اور میں مردوں کی۔ واپسی پر میں نشے میں ہوتا ہوں اور موڈ میں بھی اور وہ مجھ سے کئی شرطیں منوا لیتی ہے۔ اور رات کو ہم ڈبل بیڈ پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ اسے ساتھ لیٹے دیکھ کر میں سوچتا

ہوں، کسی پرانے شہر میں آگیا ہوں اور اکثر گھبرا کر کتابوں کی الماری کے سامنے جاکر کھڑا ہوتا ہوں۔

"تمھیں شاید معلوم نہیں کہ تمھاری دیکھا دیکھی انل بھی پینے لگا ہے۔" وہ کہہ رہی ہے۔

"معلوم ہے۔"

"اور تم نے اسے منع نہیں کیا۔"

"میرے پتا جی نہیں پیتے، انھوں نے مجھے منع کیا تھا، جب ہم اپنا آبائی گھر چھوڑ کر آنے لگے تھے، تب بھی انھوں نے منع کیا تھا اور جب ــــــ"

"رہنے دو رہنے دو، اب کہوگے کہ تمھیں میں وہاں سے نکال لائی۔" وہ چڑ گئی۔ "وہاں چوتھی منزل کے ایک کمرے میں پڑے پڑے یہ بات بھی نہ بنتی۔"

"پنیر پر ادرک رکھ دینا۔"

"رکھ دوں گی۔" وہ تلملا گئی ہے اور غصہ سے بھری چلی گئی ہے۔

جامن کے پیڑ میں کوئی پرندہ پھڑپھڑا کر رہ گیا ہے۔ وہ ٹیوب جل بجھ رہی ہے۔ میں نے تمام بتیاں پھر بجھا دی ہیں۔ کلپنا ناراض ہو گئی ہے، میں کیا کر سکتا ہوں، میں تو یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اکثر باتیں بے معنی ہوا کرتی ہیں۔

انل کے دوست باہر آ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ مہذب ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خیر، یہ بھی ٹھیک ہے، ورنہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ انل، میرے پاس آکر کہتا ہے:

"ڈیڈی ہم لوگ باہر ہی کھانا کھائیں گے، میں دیر سے آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے بڑا پیگ بنا لیا ہے۔

وہ لوگ شور مچاتے چلے گئے ہیں۔ سڑک پر اُن کی بے ہنگم آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ میں انل سے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ میرے پاس بیٹھے، باتیں کرے، کھانا میرے ساتھ کھائے، لیکن کچھ نہیں کہا جاتا، بس وہی ٹھیک ہے، اوکے اوکے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں اور میں کچھ کر نہیں پاتا، جیسے دریا کا تیز بہاؤ کنارہ کاٹ رہا ہو۔

کلپنا کی دو سہیلیاں آگئی ہیں اور وہ تینوں خوب ہنس رہی ہیں۔
انجنا بھی باہر آگئی ہے، اُسے بھی شکایت ہے کہ میں اندھیرے میں کیوں بیٹھا ہوں۔

"اچھا لگتا ہے بیٹے۔"
"آپ بھی بس اُلٹے ہی ہیں ڈیڈی۔"
"ٹھیک ہے۔" میں ہنس دیتا ہوں کہ کسی کو پُرانا اور کسی کو اُلٹا لگتا ہوں، اُس دن کیا ہو گا جب میں انھیں غیر ضروری لگنے لگوں گا۔
"ڈیڈی، میں پریا کی طرف جا رہی ہوں۔"
"اکیلی۔"
"پھر کیا ہوا!"
"رام دھن کو ساتھ لے جاؤ۔" میں کہتا ہوں، میں نہیں، خوفزدہ باپ، کہتا ہے۔ شہر میں لاقانونیت ہے۔ لگتا ہے کہیں کوئی حکومت نہیں رہ گئی ہے، جو جس کا جی چاہتا ہے کر رہا ہے، ہر وقت دہشت سی چھائی رہتی ہے، لگتا ہے ابھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا، کوئی زبردستی میرے گھر پر قابض ہو جائے گا، میں قتل کر دیا جاؤں گا، یا سرِ بازار بے عزت کیا جاؤں گا۔ میں نے اپنے اس خوف اور خدشہ کا ذکر پولیس کپتان سے کیا تھا۔ اُس نے ہنس کر ٹال دیا تھا اور ایران کے سیاسی حالات پر تبصرہ کرنے لگا تھا۔ چیف الیکٹریکل انجنیئر نچلے عملہ کو ذمّہ دار ٹھہراتا ہے، نچلا عملہ افسران کے خلاف کہتا ہے، منسٹر صاحبان کہتے ہیں۔ ڈیموکریسی بحال کر دی گئی ہے، پتہ نہیں خرابی کہاں ہے!

ڈاکٹر شرما، چار پیگ چڑھانے کے بعد، خرابی میرے ذہن میں تلاش کرتے ہیں۔ اگر سڑک کی ایک ٹیوب نہیں جلتی، کوئی لفنگا کسی عورت کا پرس یا لاکٹ لے کر بھاگ جاتا ہے تو اس میں میرا کیا بگڑتا ہے۔ مسز گپتا شرما کی بھی یہی رائے ہے۔
رام دھن انجنا کو چھوڑ کر آگیا ہے۔
"ساب، ہم پکچر دیکھنے جا رہے ہیں۔"
"ٹھیک ہے۔"

اندر سے تینوں عورتوں کے قہقہے سُنائی دے رہے ہیں، میں تین پیگ پی چکا ہوں جو تھا گلاس میں ہے، سوچ رہا ہوں، نہ پیتا تو کیا بگڑ جاتا، اب کھا پی کر سو رہوں گا، صبح لیموں پانی، ڈامن پی اور پھر سُستی ———

"رام دھن ۔" کلپنا پکارتی ہوئی آگئی ہے۔

"وہ پکچر دیکھنے گیا ہے ۔"

"اور یہ نیچے ۔"

"انل دوستوں کے ساتھ گیا ہے، کھانا باہر کھا کر آئے گا، انجنا پریا کے گھر گئی ہے، دیر سے آئے گی، پریا کا بھائی اُسے چھوڑ جائے گا۔"

"یہ گھر ہے کہ کیا ۔"

"پتہ چل جائے تو مجھے بھی بتا دینا ۔"

"شراب تمھارا ناس مار دے گی۔ کبھی سوچا ہے کہ لڑکی اب جوان ہو رہی ہے۔"

"ہاں، کئی بار سوچا ہے ۔"

"پھر؟"

"پھر؟"

کلپنا کی دونوں سہیلیاں بھی باہر آگئی ہیں ۔

"میں ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی جا رہی ہوں، کار کی چابی کہاں ہے!"

"میز پر ۔"

وہ چابی لے آئی ہے اور وہ تینوں کار لے کر چلی گئی ہیں۔

اب گھر میں سکون ہے اور مجھے الماری میں بند کتابوں کا خیال آرہا ہے۔ گلاس میز پر چھوڑ کر میں اندر آگیا ہوں۔ انل کے کمرے میں کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں ہے، پلنگ کے نیچے بیر کی خالی بوتل پڑی ہے، ٹرانسسٹر آن ہے۔ میز پر اُس کی گرل فرینڈ کے دو خط پڑے ہیں۔ میں سوچتا ہوں انل کی زندگی میں یہ لاپرواہی اور بے ترتیبی کیوں ہے۔ انجنا کے کمرے میں اگا تا کرسٹی، بھری ہوئی ہے۔ کلپنا کے کمرے میں دوا فروش کا سامان پڑا ہے۔ ان دنوں اُسے وزن کم کرنے کی فکر لاحق ہے میں نے الماری سے اولڈ مین اینڈ دی سی، نکال لی ہے۔ تبھی سڑک پر ہارن بار بار بج اُٹھتا ہے۔ کوئی میرے دروازے

ہے شاید۔

پھر باہر آگیا ہوں ۔ مسز گپتا شرما رہی ہے۔ کھلی مسکرا رہی ہے۔

"کیا بات ہے، آپ کچھ اکھڑے اکھڑے سے لگ رہے ہیں۔

"ایسا ہے؟" میں ہنسنے کی کوشش کرتا ہوں۔

"آئیے کلب لے چلوں"

"نہیں، گھر کیا ہے"

وہ کھِل کر ہنس دی ہے اور کار بڑھا لے گئی ہے۔

میں اندھیرے میں کھڑا ہوں۔ اندر فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی ہے۔ کیا کروں۔

گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیتا ہوں۔ اور گلاس لیے اندر جاتا ہوں۔

دوسری طرف چیف الیکٹریکل انجنیئر ہے۔ پوچھ رہا ہے۔

"کلب نہیں آئے، سب خیریت ہے نا؟"

"سب ٹھیک ہے" کہہ کر میں فون بند کر دیتا ہوں۔

اب پھر باہر اندھیرے میں کھڑا ہوں۔ سڑک کی ٹیوب جل بجھ رہی ہے۔ ایسا تقریباً ڈھائی سال سے ہو رہا ہے۔

●●

مشفق مجیبی کی دیوانگی کے پیچھے ذہنی اور ٹینشن سے ہوتے ہوئے جمنا اور گنگا کے ساحلوں تک پہونچ چکے ہیں۔ ممکن ہے اس کے اردگرد سے مشفق افرادوں کی گرد اور اس کے درد بھرے اشعار کی گہری آنچ کو دراوڑیوں کی دھرتی پر بسنے والوں نے بھی محسوس کیا ہو۔

معلوم نہیں مجیبی نے دیوانگی پہلے اختیار کی یا شاعری لیکن اس کی غزلوں کے مطالعہ سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی رُوح کسی دُور دراز محل کے تہہ خانے میں بند ایک ایسے پرندے میں قید ہے جس کی گردن کو کسی انجانی قوت نے دبوچ رکھا ہے۔

دُکھ کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ یہ کوئی ایسی سیال شے بھی نہیں جیسے کسی سانچے میں ڈھال کر کوئی پیکر خلق کر لیا جائے کہ جس کی ہر شخص شناخت کر سکے۔ دُکھ تو ازل سے بے شناخت ہے لہٰذا اس بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا کہ مجیبی کے دل میں کون سا دُکھ پرورش پا رہا ہے، لاحاصل ہوگا۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ اس کے اشعار میں درد کا جو گہرا مہیب سمندر سانس لے رہا ہے، وہ ہمیں کس حد تک اپنی طرف کھینچ سکنے کی قوت رکھتا ہے۔

اب اگر اس دُکھ کا مداوا مجیبی اپنے خارجی نواح میں تلاش کرتا ہے یا کبھی لمحہ بھر کی سرشاری خرید لیتا ہے تو یہ اس کے معصوم ہونے کی دلیل ہے۔ اسے شاعرانہ پوز کہنا صحیح نہیں ہوگا۔

مجیبی کی داخلی دُنیا ویران نہیں بلکہ درد و غم کے اشجار سے سرسبز و شاداب ہے اور اس کا ثبوت اس کی غزلوں کے اشعار ہیں جن میں زندگی کی دھڑکنیں صاف سُنائی دیتی ہیں۔ لگتا ہے وہ پل پل اس انجانی قوت سے ٹکرا رہا ہے، جس کے مضبوط ہاتھوں میں اس کی رُوح بھینچ رہی ہے، اس سے رہائی ممکن ہو یا نہ ہو یہ مسئلہ اہم نہیں اہم بات تو یہ ہے کہ مجیبی کو سیات خور طاقتوں سے لڑنے اور زندگی کرنے کا فن آتا ہے۔ اور جدید تر غزل میں اس کے وجود کو تسلیم کرنا شعری دُنیا کے ایک نئے گوشے کو دریافت کرنے کے مترادف ہے۔

ـــــــ سُکمار پاشی

چھ غزلیں

صدیق مجیبی

۱

راکھ ہوتے دن کو دیکھا اور ششدر رہ گیا
شام رخصت ہو گئی آنکھوں میں منظر رہ گیا

ایک خواہش اپنی ہی آتش میں خاکستر ہوئی
ایک سورج ابر کے ٹکڑے میں دب کر رہ گیا

جانے کس صحرا کی جانب اڑ گیا آبی پرند
جسم میں خوں کا سمندر سا چھلک کر رہ گیا

لے گیا سب کچھ بہا کر سیلِ تیغِ تند خو
ایک سر ایسا تھا نیزے کی انی پر رہ گیا

سب نے اس سے صلح کر لی سب کے چہرے شاد تھے
میں ہی تنہا ٹوٹ کر سینے کے اندر رہ گیا

دھو گیا موسم ہر اک دیوار و در سے خوں کے داغ
ایک دھبہ وقت کے ماتھے سے لگ کر رہ گیا

خوف و خواہش نے مجیبی کر دیا آخر دو نیم
نصف باہر بھی رہا ہوں نصف گھر پر رہ گیا

۲

گزرتے پانیوں پہ وقت کی لکیر بھی نہیں
کسی بھی معجزے کی اب کوئی نظیر بھی نہیں

خدا شکار آدمی، انا شکار آدمی!
اب آدمی میں کوئی صاحبِ ضمیر بھی نہیں

نظر کو دھند کھا گئی، دلوں کو خوف کھا گیا
زبانیں شل ہوئیں کہ کوئی حرف گیر بھی نہیں

سلگتے پتھروں پہ چپ عذاب سہہ رہے ہیں لوگ
کسی کے پاؤں شل نہیں کوئی اسیر بھی نہیں

ہر اک شجر کے ہاتھ پہ دھرا ہے کاسۂ طلب
تونگروں کے عہد میں کوئی فقیر بھی نہیں

غموں کا شب چراغ بھی نواحِ جاں میں بجھ گیا
بسیط تیرگی میں کوئی دستگیر بھی نہیں

غریبِ شہر کی نوائے ماتمی بھی سن کبھی
مری متاعِ کم بیاں بہت حقیر بھی نہیں

مجھے بھی کون دے صدا اتھاہ شب سکوت ہے
نوائے غیب بھی نہیں، کوئی بصیر بھی نہیں

۳

روشن ہے بادبان ہوا مہرباں ہے چل
موجِ بلا ہے خفتہ سفینہ رواں ہے چل

سینے میں آگ بھر لی پہ ٹھنڈک نہ کم ہوئی
اے شوقِ نامراد جہنم کہاں ہے چل

دشتِ سراب و سنگ میں سایہ نہ کر تلاش
فکرِ نجات حوصلۂ رائیگاں ہے چل

اس وقت آفتاب سا چہرہ بھی گرد ہے
چاروں طرف کثیف دھواں ہی دھواں ہے چل

مدت کے بعد درد کا دریا ہے موجزن
اے خانۂ خیال طبیعت رواں ہے چل

یہ طوقِ تشنگی بھی مجھی اُتار پھینک
اک تیرِ بے خطا جہاں زیبِ کماں ہے چل

۴

گردِ نجوم دُور تلک چھوڑ جاؤں گا
اپنا نشاں فلک بہ فلک چھوڑ جاؤں گا

ہاتھوں سے دوستوں کے میں ہو جاؤں گا شہید
سینے میں دشمنوں کے کسک چھوڑ جاؤں گا

بے نور جنگلوں میں نہ بھٹکے کوئی پرند
میں آسماں پہ اتنی چمک چھوڑ جاؤں گا

ہے وقت نقش گر تو کرے گا اسے تمام
قصے میں اپنے نوک پلک چھوڑ جاؤں گا

گر میں بلندیوں سے گرا مثلِ آبشار
سینے میں پتھروں کے دھمک چھوڑ جاؤں گا

میں سونپ جاؤں گا تمہیں اپنی بیاضِ درد
شیریں لبوں پہ ایک نمک چھوڑ جاؤں گا

مایوسیوں کے طاق پہ جل کر تمام شب
قصرِ وفا کو صبح تلک چھوڑ جاؤں گا

۵

خوف لٹنے کا نہ اس اندھے سفر میں رکھنا
پھر بھی تحفے کو سرے اپنی نظر میں رکھنا
خود سے ملنے کی تمنا میں بھلا دوں سب کچھ
ایسا گوشہ بھی کوئی شام و سحر میں رکھنا
اک گھٹا ٹوپ اُداسی لیے پھرنا دل میں
ایک سیلابِ بلا دیدۂ تر میں رکھنا
کب خزاں پھیر دے چپکے سے متاعِ بردہ
اک ورق اُجڑے ہوئے دل کے شجر میں رکھنا
مجھ کو دیکھے تو مرے خون کا پیاسا بن جائے
ایسا منظر بھی کوئی راہ گزر میں رکھنا
کچھ جو دیوار تو پڑتی ہیں نگاہیں سب کی
نقص کچھ جان کے بھی اپنے ہنر میں رکھنا
شب گزیدہ ہی کوئی ڈھونڈ کے بھی ساتھی
اب کے جگنو ہی سہی ساتھ سفر میں رکھنا

۶

یوں چُور دل کا آئینہ گھر کیسے ہو گیا
یہ معرکہ تو سخت تھا سر کیسے ہو گیا
شاخِ لہو سے برگِ نوا چُن رہا ہے کون
خوش فہم آشنا دستِ ہنر کیسے ہو گیا
سورج کو کس نے رکھ دیا میزانِ شام میں
یہ کج کلاہ خاک بسر کیسے ہو گیا
میں نے تو آسماں پہ چلایا نہیں تھا تیر
اپنے لہو میں آپ یہ تر کیسے ہو گیا
کس کی صدا پہ زخم پلک کھولنے لگے
دیوارِ احتیاط میں در کیسے ہو گیا
سب پوچھتے ہیں مجھ سے کبھی بتاؤں کیا
ویران شاخ شاخ شجر کیسے ہو گیا

دیمک

علی امام نقوی

ہڈیوں کے اس پنجرے پر گوشت پہلے منڈھا گیا تھا یا گوشت کے اس بیچ میں پنجرہ بعد میں رکھا گیا تھا اس کا اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ البتہ وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ وہ اس پنجرے اور اُس پر منڈھے گوشت میں گزشتہ اٹھائیس برسوں سے قید ہے۔

اپنی قید کے ابتدائی چند برس اُس نے یونہی گذارے۔ اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا۔ ہڈیوں کے اس پنجرے کو توڑ کر فرار ہو جانا اُس کے اختیار میں نہ تھا۔ حالانکہ اس نے فرار کی کوشش کئی مرتبہ کی تھی۔ جب جب اس نے ہڈیوں اور چمڑی کے حصار سے نکلنے کی کوشش کی یا اس کی خاطر اس نے اپنے وجود کو توڑا مروڑا تب تب ایک غیبی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”فضول ہے، ہر کام کے لیے ایک وقت متعین کر دیا گیا ہے! اور وقت سے پہلے ایک پتہ بھی اپنے مقام سے ہل نہیں سکتا۔ ہڈیوں کا یہ پنجرہ۔ اور اُس پہ منڈھا یہ گوشت ہی تمھارا مدفن ہے۔ اور اس میں تمھیں وقتِ معلوم تک کے لیے زندہ رہنا ہے! تا کہ تم . .

”تم خود ہی میری قید سے آزاد ہو جاؤ۔ اس مسلسل عذاب سے میں تنگ آ چکی ہوں۔“

وہ اس وجود کی آواز بخوبی سنا کرتی ہے جسے اُس کا مدفن قرار دیا گیا ہے۔ یہ مدفن دوسرے

مدفن سے منسلک ہونے کے بعد زمانے کے سرد و گرم کا شکار رہا۔ اس کے محافظ اپنی جاگیر کا وارث چاہتے تھے اور اس کی آمد کے آثار دُور دُور تک نہ تھے۔ کنوئیں کی بُری بُڑھی بیگم نے مدفن کے زیریں حصّے کو ٹٹولا، آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے، کھسر پھسر ہوئی اور پھر فیصلہ سُنا دیا گیا۔

"اب تک وارث کو آ جانا چاہیے لیکن . . .

اور اس لیکن سے آگے سوچنے کی ہمّت نہ اس مدفن میں تھی۔ نہ اس کے محافظوں، نہروائی کے محکمہ میں ملازم مدفن کا محافظ اپنی چھٹیاں گزار کر رخصت ہوا اور اس کے دائیں بائیں نے اُسے اُٹھا کر عجائب گھر کے منتظمین کے سامنے رکھ دیا۔ اس اُٹھنے، بیٹھنے، کھلنے اور بند ہونے میں ہڈیوں پہ منڈھا گوشت اپنی صحت کھوتا رہا۔ اس کا شمر رفتہ رفتہ پنجرے پر بھی پڑتا رہا۔ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے گوشت اور ہڈیوں کے پنجرے کی تدریجی کمزوری کا مشاہدہ کر رہی تھی۔ بار بار اس کی آنکھیں چمک اُٹھتیں، وہ اپنے کو توڑنے مروڑنے پہ تیار کرتی۔ لیکن وہی غیبی ندا اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ مدفن قطرہ قطرہ بہنے بھی لگے تب بھی تم اس سے آزاد نہ ہو سکو گی۔ وقتِ معلوم تک تمھیں یہیں رہنا ہو گا وہ اس فیصلہ کی سچائی پر ایمان کی حد تک یقین رکھتی تھی لیکن ایک اسیر کی زندگی گزارنا تو بھیڑ بکریوں کو بھی پسند نہیں ہے چہ جائیکہ . . .

لیکن مجبوری اُسے صبر پر مجبور کرتی رہی کہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اور کوئی صورت نہ تھی۔ وقت کی دیمک مدفن کو چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کرتی رہی۔ پنجرے پہ منڈھا گوشت سوکھ کر تیلیوں سے جا لگا۔ اُس نے سوچا، اب فرار ممکن ہے!

ایک مرتبہ پھر اُس نے اپنی تمام قوت جمع کی۔ پنجرے کے سر پر موجود دونوں سوراخوں کو دیکھا۔ اپنے وجود کو سکیڑا، سمیٹا اور . . .

اور پھر بے کراں وسعتیں اُس کے استقبال کو تیار تھیں۔ اٹھائیس برسوں کی طویل قید کے بعد آج وہ آزاد ہوئی تھی۔ اس کا وجود رُوئی کے گالے کی مانند پرواز کر رہا تھا . . . چڑیوں اور آہنی پرندوں سے بچتا، بچاتا . . . ادھر . . . اُدھر . . . اوپر . . . بہت اُوپر۔

اور جب وہ بالکل اوپر پہنچی تب اُسے یک گونہ اطمینان ہوا۔ اس نے سوچا۔ یہی تو میری منزل ہے۔ اٹھائیس برس پہلے یہیں کہیں سے میں چلی تھی اور آج . . . آج پھر آگئی وہیں پر . . . جہاں سے چلی تھی میں . . . ! اس بھیڑ میں . . . جہاں اس بھیڑ میں کتنے ہی چہرے میرے جانے پہچانے ہیں . . . اسے بھی میں جانتی ہوں . . . اور انھیں بھی . . . وہ جو اس گوشہ میں کھڑے ہیں میں اُن سے بھی واقف ہوں اور . . . اور یہ جو تیزی سے میری طرف بڑھی چلی آرہی ہیں یہ بھی میری شناسا ہیں . . . کیا نام ہے ان کا . . . ؟

"اے بہن کیا نام ہے تمھارا ؟
اس نے اسے روک کر اس سے نام دریافت کیا:۔

"بہن۔ کیا مطلب ہے اس لفظ کا ؟ اور . . . تم۔ کون ؟

"ارے تم مجھے نہیں پہچانتیں۔ میں مختار بانو کے مدفن میں دفن تھی۔ تم اس کی عیادت کو آیا کرتی تھیں۔

"مختار بانو، عیادت، مدفن ؟ کیا کہہ رہی ہو تم ؟ کون مختار بانو، کیسی اور کس کی عیادت ؟ یہاں تمھیں جتنے بھی چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے وجود نظر آئیں گے وہ سب کل تک کسی نہ کسی مقبرے میں قید تھے۔ ہم سب میں بس وہی ایک قدرِ مشترک ہے !

"تو پھر تم کون ہو ؟ کیا نام ہے تمھارا ؟

"یہاں اپنا کسی کا کوئی نام نہیں ہے۔ مقبروں اور مدفنوں کی اسیری میں ہم نے جو عمل کیے ہیں ہم ان ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہاں میں نے یہاں کے باشندوں سے یہ ضرور سُن رکھا ہے کہ ایک روز یہاں سب اپنی ماؤں کے نام سے بلائے جائیں گے۔

"ماؤں کے نام سے ؟"
وہ اپنی حیرت زدہ نظریں اُس پر مرکوز کرتے ہوئے پوچھتی ہے:

"لیکن کب ؟"

"پتہ نہیں پر سُنتی ہوں کہ اس روز تانبے کا گولہ سوا نیزے پر ہوگا"

"سوا نیزے پر ؟

"ہاں۔"

"مجھے یاد آرہا ہے! نیچے کہیں بہت نیچے۔ شاید وہاں، جہاں سے میں آئی ہوں اسی طرح کی باتیں ہوا کرتی تھیں کوئی دیوانہ کہا کرتا تھا۔ بلا کا حبس ہے سورج سوا نیزے پہ دکھا ہے!"

"ابھی کہاں۔ اُس منزل پہ آتے آتے اسے وقت لگے گا۔۔۔ بالکل مشینی انداز میں وہ دائیں ایڑی پہ گھوم جاتی ہے اور مخالف سمت میں چلنے لگتی ہے۔ وہ کچھ دیر مبہوت سی اس خنک ماحول کو تکتی رہی۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ بھی اسی طرف بڑھی۔

عجیب و غریب لوگ تھے۔ سب جوان، سب حسین، اور ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر۔ اپنی ہی فکروں میں غلطاں، ان کے چھوٹے چھوٹے محل نما مکانات، ان کی چھتوں پر انگور کی بیلیں۔ بادام، پستوں اور چلغوزوں کے پیڑ، انگور اک ذرا سا ہاتھ کو حرکت دیں اور خوشہ توڑ لیں۔

"ارے۔۔۔ یہ کیا۔۔۔"

ایک میٹھا میٹھا سا درد وہ اپنے پیٹ میں اٹھتا محسوس کرتی ہے۔ فوراً ہی وہ آگے بڑھتی ہے۔ چند ہی قدموں کے فاصلہ پر انگور کی بیلیں ہیں۔ بادام اور چلغوزے کے پیڑ ہیں وہ انگور کی بیل کے نیچے پہنچ کر ایک خوشہ کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔

"ہش۔"

ایک خوبصورت جوان اسے ٹوکتا ہے۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

"مجھے انگور کھانے ہیں۔"

"کیوں؟"

"مجھے بھوک لگی ہے۔"

"لیکن یہاں ایسا دستور نہیں ہے۔"

"تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا، کیا آپ بھوک کا علاج نہیں کر سکتے؟"

"کرسکتے ہیں، اور ہم صرف سوچتے ہیں کہ چلغوزے کھائیں اور ہمارا پیٹ [illegible]

سے بھر جاتا ہے، ہم سوچتے ہیں بادام کھائے جائیں اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے بادام کھائے ہیں۔

"یہ کیسے ممکن ہے ——؟ وہ حیرت سے دریافت کرتی ہے۔

"یہی تو یہاں ممکن ہے!"

عین اُسی وقت دو خوبصورت جوان ہاتھوں میں ایک ایک ضخیم سی کتاب لیے اُدھر سے گزرتے ہیں، وجیہہ جوان انھیں پکارتا ہے دونوں اُس کے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں، پھر حیرت سے اُسے دیکھتے ہیں۔

"ان کی بھوک چمک اُٹھی ہے، اور یہ انگور کا خوشہ توڑ کر دکھانا چاہتی تھیں۔ لیکن میں نے انھیں اس سے باز رکھا۔

"تم ہو تو یہیں کی —— لیکن یہاں کیسے آگئی ہو؟ ان میں سے ایک نے اُس سے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ . . . وہاں سے —— اس نے پلٹ کر گہرے کہرے کی سمت اشارہ کیا۔

"وہ . . . وہاں سے؟

"ہاں! میں وہیں سے آرہی ہوں۔"

"لیکن تمھیں داخلے کی اجازت کس نے دی؟

"ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔

اس کے جواب پر وہ دونوں خوبصورت جوان کسی نہ سمجھ میں آنے والی زبان میں گفت گو شروع کرتے ہیں پھر وہ دونوں ہی ان ضخیم کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ دونوں کتابیں دیکھا جاتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کے سر نفی میں ہلتے ہیں۔ اور اُن میں سے ایک قدرے سخت لہجے میں اُس سے کہتا ہے:

"تم اپنے وقت سے پہلے آگئی ہو۔"

اس کی نظریں جھک جاتی ہیں،

"تمھیں دہیں جانا ہوگا۔ اور مزید کچھ عرصہ اُسی قید میں رہنا ہوگا۔

اسی بیاباں اور مدقوق پنجرے میں؟ جہاں پچھلے اٹھائیس برسوں سے قید تھیں

ہاں! وہیں۔ اور سنو۔ اب وہ پنجرہ صرف مدقوق ہی نہیں رہا۔ اس پنجرے میں بائیں جانب جو ایک پرندہ ہے اب وہ بھی عارضے کا شکار ہو چکا ہے۔

∞

سطور ۱۰

دوسرا ایک موضوعی خصوصی شمارہ

جدید تر تخلیقی افسانوں کا

انتخاب و احتساب

ایک ادبی دستاویز

قیمت: آٹھ روپے

بُجھی ہُوئی تیلی

بیم صادقہ

جب کوئی گھر کا نہیں ہوتا تو بازار اُسے اپنا لیتا ہے بازار کے سینے میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔ خود غرض اور بے حس انسان کی طرح۔ بازار اپنی غرض کے تحت اُسے اپنا لیتا ہے، اینجج کر لیتا ہے۔ اور چیونگم کی طرح، جب رات بھیگنے لگتی ہے، تھوک دیتا ہے۔ کہیں، کسی جگہ بھی!۔

میرا بھی کوئی گھر نہیں۔ میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا ایک "اشو ٹنلک" ہوں۔ اگر میں طبلچی جیسی اس پہچان رکھنے کے بجائے "ٹائیسٹ" کہلاتا تو بھی کیا فرق پڑتا۔ ہر ایک ملازمت شخصیت کی تخریب و تعمیر کی طاقت رکھتی ہے۔ میں شام ڈوب جانے کے بعد پیدل گھر آتا ہوں، جو ایک خستہ حال کمرہ اور ایک چھوٹے سے برآمدے پر مشتمل ہے۔ تالا کھولتا ہوں۔ پچیس پاور کا زرد بلب جلا کر اپنی اکلوتی قمیض کو ہینگر سے آزاد کرتا ہوں۔ گنجی کو پسینے کی بدبو سمیت پھیلا دیتا ہوں۔ جو بالکل بھیگی ہوئی ہوتی ہے اور جس کا رنگ پیلا پڑ چکا ہے۔ تھوڑی دیر بعد بغل کے غفور ہوٹل کا رُخ کرتا ہوں۔ جہاں تام چینی کی رکابی میں جلی جلی سی تین بے حد پتلی اور خشک روٹیاں، اور تام چینی کے ہی ایک چھوٹے سے اُتھلے باؤل میں مرچ سے سُرخ شوربے میں تیرتی ہوئی اکلوتی بوٹی میرے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ جسے میں کئی کئی گلاس پانی کے ساتھ

ایک غیر شعوری سمجھوتے کے تحت کھا لیتا ہوں، تاکہ پیٹ خوب بھرا ہوا محسوس ہو۔ کبھی کبھار ایک کپ بہم اُبلتی ہوئی چائے کی پی لیتا ہوں۔ پھر ٹہلتا ہوا بازار کی طرف چل دیتا ہوں جسے کچھ لوگ تو "کنگ ایڈورڈ" کہتے ہیں۔ خصوصاً وہ لوگ جو یہاں کے قدیم باشندے ہیں۔ نئی نسل "نیو مارکیٹ" کا نام دیتی ہے۔ اور پیسے والے صرف "مارکیٹ" لفظوں کا استعمال اپنے آپ میں کیا نہیں ہوتا۔

میں یونہی گھومتا رہتا ہوں۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ دوکانوں کی روشنیاں گل ہونے لگتی ہیں۔ شٹر گرائے جانے لگتے ہیں۔ بھیڑ کم ہوتے ہوتے، اکا دکا مشکوک افراد تک رُک جاتی ہے۔ میں بہت ہی سست رفتار سے آہستہ آہستہ چل کے گھر آتا ہوں۔ بستر کی چار خانے والی چمرنگی تیلی چادر کو جھاڑ کے پھر سے بچھاتا ہوں، جو تھوڑی ہی دیر بعد سمٹ سمٹا کر کبھی بیٹھ کے نیچے گڑنے لگتی ہے اور کبھی پیروں کا از خود تکیہ بن جاتی ہے۔ پھر سخت اور بے آرام تکیہ پر سر ڈال کے سو رہتا ہوں۔ صبح سویرے سامنے کے نل پر نہا آتا ہوں۔ چھوٹی سی صراحی میں پانی بھرتا ہوں۔ کمرے میں جھاڑو لگاتا ہوں۔ پرانا "شمع" ڈھونڈ کر دیکھتا ہوں یہاں تک کہ تھوڑا وقت اور گزر جاتا ہے۔ نو بجے غفور ہوٹل پہنچتا ہوں۔ اور پھر دفتر!!

وہ نئے مہینے کی چھ تاریخ تھی۔ میں نے ذیشان سے پچیس روپے قرض لیے تھے۔ میری قمیص دفتر میں اپنی خستگی کا راز فاش کر چکی تھی۔ اور میں آج نسبتاً بشاش سا، ریڈی میڈ کی فٹ پاتھی دوکانوں کو ٹٹولنے والی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جب ہی میری نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

وہ پینتیس اور چالیس کے قریب کی تھی۔ اس نے اُبھرتی ہوئی چہرے کی لکیروں پہ "افغان" یا "پانڈا" جیسا سنو لگا کر ٹیلکم پاؤڈر کی تہیں جمائی تھیں۔ دو روپے والی لال "سجے پنجاب" جیسی لپسٹک سے اُس کے سکڑے ہوئے ہونٹ سُرخ تھے۔ لال رنگ کی بھدی بِراس نے "کم کم" چپکا رکھا تھا۔ اس کی ساڑی بہت ہی پتلے نائیلیکس کی تھی، جس کی پرنٹ کے تمام رنگ چیخ پکار کر رہے تھے۔ میچنگ بلاؤز کے اندر اس نے تین چار روپے والا، سلائیوں سے بھرا ہوا تنگ براپہن رکھا تھا۔ کیونکہ "لبقیہ" کمر سے اوپر، بلاؤز کے اندر، مقام سے نیچے نمایاں تھا۔ میں بُری طرح چونکا تھا۔ کیونکہ

اُس نے کار سے اُترنے والے بہت ہی موٹے سے دھوتی والے سیٹھ جی کو آنکھ ماری تھی۔ اور سیٹھ جی نے توند سہلاتے ہوئے میرے قریب سے گزرتے ہوئے سرگوشیوں میں اُس سے پوچھا تھا:

"گانا بجانا جانتی ہے کیا؟"

"نہیں حضور!"

اور سیٹھ جی اس کی طرف حقارت آمیز نظریں ڈال کر بہت تیزی سے آگے بڑھ گئے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ میں تو اسی بازار کا آدمی ہوں، اس لیے میں نے سب دیکھ لیا تھا، سُن لیا تھا ــــــ میں بہت ہی بچ کر، آہستہ آہستہ اس کے تعاقب میں چل دیا! ــــــ

موڑ کے پاس وہ قصداً ایک آدمی سے ٹکرائی تھی۔ اور دبی زبان سے کچھ کہا تھا۔ اُس آدمی نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور "سوری" کہہ کر چل دیا۔ وہ پھر عقابی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پان کی دوکان کے پاس سے ہٹنے والے دونوں نوجوانوں کے درمیان وہ جان کر اور بظاہر بے خیالی میں چل رہی تھی۔ اچانک اُس نے کہا تھا۔

"مجھے یہاں سے کافی دُور جانا ہے۔ آپ پہنچا دیں گے؟"

ان دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر مکاری سے مسکرائے۔

"ہم دو ہیں، اور میرے پاس صرف دس روپے ہیں" وہ خود بہ اسامنہ بنا کر آگے نکل گئی۔

وہ شخص چالیس پینتالیس کا رہا ہوگا چہرے سے ایسی تیمی نمایاں تھی جو ماں باپ کی زندگی میں ہی، ان کی بے توجہی اور کانسٹ ایچکار کا عطیہ ہوتی ہے۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی اس کے برابر پہنچ گئی۔

"آپ کو شاید میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے"

وہ آدمی تھوڑی خجالت، کچھ فخر اور کچھ نروسنیس کے ساتھ مسکرایا۔

"کہیں چل کر چائے پئیں"

"مگر!"

"آئیے تو!" ــــــ اور میرے دیکھتے دیکھتے وہ قریب کے کیبن والے

چائے خانے میں گھس گئے۔ میں پاس کی پان کی دوکان میں پان کھانے کے بہانے آئینہ دیکھتا رہا۔ اور وہ دھوبھارتی سنتا رہا۔ اچانک آئینے میں ان دونوں کا عکس ابھرا اور میں دکان کے کاؤنٹر پہ پندرہ پیسے ڈال کر ذرا آگے بڑھ آیا۔ مرد نے جھنجھلاتی آواز میں کہا:

"میں نے کہا نا —— میں ایک شریف آدمی ہوں۔ میری بیوی کولیبر پین ہے۔ وہ ہاسپٹل میں ہے؟ —— "لیکن۔ میں نے زیادہ تو نہیں۔ ۔ "اس کی آواز دم توڑتے ہوئے مریض کی طرح اٹک اٹک کر نکل رہی تھی۔ " بھاگتی ہو —— یا شور کروں!"۔

"سالا —— بزدل"

وہ پھر آگے بڑھ گئی۔ میں اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ ایک ریڈی میڈ کی چھوٹی سی دوکان کو بند کرتے ہوئے سردار جی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ پتہ نہیں اس کے دستِ سوال کا انداز کیا تھا۔ کیونکہ میرے قریب پہنچتے پہنچتے سردار جی کہہ رہا تھا۔

"بائی —— جی —— تمہاری جیسی میری ماں ہے"

دوکان بند ہو رہی تھی۔ اپنے وہاں ہونے کا جواز دیتے ہوئے میں نے کہا:

"سردار جی —— میرے ناپ کی سوتی شرٹ ہے؟"

"ہے تو بائی جی —— مگر کل آنا!" —— اور سردار جی، جو شاید گھبرایا ہوا تھا یا اُسے بھوک لگی تھی۔ یا کہ وہ ڈر رہا تھا۔ خلافِ توقع مجھے قمیص دکھائے بغیر تالا بند کر کے چل دیا۔ اب میں تھا اور میرے سامنے وہ تھی —— اچانک میں نے کہا تھا،

"آپ میرے ساتھ آئیے"۔

اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ خوشی کی لہر اس کے چہرے پہ چلتی ہوئی ماچس کی تیلی کی طرح اُبھری اور بُجھ گئی۔ وہ میرے ساتھ ساتھ میرے گھر تک آئی۔ میں نے تالا کھولا۔ پنکھا اور بلب جلایا۔ بستر کی چادر جھاڑی اور کہا —— بیٹھیے میرے یہاں آنے کا مقصد غلط نہ سمجھیے۔ مجھ سے آپ کی بے بسی دیکھی نہ گئی"

"تو —— تو —— آپ کسٹمر نہیں بنیں گے"

پھر مجھے کیوں لائے"۔

"دیکھیے ——— میرے پاس اُدھار کے صرف پچیس روپے ہیں۔ اور یہ میری قمیص دیکھ رہی ہیں؟ گھِسی ہوئی تھی۔ آج ہی پھٹ گئی!

"مجھے نئی قمیص لینی ہے ——— میں آپ کو کیا دوں۔"

اُس نے خوف زدہ اور مایوس ہو کر میری طرف دیکھا۔ پھر میرے نزدیک آکر میری قمیص کے بٹن کھولنے لگی۔ یہاں تک کہ میری پھٹی ہوئی قمیص اس کے ہاتھوں میں تھی۔

"اسے میں سی دوں گی!"

"لیکن یہ تو! ———"

"میں عورت ہوں۔ میں جانتی ہوں، کون سا ٹانکہ پھٹے ہوئے کو چھپا سکتا ہے"۔

اور میرے کچھ کہنے سے قبل وہ سوئچ آف کر چکی تھی! مجھے اس کی بے بسی اپنے اسٹونڈنگ کی کھٹ کھٹ سے کہیں زیادہ کرب ناک محسوس ہوئی۔ ایک لمحے کو ایک خیال میرے ذہن میں اُبھرا ——— جیسے ماچس کی تیلی کی رگڑ سے روشنی اُبھرتی ہے۔

میں اسے ہمیشہ کے لیے پناہ دے دوں تو! یہ محفوظ ہو جائے گی ——— غفور سے نجات ——— اور گھر۔

لیکن تیلی تو ایک لمحہ بھی نہیں جلتی۔ بجھی تیلی کے بعد اندھیرا اور گہرا ہوتا ہے۔

اور اندھیرے کے بعد وہ بلب جلا کر میری پھٹی قمیص سی رہی تھی۔ یوں، جیسے برسہا برس سے، ایک گھر ملو عورت، مردوں کی پھٹی ہوئی قمیص سیتی ہے۔

میرے ذہن نے سوچا۔

میرا اور اس کا رشتہ کتنا کھرا ہے۔ ضرورت اور ضرورت۔

میں نے پچیس روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو ماچس کا شعلہ اُبھرا۔ پھر بجھ گیا ——— اور بجھی ہوئی تیلی میں نے گھر کے باہر پھینک دی!!

○○

ظہیرؔ غازیپوری

ایک شب

خطوط تھے وہ ترے بدن کے
میں جس پہ گر کر پھسل رہا تھا
شعور کی اونچی منزلوں سے
مگر تھی حیرت
کہ برف کے اس چمکتے ٹیلے پہ بھی
مرا جسم جل رہا تھا
دماغ میرا سلگ رہا تھا
نظر کی حد میں
سفید ملبوس پہنے
خاموش شب کھڑی تھی
ہوائیں ساکت تھیں
ریزہ ریزہ کفن
چٹانوں پہ چاروں جانب
برس رہا تھا
دماغ میرا سُلگ رہا تھا
بدن میرا جل رہا تھا
میں برف کی چٹانوں پہ
چل رہا تھا
پھسل رہا تھا

حادثہ کے بعد

دراز دست
آہنی ہواؤں کے
نکیلے ناخنوں کا زہر
منتقل ہوا
مرے بدن کی ہر خراش میں
تو میں نے
نیل کنٹھ کی طرح
نظر گھما کے گرد و پیش کا
بغور جائزہ لیا
بدن کی لذّتوں میں کچھ نہ تھا
اک اک خراش میں تھا
آگہی کا بے بہا نشہ
میں خوش ہوا
کرامات اپنی دیو پیکری کے
بوجھ سے دبی رہی!

اندر سروپ دت نادان

سورج پُتر

پیاسی دھرتی چیخ رہی ہے
سورج کے رتھ بان کی آنکھیں
جمی ہوئی ہیں
اُس تہذیب زدہ بستی پر
پیاس کی کٹھن ڈگر نے جس کا
جینا دوبھر کر ڈالا ہے
جس کا باسی
اپنے پُرکھوں کی رُوحوں کو
پانی دینا بھُول گیا ہے
پیاس کی آگ میں جلتے جلتے
سوچ رہا ہے
اس سنکٹ میں
سورج پُتر کرن ہوتا تو وہ کیا کرتا
گنگا لانے کی خاطر بھاگیرتھ بنتا
یا اُس داتو کی ڈیوڑھی میں
پانی بھرتا
قید ہے جس کے بندی گھر میں
پنگھٹ کے گیت [illegible]

اندر سروپ دت نادان

ہری دوار

شام کے سُرمگیں دھندلکے میں
ایک دل دوز چیخ ابھر آئی
دم بخود ہو گئے طیور و درخت
پتی پتی کی آنکھ بھر آئی
لیکن اس درد خیز منظر کا
قلبِ قاتل پہ کچھ اثر نہ ہوا
اُس کی تہذیب کا نشان خنجر
ایک ہم جنس کے کلیجے میں
خون پینے کو بار بار اُترا
دیکھ کر سُرخ روئی خنجر کی
پیاس قاتل کی اور تیز ہوئی
پھر وہ تہذیب یافتہ وحشی
جس کو خوں ریزیوں سے الفت تھی
جس کو وحشت تھی آدمیت سے
جس کے ماتھے پہ خون کے چھینٹے تھے

خون آلودہ حال تھا جس کا
جس کے فردا کا رنگ دھل تھا
پھاڑ کر جامہ آدمیت کا
کھل کے وحشت کی داد دینے لگا
پھر شقاوت کا ننگا ناچ ہوا
پھر وہ دل دوز چیخ ڈوب گئی
درد کے بے کراں سمندر میں
لاش گنگا کو سونپ کر قاتل
جا چھپا ایک سُونے مندر میں
پھر ہری اوم کی صدا گونجی
وقت کے خونچکاں اندھیرے میں
سو گیا لمبی تان کر قاتل
اپنے بھگوان کے بسیرے میں

[illegible] اس ماں کی آس ٹوٹ گئی
[illegible] ٹا تھا

شاھد کلیم

لمس، بے حس انگلیوں کا

وہ ایک لمحہ
کہ جب گھٹائیں برس رہی تھیں
زمیں کے سینے پہ ساری فصلیں
مچل رہی تھیں
نظر نظر سبز سبز موسم
ہر اک طرف کھلکھلا رہا تھا
وہ کہہ رہا تھا ——
خدا —— خدا
ہر طرف خدا ہے

یہ ایک لمحہ
کہ جب زمیں کے بدن میں
چھوٹی بڑی دراڑیں پڑی ہوئی ہیں
نظر کی حد تک کسی دِشا میں
کہیں بھی موسم ہرا نہیں ہے
وہ کہہ رہا ہے
خدا نہیں ہے۔

اندھیرے کی ایک نظم

میرے کانوں میں
بانگِ جرس سرسرانے لگی ہے
کون ——؟
کیا جانے کس سمت سے
آ رہا ہے
میں دو گام چل کر
اسے اپنی آغوش میں
کھینچ لوں —— مگر
کس دشا میں چلوں
میری آنکھوں میں
تاریکیاں بھر گئی ہیں۔

تاج مہجور

بازگشت

ملگجی سی تھکن
ایک آرام کرسی پہ لیٹی ہوئی
اُجلے چشمے کے پیچھے ہیں دھندلا ہٹیں
اور دروازے پہ لٹکا ہوا آسماں
نیلی خاموشیاں

شوخ رنگوں کی طوفانی رفتار سے
آج کل
اپنے آفس کو جاتی ہے وہ
اور تھکن کی کہانی اُٹھائے ہوئے
لمبی رات کے ساتھ
آتی ہے وہ

چندر بھان خیال

لنگڑی راتوں کے مسافر

لنگڑی راتوں کے مسافر
ہو گئے اندھے تو راہیں بجھ گئیں سب
تتلیوں کے پر بھی چھلے
ٹوٹ کر پتھر بھی چٹخے
تیرگی لیکن کسی بھی شرم کی قائل نہیں ہے
کوئی بھی دیا اس کے سامنے سائل نہیں ہے

غار میں تیار بیٹھا نرپشاچوں کا جلوس
خواہشوں کے نیم مردہ جسم کاندھے پر سجائے
پھر کسی معصومیت کے قتل کا قصہ سُنے گا
پسلیوں کو توڑ دے گا
مست ہاتھی کی طرح چنگھاڑتا پھرتا سکوت
اور میرے گھر کا بھوت
باغ میں بیٹھے ہوئے کوڑھی کے سینے پر سوار
رو اُٹھے گا زار زار
ہائے ہر احساس کی گردن سے لپٹا ناگ راج

جانتا ہے کس قدر رستے ہوئے ناسور کو
ہر بے کس و مجبور کو
اور بھی مجبور کر دیتی ہے اُن کی شرم و لاج

پالتو بھیڑوں کے ریوڑ میں سُلگتا احتجاج
بھیڑیوں کی بھیڑ سے بھڑنے کو اب تیار ہے
ہاں! اُمل پکار ہے
گو ننگی حسینہ کے بدن کی آبرو بھی
آج بھی کرتا ہے تلواروں کو تیز
موم کے جسموں کا قاتل کس لیے
اب یہاں پتھر ملیں گے
آہنی پیکر ملیں گے

حفیظ آتش

... ایسا بھی ہو

آؤ چلو پھر شام کا سورج
اپنے دو ہاتھوں میں بھر کر
اک اک قطرہ خواب نچوڑیں
اور — توانائی کی خاطر
کالے سمندر کے ساحل پہ
اپنے بوڑھے جسم بچھا دیں
پھر جب لوگ آنکھوں پہ
پٹی باندھے —
سمتیں ڈھونڈیں
ان کے پاؤں سے
جسم ہمارے ٹکرا جائیں

عبد الصمد تپش

ایک نظم

از کراں تا کراں ایک سیلاب ہے
ساری سوکھی زمیں اب تہہ آب ہے
اتنی گہرائیاں جس کی کچھ حد نہیں
تھاہے کو نہ رُکنا مرے ساتھیو
گرچہ اُکھڑا سے دم
وارنہ ابھریں
یہ بے رحم سفاک لہریں
ایک نقطے پہ ہوں گی بہم
اور کشتی کوئی ؟
وہ ہے اک چوبِ خشک
بیچ منجدھار میں
ڈوبتی اور اُبھرتی ہوئی !

نعیم اشفاق

لوڈشیڈنگ

بتیاں بجھ گئیں
چوڑیوں کی کھنک تھم گئی
قہقہے، تازیانے، صدائیں
اندھیرے میں سب گم ہوئے
چلتے ہوئے قدم جب رکے
بدن سے بدن مس ہوئے
زندگی پر جنوں ایک طاری ہوا
انگلیاں کسمسانے لگیں
خون جسموں کا حرکت میں آنے لگا
کتنے ہونٹوں کی سرخی مٹی
کتنے جسموں سے ملبوس ڈھلکے
کتنی چیخیں گلے میں اٹکنے لگیں
ہاں! لگا ہیں سمگرات اندھیروں میں اندھی رہیں
بتیاں جس طرح اپنی بینائی سے ہو کے محروم بے جان تھیں
ہم اندھیرے میں کیا ڈھونڈتے اور کیا دیکھتے
جب اندھیرے میں رشتے کی پہچان بھی کھو گئی

بھوشیہ وانی

خالد حسین

بھوشیہ کال میں حالات ایسے ہو گئے کہ
مہاپرشوں نے پہلی بار اپنے اوپر آسمانی قہر نازل
ہوتے دیکھا۔ جہاں مہاتما جن رہتے تھے، وہاں
ایک طوفان آیا۔ بڑا بھینکر۔ پتھروں کے اولے
پڑے اور ریت کی ورشا ہوئی۔ مہاپرشوں کے
مہاراج اھیراج کا کہنا تھا کہ آسمانی قہر ان پر
نازل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے کہا:

"ہم تو آسمانی حکم کے تابع رہ کر اس سرشٹی
کو چلاتے ہیں۔ ہم تو آسمان کی سب سے پیاری
مخلوق ہیں۔ آسمان ہم پر مہربان ہے۔ یہ طوفان
کیڑے مکوڑوں کے پسنے کے کارن آیا ہے۔"

طوفان جب پھیلنے لگا تو مہاپرشوں کو
اس طوفان میں اپنا سب کچھ بہہ جانے کا خطرہ
محسوس ہوا۔ شیشوں کے گھر چکنا چور ہونے لگے

—— پھر یوں ہوا کہ سارے مہاپرش
طوفان سے بچنے کے لیے بھوشیہ کال سے
نکل کر بھوت کال میں آ گئے۔ وہ سارے پچھلے
کال کی آس میں جنگلوں، پہاڑوں، صحراؤں
اور وادیوں میں سفر کرنے لگے تاکہ اپنے لیے
کوئی محفوظ گوشہ ڈھونڈ سکیں اور وہاں پناہ
لے سکیں۔ مہاپرشوں کے اس قافلہ کی سربراہی
سالکستانت مہاگیان اھیراج کر رہے تھے۔
وہ سارے سونے چاندی کے رتھوں پر سوار تھے
اپنے [illegible] کو ساتھ لیے اُڑے کے [illegible]

سرکشنادل کے دیرجوان پیدل چل رہے تھے۔ زرہ بکتر پہنے، ہاتھوں میں تیر تفنگ، نیزے، بھالے اور برچھے لیے ہوئے تاکہ بھوشیہ کال کے شترؤ کو موت کے گھاٹ اتارا جاسکے اور طوفان کے بھنور سے باہر نکالا جاسکے ——— کاروان چلتا جارہا تھا اور بھگوان ادھیراج کی عقابی نظریں پناہ گاہ کی تلاش میں لگی ہوئی تھیں سفر تھکا دینے والا اور راستہ تکلیف دینے والا تھا۔ ریتلی دھوپ اور سفر کی مشکلوں کے باوجود سارا قافلہ بھگوان ادھیراج کی سربراہی میں ایک ایسے مقام پر جا پہنچا جہاں کبیر کے سمے کا ایک اتی سندر اور اتی سرکشت قلعہ بنا ہوا تھا۔ اُس قلعہ میں کبیر کی ساری دولت دھرتی کے اندر محفوظ پڑی تھی، مہاپرشوں کا قافلہ بڑی شان سے قلعہ کے اندر داخل ہوا۔ قلعہ میں رہنے والی خلقت کاٹھ کی ہانڈی میں روٹی پکا رہی تھی اور مل کر گا رہی تھی۔

مہاپرشوں کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اُن کا پرتپاک سواگت ہوا۔ مہاپرش بہت خوش ہوئے ——— پھر مہاپرشوں نے سوچا کیوں نہ قلعہ کی خلقت کو بھوت کال کے حقیقی رنگ میں رنگ دیا جائے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ قلعے کی خلقت کو کبھی 'چوپڑی' نہیں کھانے دیں گے اور انھیں گھنے دکھوں میں کبھی گرفتار نہیں ہونے دیں گے بلکہ اُن کی ہڈیوں کا بالن جلا کر کاٹھ کی ہانڈی میں بھوک اُبالیں گے اور انھیں خوب کھلائیں گے۔

پھر ایک دن . . . مہاراج ادھیراج نے قلعہ کے اندر اُگے ہوئے ایک پہاڑ پر چڑھ کر سب کو اپنے بھگوان ہونے کا ثبوت دیا۔ انھوں نے خلقت کو بلایا اور کاٹھ کی ہانڈی کی خوبیوں سے بھری ایک پستک قلعے کی خلقت کو بخشی۔ سبھی مہاپرشوں نے مل کر اُس پستک کو مہاراج ادھیراج کی شبھ وانی کا روپ دیا۔ وہ شبھ وانی . . . ساری خلقت نے زبانی یاد کر لی ——— جلدی ہی کتاب کی تاثیر نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ قلعے کی ساری خلقت کاٹھ کی ہانڈی کی شردھالو بن گئی۔ وہ لوگ کاٹھ کی ہانڈی کی مورتیاں بنا کر آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر گئے۔ مہاراج ادھیراج اور سبھی مہاپرش ان کے ارپن کیے ہوئے شردھا کے پھولوں کو اپنی جھولیوں میں ڈالتے رہے۔ کبیر کی دولت کے خزانے دھرتی کے اندر زیادہ محفوظ ہو گئے۔ خزانوں کی مختاری اور سرداری مہاپرشوں کا مقدر

بن گئی اور . . . شردھا، وفاداری اور تابعداری قلعہ کی خلقت کا فرض قرار دی گئی۔

مہاپُرشوں کی دیا درشٹی سے قلعہ کی دیواریں اُونچی اور پکّی ہو چکی ہیں۔ اب مہاپُرشوں کو قلعہ پر کسی شترو کے حملہ کا ڈر نہیں رہا۔ کسی طوفان کا کھٹکا یا سیلاب میں بہہ جانے کا خدشہ نہیں رہا۔ خلقت کاٹھ کی ہانڈی کی پجاری ہے —— مہاپُرش بے خوف ہو کر . . قلعہ کے اندر بڑی نیزتا ئی عاجزی سے شیشوں کے گھر بنا رہے ہیں۔ مہاپُرشوں کے بھگوان مہاراج ادھیراج کا فرمان ہے کہ انھوں نے سمے کو اپنی مُٹھی میں بند کر لیا ہے۔ وقت کی گردن مروڑ دی ہے۔ وقت اُن کا قیدی ہے۔ اب دوبارہ بھوشیہ کا حال کبھی نہیں آسکتا۔

قلعہ کی ساری خلقت مہاراج ادھیراج کی ہر بات کو پتھر کی لکیر سمجھتی ہے —— اور پراچین کال کے دستور کے مطابق لوگ ہر روز مہاپُرشوں کے ہر حکم کے آگے سیس جھکاتے ہیں۔ سبھی خوش ہیں، کیونکہ سرشٹھی چل رہی ہے۔

OO

چار غزلیں

از رضی نشاط

۱

مجھے چند باتیں بتا دی گئیں
نہ آئیں سمجھ میں تو لادی گئیں

سہولت سے وہ ماں کھیلیں شکار
درختوں پہ چڑیاں سجا دی گئیں

مسائل کی تہ تک نہ پہنچا گیا
مصائب کی فصلیں اُگا دی گئیں

سفر واپسی کا بھی ہے ناگزیر
تو پابندیاں کیوں لگا دی گئیں

یہی میرے خوابوں کی تعبیر ہے
کہ نیندیں بھی میری اُڑا دی گئیں

کڑی دھوپ میں دوپہر کی نشاط
درختوں کی شاخیں جلا دی گئیں

۲

مٹی نہیں ہے یہ دُنیا زمانہ گزرا ہے
خدا مرا جو اگر، آدمی تو زندہ ہے

کنارِ آب ٹہلتے ہوئے یہ سوچا ہے
کہ دل یہاں بھی نہ بہلا تو کیا ارادہ ہے

نکل سکا نہ کوئی راستہ بغاوت کا
یہ کوئی ٹُھٹک ہے کہ اک دن سبھی کو مرنا ہے

ہوا نے توڑ دیا ہے بھرم بلندی کا
کمر جُھکی ہے درختوں کی میں نے دیکھا ہے

لگے ہیں لوگ مناظر سے لطف لینے میں
میں دیکھ آؤں سمندر میں چاند اترا ہے

ہے میری صبح کسی دُوسری ہی دُنیا کی
کہ رات کشتی ہے جس میں نہ دن نکلتا ہے۔

۳

پیٹ کی آگ بھی لگتی ہے تو کیا لگتی ہے
نیند بھی سو کے جو اٹھتا ہوں غذا لگتی ہے
جیسے ہر شخص کوئی جرم کیے بیٹھا ہو
گھر میں گھستے ہی عجب گھر کی فضا لگتی ہے
سب سے دلچسپ یہی غم ہے مری بستی کا
موت پسماندہ علاقے میں دوا لگتی ہے
نور سا راستہ چلتا ہے جلو میں اس کے
کیا کہوں جب وہ گزرتی ہے تو کیا لگتی ہے
آئیے آج اسی سوچ کو پختہ کر لیں
بے حسی حد سے گزرتی ہے تو کیا لگتی ہے

۴

بے شک دل و نظر پہ یقیں کی اساس ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ کتنوں کے پاس ہے
لوٹیں گے زندگی کے مزے گھر پہنچ کے لوگ
گرجا میں اب اکیلا ہے راہب اداس ہے
لٹکا ہے سانپ ہاتھ ذرا سا اگر بڑھے
دلدل سے اس درخت پہ چڑھنے کی آس ہے
شاید خدا سے کوئی تعلق نہیں رہا
دل بے یقین حد نظر بے قیاس ہے
اپنی جگہ ادب میں بنا لے گا ارتقیؔ
یہ ایک بات اس کے مقدر میں خاص ہے